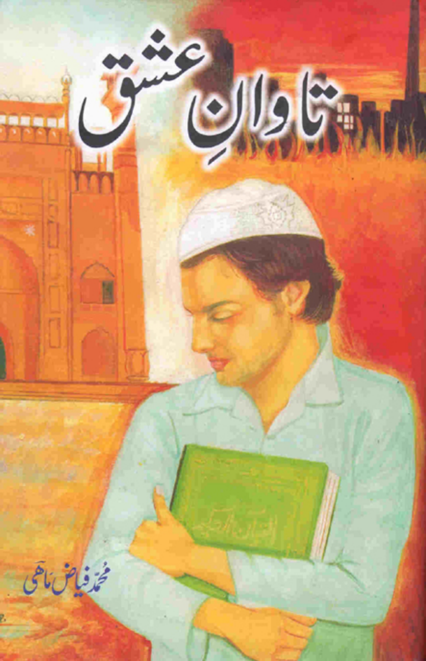

تاوانِ عشق
محمد فیاض ماہی

تاوان عشق

اُس نے بے دِلی سے فائل میز پر رکھی اور اپنا پسینہ خشک کرنے کیلئے پنکھے کے نیچے بیٹھ گئی۔ عائشہ بی بی نے حیرانگی سے بیٹی کی طرف دیکھا اور دوبارہ سبزی بنانے میں مصروف ہوگئیں۔

وہ ہر روز اخبار سے ''ضرورت ہے'' کے اشتہارات پر نشان لگاتی تھی اور اپنی تمام ڈگریوں کی فائل بنا کر دفاتر کے چکر لگانا اس کا معمول بن گیا تھا۔ ایم بی اے کوئی کم تعلیم نہیں ہوتی مگر افسوس اور المیہ یہ ہے کہ وہ جس دفتر میں بھی انٹرویو کیلئے جاتی وہاں پر سفارشی حضرات کی کمی نہ ہوتی تھی اُسے ایم ڈی یا پھر جی ایم صاحب باتوں ہی باتوں میں ٹرخا دیتے تھے۔ وہ اس روزمرہ کے حالات کی عادی ہوگئی تھی۔ ہر روز خالی لوٹنے پر اس کا دل چاہتا تھا کہ تمام اسناد اور ڈگریوں کو آگ لگا دے۔ مگر اگلا دن اس کے لیئے نیا چیلنج بن کر اخبار میں چھپنے والے نوکریوں کے اشتہارات کی صورت میں سامنے آتا تھا۔

پسینہ خشک ہوا تو اس نے اُٹھ کر گھڑے سے ٹھنڈا پانی گلاس میں نکالا اور غٹا غٹ پی گئی۔ اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون دیکھ کر عائشہ بی بی بول پڑیں۔

''میں تو کہتی ہوں گھر میں ہی ٹیوشن سنٹر کھول لو۔ تمہارا دل بھی بہلا رہے گا اور یہ روز روز کی چخ چخ سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔'' وہ ماں کی طرف حیرت سے دیکھ کر رہ گئی۔

''جتنی میری تعلیم ہے۔ وہ ٹیوشن سنٹر کیلئے بھی کم ہے۔ ایم بی اے بھی کوئی تعلیم ہوتی ہے۔'' وہ ماں کے پاس چارپائی پر بیٹھ کر سبزی سے کھیلنے لگی۔ ''میرے پاس بھی کوئی سفارش ہوتی تو اس تعلیم کی قدر ہوتی۔'' اس نے سفارشیوں پر اپنا غصہ نکالا تو عائشہ بی بی نے مسکرا کر دیکھا۔

''ماشاءاللہ: تیرا ابا کماتا ہے۔ اور پھر عفی کی بھی نوکری لگ گئی ہے۔ اللہ کے کرم سے اچھا خاصا گزارہ تو ہو رہا ہے۔'' وہ ماں کی طرف منہ بسور کر دیکھتی ہوئی بولی۔

"آج کل گزارہ ہی کرنے والوں کی کوئی قدر نہیں ہے۔اماں...... ماموں اختر علی کی ہی طرف دیکھو کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں...... اب تو وہ آپ کو بھی نہیں پہچانتے۔اتنی دولت ہے ان کے پاس۔"

آمنہ کی باتوں نے اماں کے دل پر ایک کچوکا سا لگا دیا تھا۔وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتی ہوئی بولیں۔"وہ مجھ سے چھوٹا ہے۔پھر کیا ہوا کہ وہ دولت سے بڑا ہو گیا ہے۔رشتے تو کبھی بھی نہیں بدلتے۔یہ دولت تو آنی جانی چیز ہے۔" سبزی بن چکی تھی عائشہ بی بی سبزی والی ٹوکری سنبھالتی ہوئی اُٹھیں اور ٹونٹی کھول کر سبزی دھونے لگی۔

"آپ تو ہمیشہ اپنے بھائی کی طرفداری کرتی رہتی ہیں۔اُنہوں نے کبھی ہمارا حال بھی نہیں پوچھا۔" آمنہ جل گئی تھی۔"ممانی اصل :اللہ کی شان ہے اتنی تیز اور شاطر عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی بولی تو عائشہ بی بی نے آمنہ کی طرف مصنوعی غصے سے دیکھا۔

"وہ تمہارے بڑے ہیں۔ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے ہمارے پاس ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اُن کے ہاتھوں کی طرف دیکھیں۔" وہ کچن میں گھس گئیں تو آمنہ گھر کی دیواروں کو دیکھنے لگی۔جن پر سے پلستر جگہ جگہ سے اُکھڑ چکا تھا۔سفیدی بھی کئی رنگوں کی ہو چکی تھی۔صحن کے فرش کی اینٹیں بھی گھس گھس کر مزید سُرخ ہو چکی تھیں۔کوئی باقاعدہ کچن نہ تھا۔اوپر جانے والی سیڑھی بھی جگہ جگہ سے زیرِ مرمت تھی۔اس کا کمرہ جس میں لکڑی کا ہلتا ہوا میز اور ایک کرسی اس کی چارپائی اور الماری میں رکھی ہوئی بہت سی کتابیں اور سب کچھ جو ایک غریب اور مفلس خاندانوں کی میراث ہوتا ہے۔"کبھی کچھ ہے۔" وہ بڑبڑائی۔ابا صبح سے شام تک سبزی کی ریڑھی کو دھکا لگا لگا کر جو بھی کماتے تھے اس سے بمشکل گھر کا گزارہ ہوتا تھا۔عفی کی نوکری کا گھر والوں کو کوئی علم نہ تھا اس نے بی کام کرنے کے بعد کسی فرم میں جاب کر لی تھی۔کس فرم میں اور کس جگہ؟ یہ کسی کو علم نہ تھا بس ہر ماہ گنے چنے روپے اماں کی ہتھیلی پر رکھتا اور پورا مہینہ اس کی سر دردی ختم۔اور جگنو...؟ کہنے کو تو بڑا بھائی تھا مگر وہ جھلا کملا تھا۔وہ کوئی کام نہ کر سکتا تھا۔پیدائش کے بعد بخار نے اس خوبصورت بچے کے ایک ہاتھ اور پاؤں پر اثر کیا تھا اور یہ اثر جوانی میں بھی اس کی خوبصورتی اور جوانی کو گہنا گیا تھا۔وہ سارا دن باہر گلیوں میں پھرتا رہتا تھا۔"نور شاہ ولی" کے دربار پر جا کر بیٹھا رہتا۔ڈھول کی تھاپ پر ننگے پاؤں بھنگڑا ڈالتا رہتا۔دیوانہ وار ناچنے لگتا تھا۔مگر اس کی ایک خوبی تھی کہ وہ عائشہ کی بات کبھی بھی نہ ٹالتا تھا۔وہ عائشہ سے بہت پیار کرتا تھا۔

ان سب چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے آمنہ بھی ہر روز گھر کی تقدیر بدلنے کا ارادہ کر کے نکلتی تھی مگر ابھی اس کی قسمت میں یہ نیکی نہ لکھی تھی۔ابراہیم کے گھر میں داخل ہونے پر چونکی۔اس نے آگے بڑھ کر باپ کے ہاتھ سے خالی تھیلے اور بوری پکڑی اور سلام بھی کیا۔

ابراہیم نے مسکرا کر بیٹی کی طرف دیکھا اور سر پر پیار سے ہاتھ رکھتا ہوا آگے بڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔آمنہ نے پانی کا گلاس باپ کو پیش کیا اور پھر ہمیشہ کی طرح جگنو بھی جھومتا ہوا ابراہیم کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گیا۔وہ ابراہیم کے گھر آتے ہی آ جاتا تھا اور پھر باپ کی ٹانگیں دباتا اور سارا دِن جو بھی اس نے کیا ہوتا مزے لے کر اُسے سناتا اور اپنی باتوں پر خود ہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگتا۔ابراہیم بھی اس کا ساتھ دیتا تھا۔وہ تجسس بھرے انداز میں کملے بیٹے کی معصومیت بھری باتیں سنتا تو دونوں کے دِلوں کا غبار ہلکا ہو جاتا۔کبھی کبھار تو جگنو اس کی ٹانگیں دباتا دباتا سو جاتا تھا۔آمنہ نے جگنو کو بھی پانی کا گلاس دیا تو وہ آہستہ آہستہ پینے لگا۔

"ابا جی!" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا تو ابراہیم سمجھ گیا کہ اب وہ اپنی دِن بھر کی کارکردگی بیان کرے گا۔"جی پتر جی۔" جگنو باپ کے پیار بھرے انداز سے متوجہ ہونے پر باچھیں کھول کر ہنسنے لگا۔"بات شُناؤں" (بات سناؤں) وہ سین کو شین بولتا تھا اور بہت سارے الفاظ ایسے بھی بول جاتا تھا جن کی سمجھ آتے بھی نہ تھی۔

"وہ جو حافظ جی ہیں نا۔" اتنا کہہ کر جگنو خاموش ہو گیا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے باپ کو اس شخص کا پتہ بھی ہے یا نہیں جس کی وہ بات کرنے لگا ہے۔

"ہاں ہاں...... وہ حافظ جی...... جو دربار والے ہیں۔" ابراہیم نے کہا تو جگنو کی آنکھیں کھل اُٹھیں۔

"ہاں! دربار والے حافظ جی نے مجھے کہا تھا کہ تم بادشاہ بنو گے۔شارے لوگ تمہاری قدر اور عزت کریں گے۔" وہ خوش ہو کر خود ہی تالیاں بجانے لگا تھا مگر ابراہیم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔جگنو نے بظاہر یہ بات سادگی میں کہی تھی مگر ابراہیم جانتا تھا کہ حافظ ضیغم علی بہت کم بولتے تھے مگر جو کچھ بولتے تھے وہ اللہ کے فضل و کرم سے پتھر پر لکیر ہوتا تھا۔اب بھی اُنہوں نے جگنو کو بادشاہ بننے کی پیشین گوئی کی تھی تو یہ غلط نہ ہو گی مگر یہ کملا جھلا کیسے بادشاہ بن سکتا ہے؟ یہ بات ابراہیم کے حلق سے نہ اترتی تھی۔

دوسری جانب حافظ ضیغم علی جن کی عمر ہی سرکار نور شاہ ولی کے مزار پر گزر گئی تھی اُن کی روحانی

شخصیت کے ساتھ بہت سی کرامات جڑی ہوئی تھیں وہ بانجھ اور بے اولاد جوڑوں کیلئے دُعا کرتے تو اللہ تعالیٰ اُنہیں اولاد کی نعمتوں سے مالا مال کر دیتا تھا۔ سخت گرمی کے موسم میں لوگ بارش کیلئے کہتے تو بھی اللہ ان کی دُعا رد نہ کرتا تھا۔ جب سے یہ ملک آزاد اور یہ محلّہ آباد ہوا تھا لوگوں نے اس مزار پر ہمیشہ رونق ہی دیکھی تھی اور حافظ ضیغم علی کو ایک طرف بیٹھے دیکھا تھا وہ اپنے حجرے میں کم ہی بیٹھتے تھے بلکہ زیادہ تر وقت مزار شریف پر فاتحہ خوانی کیلئے آنیوالوں کے ساتھ ہی گزارتے تھے۔

ابراہیم کو معلوم تھا کہ وہ جگنو پر خاص نظر کرم رکھتے ہیں وہ جگنو کو اکثر لنگر خانے سے لنگر بھی دے دیا کرتے تھے جو وہ گھر لے آتا تھا۔ وہ کئی کئی گھنٹے ڈھول کی تھاپ پر ننگے پاؤں مزار کے احاطے میں ناچتا رہتا تھا۔ ابراہیم جگنو کی بات سن کر حافظ ضیغم کے کردار میں کھو گیا تھا مگر آمنہ کی آواز پر چونک گیا۔

''ابا جی! کھانا کھالیں۔'' وہ تخیل کی وادی سے باہر آتا ہوا جگنو کی طرف دیکھ کر رہ گیا کیونکہ وہ اب سو گیا تھا اور اس کا سر ابراہیم کی گود میں تھا۔ اس نے آہستگی سے جگنو کا سر اُٹھا کر چارپائی کے ساتھ ٹکا دیا۔ وہ بے سُدھ سویا ہوا تھا۔ ابراہم نے روٹی کھانا شروع کر دی تو عفی گھر میں داخل ہوا اس نے ابراہیم کو سلام کیا اور اوپر اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔

''عائشہ!'' ابراہیم کی آواز پر عائشہ بی بی روٹی کی چنگیر پکڑے اِس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

''کہو..... کیا بات ہے؟'' اُنہوں نے جگنو کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار سے اس کی طرف دیکھا۔

''عفی نے اس ماہ کوئی روپیہ دھیلا دیا ہے یا نہیں۔'' عائشہ بی بی شوہر کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

''کوئی خاص بات ہے جگنو کے ابا۔''

''میں چاہتا ہوں کہ عفی میرا ساتھ دے تو آمنہ کو رخصت کر دیں۔'' ابراہیم کے منہ سے سن کر عائشہ بی بی کچن کی طرف دیکھنے لگیں جو کہ باقاعدہ ان ڈور نہ تھا بلکہ اوپن ہی تھا اور ان کے خیال سے آمنہ نے بھی ابراہیم کی بات سن لی تھی مگر اس نے کوئی ردعمل نہ ظاہر کیا تھا بلکہ خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف تھی۔

''آپ کہیں تو میں بھائی اختر علی سے بات کرنے جاؤں؟'' اس بار ابراہیم بیوی کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی نظریں اپنے گھر کے در و دیوار کا طواف کر کے واپس آمنہ پر آ کر ٹک گئیں۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہوا بولا۔

''اس شخص نے کبھی ان بچوں کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اور تم آمنہ کے رشتے کی بات اس سے کرو گی؟''

''یہ کون سا آج کی بات ہے آمنہ اور احمد بچپن سے ایک دوسرے سے منسوب ہیں۔ اور اب ہم بات کو آگے بڑھائیں گے تو بات چلے گی نا۔'' وہ شوہر کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

''بچپن کے فیصلے میں جوانی تک کا فاصلہ اختر علی نے دولت اور مرتبے کی راہداری پر چلتے ہوئے طے کیا ہے..... وہ بہت امیر ہے..... مجھے تو ڈر لگ رہا ہے.....'' ابراہیم انجانے سے خوف کے پیشِ نظر بولا تو عائشہ بی بی کے اور قریب ہو گئیں۔

''نا..... ڈر کیسا؟ ہم کوئی اس کے گھر چوری اور ڈاکہ مارنے جا رہے ہیں؟''

''تو بہت بھولی ہے عائشہ:'' ابراہیم کرب ناک حالت میں اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہم بیٹی والے ہیں ذرا سی بات کا ہے۔'' عائشہ بی بی بھی کھڑی ہو گئیں۔ ''غریب بیٹی والا کسی امیرزادے کا رشتہ مانگے تو اُسے ایسا لگتا ہے کہ اس کی نظریں میری دولت اور جائیداد پر ہیں۔ وہ اس رشتہ مانگنے کو لالچ اور چوری کا رنگ دے دیتا ہے۔''

''وہ ایسا نہیں ہے۔ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میری عزت کا ساجھے دار ہے۔ میرا ماں جایا ہے مجھے انکار نہیں کرے گا۔'' عائشہ بی بی کو بھی معلوم تھا کہ جو الفاظ وہ ادا کر رہی ہیں وہ بالکل اسی کارتوس کی مانند خالی ہیں جو دشمن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔

''اچھا اپنا شوق پورا کر لو۔'' ابراہیم ہارتے ہوئے بولا۔ ''لاؤ عفی کا کھانا مجھے دے دو۔ میں اس کے کمرے میں دے آتا ہوں اور پیسوں کی بات بھی کرتا ہوں۔'' آمنہ نے کھانا تیار کر کے ابا جی کے ہاتھ میں پکڑا دیا وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچنے لگا کہ اس کے گھٹنے بھی ان سیڑھیوں کی مانند ہو چکے ہیں۔ جگہ جگہ سے خالی اور بے جان۔

ابراہیم عفی کے کمرے میں داخل ہوا تو عفی باتھ روم میں تھا اس نے کھانا پلنگ پر رکھنا چاہا تو چونک پڑا کیونکہ پلنگ پر ایک پسٹل پڑا ہوا تھا۔ ابراہیم کے تو رنگ ہی اُڑ گئے۔ اس نے کھانا رکھ کر پسٹل اُٹھانا چاہا تو عفی عجلت میں باتھ روم سے باہر آیا اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ کوئی بھی اس کے کمرے میں نہیں آئے گا۔ اس نے آگے بڑھ کر فوراً پسٹل پکڑ کر اپنے

سیف میں رکھ لیا۔ اس کی نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔

''کونسا کام کرتے ہو؟'' ابراہیم نے سوال کیا۔

''کیا مطلب؟...... کہ کونسا کام کرتا ہوں؟'' عفی کے لہجہ اُکھڑا ہوا تھا مگر ہنوز ادب کے دائرہ میں ہی تھا۔

''کون سا کام کرتے ہو کہ تمہیں اسلحہ رکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟'' ابراہیم کے لہجے میں کرب نمایاں تھا۔ وہ جوان بیٹے پر ہاتھ نہ اُٹھانا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ عفی سچ سچ بتادے۔

''آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے...... وہ...... وہ تو...... کھلونا ہے۔'' عفی خاصا گھبرا گیا تھا مگر اس نے پھر بھی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

''کھلونے الماریوں میں تالے لگا کر نہیں رکھتے جاتے۔ اور یہ بال میں نے دھوپ میں ہی سفید نہیں کیے۔ کھلونے اور اصل اسلحہ میں اس کی پہچان وزن ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ میری دور اور قریب کی نگاہ ابھی ٹھیک ہے۔'' ابراہیم کے اونچی آواز میں بولنے پر عائشہ اور آمنہ بھی اوپر عفی کے کمرے میں آ گئیں تھیں۔ وہ بھی باپ بیٹے کے درمیان ہونے والے تماشے کو دیکھ رہی تھیں مگر بات فی الحال اُن کی سمجھ سے ماورا تھی۔

''آپ کو...... کیسے سمجھاؤں ابا جی کہ وہ...... نقلی ہے اور......'' مگر عفی کی بات اس کی بے معنی اور جھوٹی دلیل کا ساتھ نہ دے سکی اور ایک زوردار تھپڑ نے اس کا منہ گھما دیا۔ وہ اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر حیرت واستعجاب میں مبتلا ابراہیم کی طرف دیکھ رہا تھا کیونکہ اس نے زندگی میں پہلی بار عفی پر ہاتھ اُٹھایا تھا۔ آمنہ اور عائشہ اپنی اپنی جگہ پر گنگ کھڑی رہ گئیں۔

''سارا سارا دِن ریڑھی کو دھکا لگا کہ گلہ پھاڑ پھاڑ کر محلّہ بھر میں آوازیں لگا کر میں جو بھی کمائی کرتا رہا ہوں...... وہ تمہاری تعلیم اور اچھی تربیت پر خرچ کرنے کی کوشش کی ہے۔'' ابراہیم کا پارہ مزید ہائی ہوتا دیکھ کر عائشہ آگے بڑھتی ہوئی بولیں۔

''کیوں غصے ہو رہے ہو؟ آخر کیا ہی کیا ہے اس نے؟'' وہ ماں تھیں بات اور حقیقت سے لاعلم ہونے کے باوجود بھی عفی کی طرفداری میں بولیں تھیں۔

''اس نے میرے بالوں کی چاندی کے ساتھ مذاق کیا ہے۔'' ابراہیم نے آگے بڑھ کر الماری کھول کر پسٹل نکالا اور عائشہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جانتی ہو...... یہ کیا ہے؟'' عائشہ کا رنگ سفید ہوگیا تھا آمنہ بھی خوف سے کانپنے لگی تھی۔ ''تمہارا لاڈلا کہتا ہے یہ کھلونا ہے......

جانتی ہو شریفوں کے بچے ایسے کھلونوں سے نہیں کھیلا کرتے...... یہ تو بدمعاشوں اور آوارہ لوگوں کے کھلونے ہیں۔'' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

''میں نے اپنے آرام اور سکون کا ہر لمحہ تمہاری پرورش پر قربان کیا ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ تم کیا کرتے ہو۔'' ابراہیم نے پسٹل عفی پر تان لیا تو آمنہ کی چیخ نکل گئی اور عائشہ بھی شوہر کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔

''سامنے سے ہٹ جاؤ عائشہ۔ آج میں اسے یا پھر خود کو گولی مارلوں گا۔ اس نے میرا سکون غارت کردیا ہے۔'' ابراہیم نے پسٹل اپنی کنپٹی پر رکھ لیا تھا۔ عفی کو یکدم ہوش آ گیا اس نے آگے بڑھ کر پسٹل بوڑھے باپ سے چھیننا شروع کردیا۔ چند سیکنڈ کی کشمکش میں عفی نے پسٹل چھین لیا اس کا سانس پھولا ہوا تھا جبکہ ابراہیم بھی ہانپ رہا تھا۔ اتنی دیر میں جگنو بھی شور سن کر کمرے میں آ گیا تھا وہ گومگو کی کیفیت میں مبتلا ایک ایک چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''کیا دیا ہے آپ نے مجھے؟'' عفی کی گونج دار آواز سب کے کانوں میں زہر گھولنے لگی تھی۔ ''پیدا ہوتے ہی غربت وافلاس کی گھُٹی دیکر روتے ہوئے بھوکے سلانے کی کوشش کی ہے آپ نے۔'' وہ اب ابراہیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا تھا۔ ''خون پسینہ ایک کر کے اگر مجھے تعلیم دلائی ہے یا پرورش کی ہے تو یہ کوئی احسان نہیں ہے آپ کا مجھ پر...... بلکہ آپ کا فرض تھا۔ مفلسی کی انگلی چاٹ کر جوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھا ہے تو ہر روز سبزی اور دال نہیں کھائی جاتی مجھ سے۔'' جگنو آگے بڑھ کر عفی کے سامنے کھڑا ہوگیا وہ حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''ماں باپ کی صورت میں اللہ نے ہمیں فرشتے دیئے ہیں...... ان کے ساتھ بدتمیزی نہ کر......'' وہ بے چارہ کملا جھلا اپنی بساط کے مطابق چھوٹے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''اِس ماں کی طرف دیکھ...... اِس نے کتنے دُکھ سہہ کر تمہیں...... مجھے...... آمنہ باجی کو پالا ہے۔'' وہ آمنہ کی بہت عزت کرتا تھا حالانکہ وہ اس سے چھوٹی تھی مگر وہ اُسے ہمیشہ آمنہ باجی ہی کہتا تھا۔

''چل...... معافی مانگ لے۔ ابا جی سے۔'' وہ عفی کا ہاتھ پکڑ کر ابراہیم کی طرف مڑا۔ ''ابا جی...... میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں...... میرے ویر کو معاف کردیں۔'' اس نے ابراہیم کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے تو عفی کے سوا سب کو رلا دیا۔ ''تم خاموش رہو...... تمہاری وجہ سے بھی میری دوستوں میں ذلت ہوتی ہے۔'' عفی نے جگنو کو جھڑک دیا تو کمرے کی فضا میں گہرا سکوت چھا گیا۔

''مم مگر...... میں نے کیا کیا ہے؟'' جگنو گھگھیا گیا تھا اس کے ساتھ آج تک کوئی بھی اس لہجہ میں نہ بولا تھا۔ وہ حیرانگی سے ایک ایک کا منہ دیکھ رہا تھا۔ مگر عفی خاموش نہ رہا تھا وہ پھر نفرت کے گولوں کا رُخ جگنو کی طرف کرتا ہوا بولا۔

''سارا سارا دن جاہلوں کی طرح ڈھول کی تھاپ پر ناچتے رہتے ہو۔ ننگے پاؤں گلیوں میں آوارہ گھومتے رہتے ہو۔ میری سبکی ہوتی ہے۔ مجھے شرم آتی ہے...... اپنے دوستوں میں...... یہ بتاتے ہوئے کہ یہ میرا بڑا بھائی ہے۔''

''ہمارے رشتے تمہارے لیئے شرمندگی اور سبکی کا باعث ہیں تو توڑ لو ہم سے تمام ناطے' رشتوں کی تمام زنجیریں توڑ کر آزاد گھومو'' ابراہیم کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کیلئے جگنو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا مگر ابراہیم کی آنکھوں کے بندھ ٹوٹ گئے تھے۔ ''تم نے اس سائیں لوک کی توہین کی ہے جس نے کبھی بھی تمہیں بڑا بھائی بن کر جھڑکی نہیں ماری۔ ایسا کرو...... اس پستول سے ہم سب کو گولی مار دو۔ ختم کر دو یہ بھی رشتوں ناطوں کی باتیں۔'' ابراہیم نے آگے بڑھ کر عفی کا پسٹل والا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہو گیا ہے تمہیں عفی پُتر......؟'' عائشہ بی بی نے مداخلت ضروری سمجھی۔ ''میرا دودھ اور خون اتنا بے وفا تو نہیں ہے کہ تم ہم سے جان چھڑانا چاہتے ہو۔''

''تم اس معاملہ میں نہ بولو اماں!'' عفی کی آنکھوں میں دید نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

''کیوں نہ بولوں؟'' عائشہ بی بی بھی خاوند اور بیٹے کی توہین برداشت نہ کر سکی تھیں۔ ''تم کیا سمجھتے ہو؟ اسلحہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے...... یہ اسلحہ انسان کو حیوان بنا دیتا ہے...... تم بھی حیوان بننا چاہتے ہو؟ قانون کے مجرم بن کر اس کے آگے آگے بھاگتے پھرو گے۔'' آمنہ نے ماں کو دلاسہ دینے کیلئے آگے بڑھنا چاہا تو اُنہوں نے اشارے سے منع کر دیا۔ ''نو ماہ تجھے اس کوکھ میں رکھا ہے تکلیفیں اور دُکھ اُٹھا کر تجھے جنم دیا ہے۔ اور تم کہتے ہو کہ اس معاملے میں نہ بولوں۔'' جگنو نے آگے بڑھ کر ماں کا ہاتھ پکڑ کر باہر لیجانا چاہا مگر ابراہیم نے آنکھوں ہی آنکھوں سے جگنو کو منع کر دیا۔

''ایک رات گیلے بستر پر سو کر تو دکھاؤ۔ گندے اور بدبودار کپڑوں سے زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہو کر تو دکھاؤ۔ آج جو کھمبے کی طرح کھڑا ہو کر ماں باپ اور بہن بھائی کی پہچان بھلا رہے ہو...... یاد رکھو ان سب کا خلوص اور محبت شامل ہے تمہاری جوانی میں۔ تمہاری رگوں میں خون نہیں ہمارا پیار اور سچا خلوص دوڑ رہا ہے۔ اس باپ کے پسینے کا مذاق اڑاتے ہوئے تمہیں شرم آنی

چاہیئے تھی۔ تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں پاؤں پاؤں جس باپ اور بھائی نے چلنا سکھایا ہے ان کو اپنا رشتہ دار مانتے ہوئے تمہیں شرمندگی ہوتی ہے۔'' عائشہ بی بی کئی دنوں اور راتوں سے عفی کے کرتوتوں پر پردہ ڈالتی آ رہی تھیں۔ مگر آج اس کے ہاتھ میں پسٹل دیکھ کر اور پھر ابراہیم اور جگنو کی توہین نے ان کی برداشت کو شکست دے دی تھی۔ وہ اپنے دِل کا غبار نکال لینا چاہتی تھیں اور ابراہیم بھی یہی چاہتا تھا تبھی تو وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔

''تمہیں اس سائیں لوک بھائی سے بھی شرم آتی ہے۔ جانتے ہو یہ سارا سارا دن ننگے پاؤں ناچتا رہتا ہے۔ کیوں ناچتا ہے؟ کبھی سوچا ہے؟ یا کبھی جاننے کی ضرورت بھی محسوس کی ہے؟ بچے بڑے بوڑھے اسے خوش ہو کر جو بھی پیسے دیتے ہیں یہ لا کر میری جھولی میں ڈال دیتا ہے...... اور کہتا ہے...... اماں......'' مگر عائشہ بی بی کی آواز بھرا گئی۔ جگنو نے آگے بڑھ کر ماں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے جیسے کہ اُسے اس بات کا خطرہ ہو کہ اس کا کوئی اہم راز افشا ہونے والا ہے۔ عائشہ بی بی نے اس کے ہاتھ پکڑ لیئے اور بولیں۔ ''مجھے مت روکو جگنو۔ مجھے کہنے دو۔ اس بیوقوف کی آنکھوں سے بے خبری کی پٹی اتارنے دو...... اس کے ناچ ناچ کر پیسے اکٹھا کرنے کی وجہ سے تم اپنی تعلیم مکمل کر سکے ہو...... یہ کملا جھلا پُتر رشتے نبھاتا نہیں ہے بلکہ رشتوں کی عبادت کرتا ہے۔ عشق کرتا ہے رشتوں کی معراج سے......'' عائشہ بی بی کی آنکھیں پھر سے برسنا شروع ہو گئی تھیں۔ جگنو نے ان کے کندھے پر سر رکھ لیا تھا۔

''تو پھر آپ کیا چاہتی ہیں۔ آپ نے جو مجھے دودھ پلایا ہے اس کا معاوضہ ادا کر دوں؟'' عفی کی زہریلی آواز کمرے میں گونجنے لگی تو سبھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''انہوں نے مجھے پاؤں پاؤں چلنا سکھایا ہے تو اس کے بدلے میں میں انہیں کندھوں پر اُٹھائے گلی گلی گھوموں...... اور اس سائیں لوک نے ناچ ناچ کر مجھے پڑھایا ہے تو کوئی کمال نہیں کیا...... بلکہ میں نے ایسی رقم سے تعلیم حاصل کی ہے جس پر حلال یا حرام کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔''

''اب اگر ایک بھی لفظ بولا تو میرا ہاتھ اُٹھ جائیگا...... اپنی زبان کو لگام دے لو'' ابراہیم نے آگے بڑھ کر عفی کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

''میرا گریبان چھوڑ دیجئے...... اگر میرا ہاتھ اُٹھ گیا تو...... اچھا نہیں ہوگا'' اس کی آنکھوں سے ہر قسم کی دید لحاظ ختم ہو گئی تھی۔ رشتوں کی مہک کی جگہ اسلحہ کی بُو نے اس کے دماغ میں گھر کر لیا تھا۔

"مجھ پر ہاتھ اُٹھاؤ گے۔ اپنے باپ پر......" ایک زنائے دار تھپڑ نے عفی کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔ وہ لڑکھڑا گیا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے سنبھل کر اس نے ابراہیم پر پسٹل تان لیا۔

"اب اگر ہاتھ اُٹھایا تو گولی اپنی بے رحمی ثابت کر دے گی۔" پسٹل کی نال ابراہیم کی پیشانی پر لگی ہوئی تھی اور عفی کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ کمرے میں موت کی خاموشی چھا گئی تھی۔ چند جان لیوا لمحات اسی طرح گزرے پھر عفی غصے میں پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ مگر ابراہیم کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے گالوں پر لکیر بناتے ہوئے اس کی قمیض کے کالر میں جذب ہونے لگے تھے۔

☆☆☆

جگنو نے کبھی بھی عائشہ بی بی کے برابر بیٹھنے کی جرأت نہ کی تھی کہنے اور دیکھنے کو وہ کملا اور جھلا تھا مگر رب تعالیٰ نے اُسے عقیدت، محبت، خلوص اور رشتوں کی معراج کو بلند رکھنے کی قوتِ خاص عطا فرمائی تھی۔ وہ عائشہ کی بہت عزت کرتا تھا اس کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ بات بیٹھ گئی تھی یا پھر اللہ رب العزت نے سادی تھی کہ ماں باپ کی عزت ہر چیز سے بڑھ کر کرنی ہے۔ بس وہ اس عقیدے پر قائم تھا۔ اب بھی وہ چار پائی پر لیٹا پریشانی کی حالت میں چھت کی طرف انگلیاں کر کے منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ مگر اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے کہ وہ کسی نادیدہ طاقت سے لڑائی کر رہا ہو۔

عفی نے گھر میں پریشانی اور بے سکونی کی فضا قائم کر دی تھی۔ تین دن ہو گئے تھے وہ گھر نہ آیا تھا۔ عائشہ بی بی کے دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لیتے تھے مگر ابراہیم مطمئن تھا یا پھر وہ جان گیا تھا کہ عفی جن راہوں پر چل نکلا ہے ان کا انجام جیل کی سلاخوں کے پیچھے عمر گزارنا ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ باپ تھا اپنے طور پر ہر گلی میں نوجوانوں کے ساتھ عفی کا تذکرہ چھیڑ دیتا تھا تا کہ پتہ چل سکے کہ وہ کس حال میں اور کہاں ہے؟ مگر ہنوز مایوسی ہی ہوئی تھی۔

عائشہ بی بی نے جگنو کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور فوراً چار پائی سے اتر کر نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔ عائشہ بی بی بیٹے کی خصلت سے واقف تھیں اس لیئے خاموش رہیں۔ وہ اپنے ٹیڑھے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا پھر اس کی نظریں عائشہ بی بی کے پاؤں سے ہوتی ہوئیں چہرے پر پڑ گئیں۔ وہ غور سے ماں کا چہرہ دیکھنے لگا تو عائشہ کو اچھنبا ہوا وہ حیرت سے جگنو کو دیکھتی ہوئی بولیں۔

"خیر تو ہے پتر!؟" جگنو اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا ہوا بولا۔

"وہ حافظ جی ہے نا...... وہ مجھے کہتے ہیں...... ماں کا چہرہ ایک بار دیکھو تو حج کا ثواب ہوتا

ہے۔" عائشہ بی بی کی آنکھیں بھیگنے لگیں وہ فخر سے بیٹے کی طرف دیکھنے لگیں۔ عفی اور جگنو کی عادتوں اور طبیعت میں زمین آسمان اور دن رات کی طرح فرق تھا۔ "یہ حج کیا ہوتا ہے اماں؟" وہ بیٹے کی سادگی اور بھولپن پر دل و جان سے فریفتہ ہو گئیں۔ اُسے حج کے معنی اور مطلب کا علم نہ تھا مگر حافظ جی کے کہنے پر ماں کے چہرے کی زیارت کرتا جا رہا تھا۔ اُسے بس اتنا علم تھا کہ حج کوئی عمل ہے جس کا بہت ثواب ہے۔

"آمنہ جوان ہو گئی ہے۔" عائشہ بی بی نے بات پلٹی۔ "اب اس کی شادی کرنی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم اس گھر کے بڑے بیٹے ہو۔ اس لیئے میرے ساتھ ماموں اختر علی کے گھر چلو۔"

"مگر آمنہ باجی کی شادی کرنی ہے تو ماموں اختر علی کے گھر کیوں جائیں؟" اس نے اپنی دانست میں بڑی عقل مندی کی بات کی تھی۔ "تو بھی پگلا ہے۔ تیرے ماموں اختر علی کا بیٹا احمد۔ آمنہ کا منگیتر ہے۔"

"منگیتر؟" عائشہ اُسے سمجھانے لگیں تو اس کی سوئی لفظ منگیتر پر اٹک گئی۔ عائشہ بی بی ایک ٹھنڈی سانس بھرتی ہوئی بولیں۔ "آمنہ اور احمد بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ منسوب ہو چکے ہیں۔"

"جیسے...... میں اور عفی۔" اس کی سادگی عروج پر پہنچی ہوئی تھی مگر ماں کے دل کو عفی کی یاد ایک کچوکا لگا گئی تھی۔ پھر وہ بیٹے کو مطمئن کرنے کی غرض سے سمجھانے لگیں۔ اور بالآخر ایک گھنٹے بعد بات جگنو کی سمجھ میں آئی یا نہیں مگر وہ ماموں اختر علی کے گھر جانے پر رضامند ہو گیا۔

"اماں جی!" وہ گھر سے باہر نکلنے لگے تو جگنو شرماتا ہوا بولا۔ "وہاں فریحہ بھی ہو گی۔؟" عائشہ بی بی نے کمرے کی جانب دیکھا جہاں آمنہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ سمجھ گئیں کہ آمنہ نے جگنو کو فریحہ کا نام لے کر چھیڑ دیا ہے۔ جگنو فریحہ کو پسند کرتا تھا۔ پسند کیا کرتا تھا بس اُسے اچھی لگتی تھی۔

اختر علی پانچ پانچ ملز اور فیکٹریوں کا مالک تھا اس کے دو بیٹے احمد اور عاصم نے کام کو اچھی طرح سنبھالا ہوا تھا اس کی بیٹی جو کہ دونوں بیٹوں سے چھوٹی تھی جس کا نام فریحہ تھا وہ ابھی زیرِ تعلیم تھی۔ قیمتی اور مہنگی گاڑی میں وہ شہر کے مہنگے ترین کالج میں پڑھتی تھی۔ جگنو کو فریحہ اچھی لگتی تھی مگر اس نے کبھی بھی اس بات کا اظہار اماں سے نہ کیا تھا بلکہ آمنہ آپی سے کبھی کبھار کہہ دیا کرتا تھا۔ اب وہ بھی جانے لگے تو آمنہ نے اُسے فریحہ کا نام لے کر چھیڑ دیا تھا۔

جگنو بہت خوش تھا کہ ابراہیم نے اُسے اہمیت دی تھی کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ بہن کے رشتے

کی بات کرنے جائے۔ عائشہ اُسے راستے بھر سمجھاتی رہیں کہ کوئی بھی غلط بات یا پھر کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی جس سے ان کی بے عزتی ہو۔ وہ اختر علی کی پرشکوہ کوٹھی پر پہنچ گئے تھے۔ عائشہ بی بی دوسری مرتبہ یہاں آئیں تھیں جبکہ جگنو اس نئی کوٹھی میں پہلی مرتبہ آیا تھا۔ گیٹ کیپر چونکہ پرانا تھا اور عائشہ کو جانتا بھی تھا اس نے سلام کر کے گیٹ کھول دیا۔ جگنو ایک ٹیڑھے ہاتھ اور ایک ٹیڑھے پاؤں سے جھومتا ہوا وسیع لان عبور کر کے کوٹھی کی پرشکوہ عمارت کو دیکھتا ہوا جہازی گیٹ سے اندر داخل ہوا تو اختر علی صوفے پر نیم دراز کسی سے موبائل پر بات کر رہے تھے۔ وہ عائشہ بی بی اور جگنو کو دیکھ کر سہم گئے اور حیرت واستعجاب کی کیفیت میں مبتلا ہو کر دیکھنے لگے تو عائشہ بی بی نے اُسے سلام کر کے چونکا دیا۔

''کیسے ہو اختر علی؟'' وہ خجل سا ہو کر مسکرانے لگے۔

''جی...... ٹھیک ہوں آپا...... آپ سنائیں کیسی ہیں؟'' اس سے پہلے کہ عائشہ بی بی کوئی مزید بات کرتیں جگنو نے آگے بڑھ کر ''سلام علیکم...... ماموں جی۔'' کہہ کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اختر علی کو چاروناچار اس کا ہاتھ تھامنا پڑا۔ ''ہاں بھئی جگنو...... کیسے ہو؟'' عائشہ بی بی خود ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ جگنو نے مٹھائی کا ڈبہ قیمتی اور چمکتے شیشے کے میز پر رکھ دیا اور خود ہمیشہ کی طرح ماں کے قدموں میں ہی بیٹھ گیا تو اختر علی کو کہنا پڑا۔

''اوپر بیٹھ جاؤ جگنو...... نیچے اچھا نہیں لگتا۔''

''مجھے اچھا لگتا ہے ماموں جی۔'' اس کملے نے صنعتکار اختر علی کو خاموش کروا دیا تھا۔

''بھائی ابراہیم کیسے ہیں۔ ان کی صحت کیسی ہے؟'' اختر علی نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''وہ ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہیں' اُنہوں نے ہی مجھے بھیجا ہے۔'' اختر علی کی آنکھیں تجسس سے کھل گئیں۔ ''خیریت تو ہے...... کوئی پیسہ وغیرہ چاہیئے؟''

اختر علی کی بات سن کر عائشہ بی بی سکتے کی کیفیت میں آ گئیں۔ حالات اور وقت کیسا بھی آیا تھا اُنہوں نے کبھی بھی اختر علی سے کوئی پیسہ نہ مانگا تھا مگر اس نے یہ گھٹیا اندازہ کیسے لگا لیا کہ ہم ماں بیٹا اس سے پیسے مانگنے آئے ہیں۔ ''نہیں نہیں...... اختر علی!'' عائشہ بی بی کہنے لگیں۔ ''اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔'' اتنی دیر میں ایک طرف سے فریحہ آتی ہوئی دکھائی دی تو جگنو نے شرما کر نظریں جھکا لیں کیونکہ اس کا لباس اور چال ڈھال بیہودگی کی حدیں پار کر رہی تھی۔ جس وسیع ڈرائینگ روم میں وہ اس وقت بیٹھے تھے وہ قیمتی اور نایاب چیزوں کا مرکز لگ رہا تھا۔

''اسلام علیکم پھوپھو!'' فریحہ نے پاس آ کر کہا تو عائشہ بی بی نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا اور سر پر ہاتھ بھی پھیرا۔ ''کیسے ہو جگنو؟'' بس جگنو کے تو دل کی دُنیا ہی بدل گئی تھی۔ اُسے لگا کہ اس کے اندر یکدم بہت سے پھول کھل گئے ہوں۔

''ایک دم شوپر'' اس نے شرما کر انگلش کا لفظ سُپر بول کر فریحہ کو امپریس کرنے کی کوشش کی تو فریحہ اس کی انگلش سن کر مسکرا پڑی۔ جگنو کے لیئے اتنا ہی کافی تھا۔

''مجھے ایک دوست کی برتھ ڈے پارٹی پر جانا ہے پھوپھو...... پھر ملاقات ہو گی۔ بائے پاپا۔ بائے پھوپھو۔'' فریحہ جا چکی تھی مگر اس کی خوشبو جگنو کے نتھنوں کے ذریعے پورے وجود میں حلول کر گئی تھی۔

''ہاں تو اختر علی'' عائشہ بی بی دوبارہ بولیں تو جگنو بھی توجہ سے سننے لگا۔ ''مجھے جگنو کے ابا نے بھیجا ہے۔ بس ایک وعدہ یاد دلانے کیلئے۔''

''میں سمجھا نہیں آپا؟'' اختر علی حیرت سے بولا۔ ''کیسا وعدہ؟ آپ کھل کر بات کریں۔''

''میں آمنہ کے سلسلے میں بات کرنے آئی تھی۔'' عائشہ بی بی نے ڈرتے ڈرتے اپنی بات کہہ دی مگر اختر علی کی حیرت ہنوز قائم تھی۔ ''میں سمجھا نہیں آپا؟''

''میں چاہتی ہوں کہ جو خواب ہم نے آمنہ اور احمد کی شادی کا دیکھا تھا۔ اُسے پورا کرنے کا وقت......''

''اپنے اس خواب کو اپنے تک ہی محدود رکھنا عائشہ آپا۔'' عائشہ بی بی کی آواز بھابی احتل کی کرخت آواز نے دبا دی تھی وہ اپنی بات پوری نہ کر پائیں تھیں کہ احتل نے ان کی بات اپنے پر غرور لہجے میں کاٹ دی۔ احتل پاس آ کر بیٹھ گئی۔ مگر اختر علی کی جرات نہ ہو سکی کہ وہ بیوی کی بات کو جھٹلا سکے۔

''میں سمجھی نہیں احتل...... کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟'' عائشہ بی بی کی زبان لرز گئی تھی۔ ان کی غربت اور مفلسی مذاق بننے والی تھی۔ وہ اپنے فقرے کی لرزش سے ہی سمجھ گئیں تھیں کہ ان کی ذات کی نفی ہونے والی ہے۔

''میں آپ کو آسان اردو میں سمجھا دیتی ہوں۔'' احتل کا لہجہ پرغرور اور ذلت آمیز تھا مگر اب اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ تو سننے ہی تھے۔ ''جس صوفے پر آپ بیٹھی ہیں وہ ستر ہزار روپے کا ہے...... اور یہ قالین جسے آپ کے اس جوکر بیٹے کی رالوں نے گندا کر دیا ہے ہم نے دو

لاکھ روپے کا لندن سے منگوایا تھا۔" جگنو کو لفظ جوکر کی تو سمجھ نہ تھی مگر وہ اتنا جان گیا کہ ممانی اس کی اور اماں کی بے عزتی کر رہی ہے۔ اس نے بولنے کیلئے کچھ منہ کھولا ہی تھا کہ ممانی احتل کا زہریلی آواز پھر گونجی۔

"اور عائشہ آپا!...... آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ احمد کی شادی تم جیسے غریب اور گھٹیا لوگوں میں ہوگی اس کی شادی تو ہم نے سراج الحق کی بیٹی سے طے کر دی ہے۔" احتل نے ایک اور زہریلا تیر چھوڑا جو عائشہ بی بی کے دِل میں پیوست ہو گیا تھا کیونکہ اُنہوں نے اپنا دِل پکڑ لیا تھا۔

"آپ کی حیرانی دور کرنے کیلئے بتا رہی ہوں سراج الحق اس ملک کے نامور وزیر ہیں اور ان کی بیٹی چاند کا ٹکڑا ہے۔" تمام گفتگو کے درمیان علی اختر خاموش ہی رہا تھا۔ مگر اب اس نے بھی ماں جیسی بڑی بہن پر اپنی دولت اور امارت کا بم پھینکا تو عائشہ بی بی دِل مسوس کر رہ گئیں۔

"آپ کو اس طرح میری دولت پر نظریں نہیں ڈالنی چاہیں تھیں۔" اختر علی کی نظریں تو جھکی ہوئی تھیں مگر الفاظ زہر میں بجھے ہوئے تھے۔ "آمنہ کی شادی پر کوئی رقم کی ضرورت تھی تو آپ مجھے خاموشی سے کہہ دیتیں آپا...... اس سال تو ماشاءاللہ زکوۃ بھی کافی نکلی ہے۔ میں ساری کی ساری آپ کو دے دیتا۔"

عائشہ بی بی کا دل لرز گیا تھا بات ہی ایسی تھی ان کا ماں جایا۔ ان سے چھوٹا بھائی اپنی دولت اور جاگیر کی سالانہ زکوۃ سے بڑی بہن کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ خاموش آنسوؤں کی لکیریں دل کے گرد جال بن رہی تھیں۔ جگنو بھی ماں کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھ کر متفکر ہو گیا تھا۔ عائشہ بی بی لرزتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ کھڑی ہو گئیں تو جگنو نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

"مامی......" جگنو نے احتل کو مخاطب کیا تو سب کی توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ "تم بہت پچھتاؤ گی۔"

"جب بڑے بات کر رہے ہوں تو درمیان میں بھونکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" احتل کو تو جگنو کی بات نے سیخ پا کر دیا تھا۔ "عائشہ آپا...... اب اگر دوبارہ اس گھر میں قدم رکھنے کی ضرورت محسوس کرو تو اپنے اس کتے کو باہر ہی باندھ کر آنا...... اور ہاں!" اس نے مٹھائی کا ڈبہ اُٹھا کر عائشہ بی بی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "یہ مٹھائی لیجاؤ اور کتوں کو ڈال دینا تا کہ تمہارا بھی مان رہ جائے۔" وہ یہ کہہ کر واپس جانے کیلئے مڑی تو عائشہ بی بی کا بھی خون کھول اُٹھا۔

"احتل...... یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔" ان کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ ان کے بھائی اور بھابی

نے ان کی اور جگنو کی بہت توہین کی تھی۔ اب اگر احتل اور اختر علی نے تمام رشتے ناطے ختم کر لیئے تھے تو عائشہ بی بی بھی دل کی بھڑاس نکال کر ان رشتوں کو بھول جانا چاہتی تھیں۔ "تم نے میرے بیٹے کو کتا کہہ کر مجھے انسانوں کی فہرست سے نکال دیا ہے...... احتل...... تم ایک دن دیکھنا ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ میرا کملا بیٹا اس وقت کا بادشاہ ہوگا اور تم اس کے دربار پر اپنے ہاتھ میں کشکول پکڑ کر ایک وقت کی روٹی کو ترس رہی ہو گی۔"

اختر علی بہن کی باتیں سر جھکا کر سن رہا تھا جبکہ احتل نے نخوت سے گردن اکڑا کر منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ "غریب ہونا کوئی جرم نہیں ہے مامی جی!" جگنو پھر بولا تو عائشہ بی بی نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود اختر علی سے مخاطب ہوئیں۔

"میں اپنی اوقات نہیں بھولی اختر علی! اوقات تمہاری بیوی بھول گئی ہے۔" احتل نے گھور کر ان کی طرف دیکھا مگر عائشہ بی بی آج دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

"یہ...... یہ بھی بھول گئی کہ حشمت ریڑھی والے کی کملی بیٹی تھی جسے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہ تھا اور اس کا رشتہ بھی کہیں نہ ہوتا تھا۔"

غصے کی شدت سے احتل کی رگیں پھولنے لگیں تھیں اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ عائشہ بی بی اور جگنو کو دھکے دیکر باہر پھنکوا دیں۔ احتل کی بے عزتی پر جگنو تالیاں بجانے لگا تھا جو اختر علی کے تن بدن میں آگ لگا رہی تھیں۔ "یہ تو دولت کو سلام کرے کہ یہ اپنی اوقات ہی نہیں اپنا اصل نام "حمیداں" بھی بھول گئی ہے۔" ایک اور انکشاف نے احتل کو لرزا دیا۔

"آپ میرے ہی گھر میں کھڑی ہو کر میری بے عزتی کر رہی ہیں...... میرے ایک اشارے پر ملازم آپ کو اور آپکے اس بیوقوف بیٹے کو کچرے کی طرح اُٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔" احتل نے کان کی لوئیں سُرخ ہو گئیں تھیں۔ وہ بول نہ رہی تھی بلکہ پھنکار رہی تھی۔ "آپ کا اور ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ چلی جاؤ یہاں سے اور اس جاہل کو بھی لے جاؤ۔" احتل نے تمام رشتے ناطے توڑ دیئے مگر اس کا ماں جایا اختر علی کچھ نہ بول سکا۔ عائشہ بی بی کی نگاہیں گھوم کر بھائی پر آ کر رُک گئیں۔

"یہ دولت بڑی بے وفا چیز ہے۔ سنا ہے اس کے پاؤں ہوتے ہیں۔ یہ چل کر کبھی اُس بوہے اور کبھی اس بوہے بیٹھ جاتی ہے۔ اس دولت کو باندی سمجھ کر اشاروں پر ہر چیز کو نچانے کی طلب یہ بھی بھلا دیتی ہے کہ دولت تمہاری نہیں بلکہ تم دولت کے غلام ہو اور اس کے اشاروں پر ناچ

رہے ہو۔" اختر علی نے کچھ کہنے کے لیئے منہ کھولا ہی تھا کہ عائشہ بی بی نے ہاتھ اُٹھا کر بولنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی مت کہنا اختر علی: کیونکہ جب تم بولو گے تو ایسا لگے گا کہ تمہاری آواز دولت کے ڈھیر تلے دبے ہوئے بے بس اور لاچار شخص کی آواز ہے۔" اب وہ امتل کی طرف مڑیں۔"اور امتل بی بی: سارے رشتے ناطے توڑ کر یہ مت سمجھنا کہ اب اپنی کبھی بھی ملاقات نہیں ہوگی...... بلکہ اب جو بھی ملاقات ہوگی اس میں تم کشکول پکڑے ہوگی اور اللہ کی رحمت سے میرے اس کملے بیٹے کی چوکھٹ پر کھڑی ہوگی۔" عائشہ بی بی نے تالی بجاتے ہوئے جگنو کو ہاتھ سے پکڑا اور آنسو بہاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

اختر علی بہن کے منہ سے بدُعائیں سن کر لرز کر گیا تھا مگر وہ آگے بڑھ کر بہن کو روک نہ سکا تھا۔

"غریب آدمی کی یہی خامی ہے۔ جس چیز تک اپنی رسائی نہ ہو اُسے دوسروں کے ہاتھوں میں دیکھ کر حسد سے سینہ جلنے لگتا ہے۔ اونہہ...... میں بھلا کیوں اس کمینی کے دروازے پر جاؤں گی؟" امتل کا پارہ اب بھی ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اور اختر علی خاموشی سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

راج تلک محل اس وقت مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ہندوستان کے بہت بڑے رئیس اور صنعت کار پرساد چوپڑہ کی بیٹی کی شادی تھی۔ چوپڑہ خاندان ہندوستان کی بنیادوں میں اپنی دولت اور مرتبے کی بدولت اہم ترین اینٹ کے طور پر جانا جاتا تھا۔ پرساد چوپڑہ کی چھوٹی سی فیملی تھی جس میں خود پرساد چوپڑہ۔ ان کی بیوی مہارانی۔ ان کی دو بیٹیاں۔ کنگنا اور جوہی جبکہ دو بیٹے کندن اور موہن چند تھے۔ کندن جوہی سے چھوٹا اور کنگنا سے بڑا تھا اور جوہی کی آج شادی تھی ہندوستان کے سب سے بڑے اداکار کے بیٹے کے ساتھ یہ شادی طے ہوئی تھی۔ چوپڑہ صاحب نے ہر نسل اور ہر مذہب کے لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ جبکہ کندن کے اکثر دوستوں کا تعلق مسلمان گھرانوں سے تھا مگر چوپڑہ کا نظریہ تھا کہ اس بہت بڑے فنکشن میں مہمان بھی بہت بڑے اور زیادہ ہونے چاہئیں۔

پرساد چوپڑہ فطرتی طور پر ہندوؤں کی اعلیٰ نسل سے تعلق کے باعث ملک بھر میں اچھا مقام اور اعلیٰ نام بنا چکے تھے جبکہ کندن کبھی کبھار باپ کے کام میں ہاتھ بٹاتا تھا مگر اکثر دولت اڑانا ہی

اس کا مشغلہ تھا چوپڑہ نے بھی کبھی لاڈلے بیٹے کو شیر کی آنکھ سے نہ دیکھا تھا۔ تبھی تو کندن بہت بگڑ گیا تھا وہ باپ کی طرح کبھی بھی لگاتار مندر نہ جاسکتا تھا مگر مسلمان دوستوں کو بھی اس نے کبھی مسجد اور نماز سے نہ روکا تھا۔ اکثر دوستوں کے ساتھ مذہب پر بحث ومباحثہ ہو جاتا تھا۔

کندن پڑھا لکھا نوجوان تھا وہ بہت باوزن دلائل اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں گفتگو کر کے دوستوں کو قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا ان کے درمیان کبھی بھی مذہب کی بنیاد پر جھگڑا نہ ہوا تھا۔ آج بھی کندن نے اپنے تمام دوستوں کو دیدی کی شادی پر مدعو کر کے اس بات کا ثبوت دیا تھا کہ وہ ہر حال میں انسانیت کی معراج کو بلند رکھنے کا قائل ہے۔

لاکھوں روپیہ شادی پر خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ راج تلک محل کے بہت بڑے لان میں گنپتی بھگوان کی بہت بڑی مورتی نصب کی گئی تھی جس پر کئی من پھول لاد دیئے گئے تھے۔ بڑے بڑے راجے مہاراجے اور امیر کبیر مرد وخواتین اس کے سامنے ماتھا ٹیک کر شادی میں شمولیت اختیار کر رہے تھے۔ خلیل احمد بھی تمام کلاس فیلوز کی طرح اس شادی میں مدعو تھا۔ اس نے گیٹ سے اندر قدم رکھا تو گنپتی بھگوان کی مورتی دیکھ کر وہ جان گیا کہ کندن کے پتاجی پرساد چوپڑہ اور ان کی تمام فیملی کتنی مذہبی ہے۔ وہ اپنے کلاس فیلوز گروپ کی طرف بڑھ گیا تو پھر خوب ہلا گلا ہونے لگا۔

رنگ برنگے ٹھہرتے آنچل اور کومل جیسی نرم و نازک لڑکیاں چلبلی شرارتوں سے لڑکوں کو تنگ کرنے میں لطف محسوس کر رہی تھیں۔ بارات آچکی تو ہنگاموں میں کمی اور سرور و مستی کی کیفیت میں اضافہ ہو گیا۔ اگنی کے گرد جب سات پھیرے دُلہا دلہن نے پورے کر لیئے تو کھانا شروع کرنے سے پہلے پرساد چوپڑہ نے مائیک سنبھالا اور تمام مہمانوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! مے آئی حیو یوَر اٹینشن پلیز۔" سبھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے وہ لاکھوں روپے کے تیار کردہ سٹیج پر کھڑا تھا اس کے پہلو میں اس کی پتنی مہارانی ماتھے پر بڑا سا ٹکا سجائے گردن کو اکڑائے کھڑی تھی۔ "میں آج بہت خوش ہوں کہ بھگوان کی دی ہوئی نعمت بیٹی کو اس کے پیا سنگ رُخصت کرنے والا ہوں...... میں گنپتی بھگوان کا بھگت ہوں اور آپ جو کھانا کھانا چاہتے ہیں یہ بھی بھگوان کی دین ہے...... میں مسلمان مہمانوں سے معذرت کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ میری اس خوشی میں میرے بھگوان بھی شامل ہیں جو آپ کو بخوبی نظر بھی آسکتے ہیں......" تمام مہمان اس کی بات توجہ سے سن رہے تھے۔

"مجھے مسلمانوں کی پارٹیوں میں جانے کا اتفاق بھی ہوا ہے مگر مجھے اُن کا اللہ ان کی پارٹیوں میں کہیں نظر نہیں آیا۔ کیونکہ جو ہے ہی نہیں وہ کہاں ملے گا..... پلیز انجوائے یور سیلف" بہت سے مسلمان مہمانوں کی طرح خلیل احمد بھی اپنے فیلو گروپ کے ساتھ غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ ان سب مسلمانوں کو یہ امید نہ تھی کہ پرساد چوپڑہ ان کو گھر بلا کر اس طرح ذلیل کرے گا اور مذہب کی بنیاد پر اللہ کی ذات سے منکر ہوگا۔ خلیل احمد کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ کندن صرف نام کا ہی نہیں بلکہ دل کا بھی کندن ہے لیکن اس کا پر غرور باپ کسی نہ کسی موقع پر رب تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی ذات کی نفی کرتا رہتا تھا۔ کندن اور وکرم اس کے کلاس فیلوز میں شامل تھے جو کہ کروڑ پتی بزنس مینوں کے بیٹے تھے۔ وکرم پر غرور جبکہ کندن انسان کی قدر کرنے والا بہترین دوست ثابت ہوا تھا۔

بابر اپنے گھر چلا گیا تو خلیل احمد کو اپنے مکان کی حالت پر رحم آنے لگا وہ کندن کا اربوں روپوں سے تیار کیا گیا محل دیکھ کر آیا تھا۔ اس نے کبھی بھی رب تعالیٰ کی ذات کی نفی کرنے کی جرأت نہ کی تھی وہ پکا سچا مسلمان تھا۔ اس کے گھرانے کے لوگ پکے نمازی تھے۔ والد ریلوے میں ملازم تھے۔ بہن بھائیوں میں وہ بڑا تھا وہ دو تین ٹیوشنز پڑھا کر والد کے ساتھ گھر کا خرچ اور تعلیم کی ذمہ داریوں سے محبت نبھا رہا تھا۔ والدہ تہجد گزار عورت تھیں جو لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے اللہ رب العزت کی دی گئی روٹی روزی کماتی تھی اور اپنی چھوٹی سی جنت میں خوش تھی۔

"میرے اللہ! ہمیں کس ملک میں پیدا فرما دیا؟" آج خلیل احمد کی دُعا کا انداز بدل گیا تھا۔

"میرے مالک ہم اپنی مرضی سے تیری عبادت بھی نہیں کر سکتے۔ ہم قربان گاہوں میں قربانیاں بھی نہیں دے سکتے۔ تیرے گھروں کو گرا کر مندر تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ آئے روز مسلمانوں کو حیلے بہانے سے قتل و شہید کیا جا رہا ہے۔ میرے مالک تو سب جانتا ہے اور بہتر جاننے والا ہے۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ "میرے اللہ! تمام معاملات کو تو ہی انجام دے گا اور بہتر دے گا۔ مگر میرے مالک! کوئی تیری ذات کی نفی کرے۔ مجھ سے یہ ضبط نہیں ہوتا۔ میرے اللہ..... تو پتھر میں جونک لگا سکتا ہے..... پرساد چوپڑہ جیسے سنگدل کو بھی راہ حق پر متعین فرما دے۔ اس کو ہدایت نصیب فرما!" وہ دعا ہوا دُعا مانگ رہا تھا اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو وہ کالج کی تیاری کرنے لگا۔ کندن تین دن بعد کالج آیا تھا تمام دوستوں نے اُسے گھیر لیا تھا وہ پاس سے گزرتی ہوئی ایک لڑکی کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔ "مسلمان لگتی ہے؟" وکرم نے فقرہ کیسا تو بابر بول پڑا۔

"مسلمان ہوتی تو سر پر دوپٹہ ہوتا....." ان دوستوں میں ایسی بحثیں اکثر ہوا کرتی تھیں۔ اب بھی انجوائے کرنے کے موڈ میں تھے۔

"تو پھر شرط لگی کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو؟" وکرم بولا تو خلیل احمد نے کہا "لگی"۔ بابر اُٹھ کر اس لڑکی پاس گیا اور اُسے مسلمانوں کے انداز میں "السلام علیکم"! کہا آواز اتنی اونچی تھی کہ ان لڑکوں کا گروپ بھی سن رہا تھا اس لڑکی نے مسکرا کر بابر کی طرف دیکھا۔ "نمستے!" وہ ہاتھ جوڑتی ہوئی بولی تو وکرم کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ بابر جیت کی خوشی کا جشن مناتا ہوا واپس اپنے گروپ میں پہنچا تو وکرم کو ڈسپوزل کولڈ ڈرنکس لانے کیلئے بھیج دیا گیا۔

"خلیل احمد! میں سخت شرمندہ ہوں یار!" کندن کے چہرے سے ندامت جھلکتی دیکھ کر خلیل احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تمہارے ڈیڈی کو دولت اور مان مرتبے کا غرور ہے لیکن کسی بھی مذہب کے لوگوں کے خدا اور ماننے والوں کو اس طرح انکار اور....."

"میں جانتا ہوں کہ تم نے بہت محسوس کیا ہے کیونکہ مذہب سے لگاؤ اور اللہ کی ذات سے تمہاری محبت مجھ سے کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔" کندن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پھر سوری کر لی۔

"کندن! میں دوست ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس دوستی کی معراج سدا بلند ہی رہے۔ اس میں کہیں بھی مذہب کی دیوار حائل نہ ہو۔" کندن مسکرانے لگا۔ "مگر میں چاہتا ہوں کہ تم ایک بار..... صرف ایک بار ہمارے مذہب کا مطالعہ کر لو..... بس یہ سمجھو کہ تم کسی مذہبی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہو۔"

"میں تمہاری دوستی کی قدر کرتا ہوں اور مجھے فخر ہے کہ تم میرے جگری یار ہو..... تم کہتے ہو تو میں اسلامی کتب کا مطالعہ ضرور کروں گا۔"

"قرآن کریم کا بھی!" بابر نے بھی گفتگو میں لقمہ دے کر اپنی نیکی بڑھانے کی کوشش کی تو کندن مسکراتا ہوا بولا۔

"ہاں یار! قرآن کریم کا مطالعہ بھی کروں گا اور پھر ہم لوگ اس کی مختلف آیات پر تبصرہ بھی کریں گے۔"

"بڑے شوق سے کر لینا..... کیونکہ تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ خلیل احمد قرآن کریم اور احادیث کی کتب کو محبت اور عقیدت سے دل میں بسا چکا ہے۔"

"ہاں بھئی تبھی تو اسے یونیورسٹی میں بغیر ریش کا مولوی کہتے ہیں۔" ایک جاندار قہقہے نے

سب کو انکی طرف متوجہ کیا تو دور کھنین پر کھڑا وکرم بھی ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ اسلام پردے کے متعلق کیا فرماتا ہے؟" خلیل احمد نے محسوس کیا کہ کندن کی اسلام میں دلچسپی بڑھنے لگی ہے۔ اس نے ذہن کی لائبریری کھول کر اسلام کا تشخص اور اللہ کی وحدانیت بیان کرنا شروع کر دی۔

"اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کبھی بھی نہیں بدل سکتے۔" تقریباً تین منٹ کی پردے کی متعلق گفتگو کے بعد خلیل احمد نے یہ کہہ کر سانس لیا تو کندن پھر بول پڑا کیونکہ اب اس کے دو تین اور ہندو کلاس فیلوز بھی آ گئے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ خلیل احمد کو مذہب کے متعلق زچ کرے۔ ایسا ان کے درمیان چلتا ہی رہتا تھا۔

"سورگ اور نرگ بھگوان کے بنائے ہوئے ہیں۔ انسان ان میں سے کس کا حقدار ہے...... یہ بات کس کسوٹی پر پرکھی جا سکتی ہے" کندن کا سوال گہرا تھا مگر خلیل احمد مسکراتا ہوا بولا۔

"کافر کے لیئے دوزخ اور مومن کیلئے جنت ہے...... میرا لفظ کافر تلخ ہے لیکن چونکہ ہم سب اچھے ماحول اور دوستی میں بیٹھے ہوئے ہیں اس لیئے بھی غصہ نہ کرنا کہ ہم پڑھے لکھے اور باشعور ہیں اور بات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ نا کہ لڑنے کی۔ کافر کے معنی ہیں انکار کرنے والا جو بھی اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس کا انکاری ہے وہ کافر ہے اور دوزخ اس کی منتظر ہے اور جو بھی اللہ کی وحدانیت اور اس کے لاشریک ہونے پر دل و جان سے ایمان لاتا ہے وہ مومن؟ اور جنت ان کیلئے۔" خلیل احمد کی دلیل نے ان کی بولتی بند کروا دی تو کندن بولا۔ "اچھا ہوا کہ تم نے لفظ کافر کی تشریح فوراً ہی کر دی ورنہ ابھی وکرم کے ہاتھوں قتل ہو جاتے۔" اس کی بات سن کر خلیل احمد اور سبھی مسکرانے لگے۔

"اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کیلئے ہماری سب سے بڑی اور بہتر رہنمائی ہماری مقدس کتاب قرآن مجید کرتی ہے۔ اللہ رب العزت نے اپنے پیارے انبیاء کرام پر چار کتابیں نازل کی ہیں۔ جن میں تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر۔ زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر۔ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور قرآن کریم اپنے پیارے محبوب اور آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کی۔ اسلام کیا ہے کب سے ہے۔ کیوں ہے۔ یہ سب کچھ آخری کتاب قرآن مجید میں درج ہے۔ یہ کسی آدمی کے بنائے یا لکھے ہوئے اصول نہیں ہیں جن پر عمل کر کے مسلمان زندگی گزرتے ہیں بلکہ اللہ رب العزت کے بنائے اور بتائے ہوئے قانون

اور اصول ہیں جن سے انحراف کسی بھی مسلمان کی جرات نہیں ہے۔ بلکہ اس مقدس قرآن پر اپنی دولت، جان و مال عزت اور اولاد کو بھی ہم لوگ قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جس انسان (مسلمان) کو قرآن کریم کی آیات اور سورتیں یاد ہونگی وہ روز محشر ان کو پڑھتا جائے اور جنت میں چلتا جائے وہ سب جگہ اس کی ملکیت ہو گی۔" اتنی دیر میں وکرم بھی ڈیسپوزل کولڈ ڈرنکس لے آیا خلیل احمد کا گلہ خشک ہو رہا تھا اس نے پھر بھی بے صبری کا مظاہرہ نہ کیا اور گھونٹ گھونٹ جوس پینے لگا۔ جبکہ کندن کی آنکھیں ابھی تک حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"کیا اس کتاب میں اپنی مرضی کی تبدیلی یا کمی بیشی نہیں کی جا سکتی ہے؟" کندن کے دماغ واقعی کندن تھا اس نے سوال بدل کر پوچھا تھا اس کا مقصد بہت گہرا تھا جیسے خلیل احمد نے محسوس کیا اور جوس کے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتا ہوا بولا۔

"قرآن کریم اتنی مکمل اور جامع کتاب ہے کہ اگر کوئی انسان اس میں لفظ شیطان نکالنا چاہے اور اپنی مرضی سے لفظ اللہ لکھنا چاہے تو پوری کتاب کا ترجمہ اور معنی تبدیل ہو جائیں گے۔ نزول قرآن سے لیکر آج تک اور کئی ہزار سالوں تک یعنی تا قیامت قرآن کریم کی زیر زبر شد مد جزم میں کوئی بھی فرق نہیں آیا ہے اور نہ ہی آئیگا اور نہ ہی کوئی اس میں تبدیلی کی جرات کرے گا۔" وہ سانس درست کرتا ہوا بولا۔ "تمہارے مذہب کی مقدس کتاب گیتا میں بجا طور پر کئی جگہ تحریر ہے کہ بھگوان ایک ہے اس ایک بھگوان کی پوجا کے بجائے تم لوگوں نے کئی ناموں اور کئی شکلوں سے بھگوان بنا کر ان کو پوجنا شروع کر دیا ہے جبکہ ہم مسلمان قرآن کے کہے پر یقین رکھتے ہوئے صرف اللہ واحد کی ذات پر ایمان لاتے ہیں اور اسی کی عبادت کرتے ہیں اور مرنے کے بعد زندہ اٹھنے پر بھی یقین رکھتے ہیں۔" یہ پہلا موقع نہ تھا کہ خلیل احمد نے مذہب کی بحث پر ان کی بولتی بند کروائی تھی۔ اب بھی وہ سبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

☆☆☆

جگنو نے نور شاہ ولی سرکار کی قبر پر پڑی ہوئی چادر کو ہاتھوں سے پکڑ کر منہ اس پر رکھا ہوا تھا اور زار و زار رو رہا تھا۔ اس کی سسکیاں اور ہچکیاں دربار کے احاطہ میں گونج رہی تھیں۔ اس کے آنسوؤں سے چادر گیلی ہو گئی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ اور سوجن زدہ ہو گئیں تھیں۔ اُسے گرد و پیش کی کوئی خبر نہ تھی وہ اپنی مستی میں مگن اپنے کام میں مصروف تھا کہ اس کے کانوں میں حافظ جی کی آواز گونجی۔

''اللہ کے قانون کو تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہو جگنو میاں!؟'' اس نے چونک کر سر اُٹھایا وہ اس کے سر پر کھڑے تھے مگر ان کی آنکھیں بند تھیں اور جگنو کو معلوم تھا کہ حافظ جی اُسے اچھی طرح دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک قد آور شخصیت تھے ان کے سر کے تمام بال سیاہ اور کنپٹیوں کے بال سفید تھے جبکہ چہرے پر نور برس رہا تھا ان کی موٹی موٹی آنکھیں ان کے خوبصورت چہرے کو مزید حسن بخشتی تھیں۔ زیارت کے باغوں میں اُگنے والے سُرخ و سپید سیب کی طرح ان کی گالیں اتنی چمکدار تھیں کہ خون کی روانی بھی نظر آتی تھی۔ ان کی چمکدار پیشانی پر سیاہ رنگ کا بڑا سا محراب اس بات کا پتہ دیتا تھا کہ رب ذوالجلال کی بارگاہ میں سجدوں کی بہاریں لگانے میں حافظ جی نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ان کے نرم و گداز ہاتھوں کی انگلیاں ایسی تھیں کہ روئی کے ٹکڑوں کو لپیٹ کر رکھا ہو۔ جگنو نے ہمیشہ اپنا آپ ان کے وجود کا دیدار کرنے میں گم کیا تھا اب وہ بھی اپنا رونا دھونا بھول گیا تھا وہ جب بھی حافظ جی سے بات کرتا تھا دنیا و مافیا سے بے خبر ہو جاتا تھا مگر آج خاص بات تھی اس کی ذات کے ساتھ جڑے ہوئے اہم رشتوں کی بات تھی جس نے اُسے رولا دیا تھا ایک بار پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں کے نمکین پانی سے بھرنے لگیں تو حافظ جی بولے۔

''جو کچھ تقدیر میں ہے ہو کر رہے گا اُسے سکون کے ساتھ برداشت کرنے کی کوشش کرو کیونکہ دنیا میں کوئی بھی شخص اتنی جراُت اور طاقت نہیں رکھتا کہ تقدیرِ الٰہی کو جھٹلا سکے۔'' اب وہ جگنو کے پاس بیٹھ گئے تو اس نے چادر کا کپڑا چھوڑ کر درست کر کے قبر پر بچھا دیا۔ ''پیٹ ایک ایسا برتن ہے جو کبھی بھی نہیں بھرتا اور نہ ہی کبھی ٹوٹتا ہے جو زیادہ امیر ہو گا وہ اس دنیا کا زیادہ محتاج ہو گا۔''

''ماموں اور مامی نے اماں کی بہت بے عزتی کی ہے۔'' وہ رو رو کر اُنہیں بتانے لگا۔ ''پتہ ہے میاں جی مامی نے مجھے کتا کہا ہے۔'' حافظ جی اُسے دلاسہ دینے کیلئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا تو وہ شفقت اور محبت کی مٹھاس سمجھ کر نمکین آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرنے لگا۔

''مجھے یہ دُکھ نہیں ہے میاں جی کہ اش نے مجھے کہتا کہا ہے۔ بش...... دُکھ مجھے اش بات کا ہے کہ اُنہوں نے اماں اور آمنہ باجی کی بے عزتی کی ہے...... میاں جی!...... ماموں نے آمنہ باجی کا دِل توڑ کر چنگا نہیں کیتا۔'' وہ ایک بار پھر رونے لگا تو حافظ جی پیار سے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم اپنی اماں اور بہن سے کتنا پیار کرتے ہو؟'' وہ یہ سوال سن کر حافظ جی کی طرف دیکھنے لگا مگر ان کے چہرے معصومیت بھری مسکان دیکھ کر اس نے سر جھکا لیا۔

''میں رو کیوں رہا ہوں میاں جی! آپ خود ہی شمجھ لیں کہ میں آمنہ باجی سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ پر مجبور اور غریب ہوں اش کی پشند کی چیز اُشے خرید کر نہیں دے شکتا۔'' اس نے حافظ جی کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا تو وہ مسکرانے لگے۔ جگنو اکثر ان کے ہاتھوں کو چومتا رہتا تھا یہ اس کی عقیدت تھی۔

''میاں جی رہ گئی بات اماں شے پیار کی تو مجھے دُکھ اش بات کا ہے کہ مامی نے مجھے کتا کہا ہے۔ اگر وہ مجھے اماں کی عزت کے بدلے شاری رات بھونکنے کو کہتی تو میں بھونکتا رہتا بش وہ اماں کی بے عزتی نہ کرتی۔'' جگنو کی آنکھیں تو جگنے لگیں مگر حافظ جی اس کملے اور جھلے کو دیکھ کر رہ گئے وہ ماں کی عزت کی خاطر ساری رات کتا بن کر بھونکنے کو تیار تھا۔ ''میں اماں کی ممتا اور اش رشتے کا عاشق ہوں۔'' حافظ جی کو چونکانے کے لیئے جگنو کے یہ الفاظ کافی تھے وہ لرز کر رہ گئے۔ ''عاشق'' بہت بڑا لفظ تھا بہت عظیم رتبہ تھا۔ مگر عشق خود بہت ظالم تھا۔ حافظ جی نے اس کملے کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر معصومیت کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی جھلک نمایاں تھی کہ اس نے جو بھی الفاظ ادا کیئے ہیں وہ ان کی سچائی اور معنی کی گہرائی کو جانتا ہے مگر اس کو ابھی بہت کچھ سمجھانے کی ضرورت تھی۔ اُسے عشق کے اوّلے کاموں اور کارناموں کی فہرست سے آگاہ کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ حافظ جی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے سر میں اپنی نرم و نازک انگلیوں سے کنگھی کرنے لگے۔ وہ جب سے اس مزار پر آئے تھے یا ان کی ڈیوٹی لگی تھی بہت سے لوگوں نے ان سے میل جول بڑھانے کی کوشش کی تھی مگر ان کے غلام مؤکل اور جنوں نے اس بات کی اجازت نہ دی تھی کہ حافظ جی دُنیا دار لوگوں سے ملیں۔ مگر جگنو کا معاملہ ہی اُلٹ تھا حافظ جی اس کملے کی سچائی اور سادگی پر قربان ہو گئے تھے۔ وہ اس کے دِل میں جھانک کر دیکھ چکے تھے کہ جگنو کا من چاندی کے تھال کی طرح صاف شفاف ہے تبھی تو وہ حافظ جی کو بہت اچھا لگتا تھا وہ جو کچھ بھی بولتا تھا دِل کی گہرائی سے بولتا تھا کیونکہ دنیا کے کسی بھی معاملہ میں اس کا دماغ کام نہ کرتا تھا۔ مگر اس بار حافظ جی کو ایسا لگا کہ اس نے لفظ عاشق کسی سے سن کر بول دیا ہے بس اُسے اس لفظ کے معنی سمجھانے تھے

''عشق کرنے کا دعویدار ہو کر روتے کیوں ہو؟'' حافظ جی کا انداز ڈانٹنے والا تھا۔ جگنو دل و جان سے ان کی باتیں سننے کیلئے ہمہ تن گوش تھا۔ ''ابھی تو پہلی ہی سیڑھی پر پاؤں رکھا ہے اور گھبرا گئے ہو۔ عشق کی منزلیں بہت کٹھن اور راہیں بہت خاردار ہوتی ہیں ان پر ننگے پاؤں چلنا پڑتا ہے

تپتے اور جھلتے ریگستانوں میں پیاس کی معراج کو بلند رکھنا پڑتا ہے۔ تپتی ریت پر ننگے جسم اور بھوکے پیٹ کے ساتھ پتھروں کی بارش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔'' وہ بڑی محویت سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور حافظ جی بھی سمجھ رہے تھے کہ جگنو ان کی باتوں کو پلے باندھ رہا ہے۔ وہ اپنا سانس درست کرنے کے بعد پھر گویا ہوئے۔

''کئی دنوں کی سلگتی آگ میں کودنا پڑتا ہے۔ انا الحق کا نعرہ بن کر پھانسی کا پھندہ جھولنا پڑتا ہے۔ عشق نام بہت آسان مگر کرنا کہنا اور نبھانا بہت مشکل ہے عشق کو زندہ رکھنے کیلئے خونِ جگر پلانا پڑتا ہے دل کھلانا پڑتا ہے۔'' حافظ جی کی آواز بھرا گئی مگر وہ سنبھل گئے اور اپنے مخصوص لہجے میں بولنے لگے۔ ''جس شخصیت اور ہستی کے عشق میں مبتلا ہو گے سمجھو اپنی بساط اور ہمت کے مطابق اس شخصیت اور ہستی کے عشق کا تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔ عشق صرف کہنے سے ہی پختہ اور پائیدار نہیں ہوتا یہ عملی زندگی میں بھی امتحان مانگتا ہے۔ اس کے امتحان بڑے کڑے اور مشکل ہوتے ہیں اس کے سوالوں کو حل کرنے کیلئے اپنا آپ تیاگ کر اپنی ذات کی نفی کر کے اور اپنے وجود کو ختم کر کے مطلوب کی پرستش کرنی پڑتی ہے۔ پرستش سے میری مراد سجدہ کرنے سے نہیں ہے بلکہ دل خدمت و عظمت اور عقیدت واحترام میں جھکا ہوا ہو۔ آنکھیں ہر لمحہ مطلوب کی راہوں میں دیدار مطلوب کیلئے فرشِ راہ رہیں اور ہر لمحہ ایک فقیر کے کشکول کی طرح خالی رہیں۔ بس ان کا مقصد و محور دیدارِ یار ہی ہو۔ ہونٹ کچھ کہنے سے پہلے کئی بار تھرا کر رہ جائیں زبان دانتوں کے تالے کے اندر بند ہو جائے۔ جسم کے بال عقیدت واحترام میں کھڑے ہو جائیں۔ نظریں مطلوب کو نظروں ہی نظروں میں چومنا شروع کر دیں۔ پاؤں اپنی جگہ ساکت و جامد ہو جائیں متحرک ہونٹ محبوب و مطلوب کی مدحت میں کانپنے لگیں...... یہ ہوتا ہے عشق۔''

حافظ جی خاموش ہوئے تو جگنو ان کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا کیونکہ اس نے پہلی مرتبہ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔

''جگنو میاں!'' حافظ جی بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''آمنہ کی شادی انشاء اللہ بہت اچھی جگہ ہوگی۔ اللہ کے فضل و کرم سے اُسے محبت کرنے والا شوہر ملے گا اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ مستقبل میں اپنے گھر میں راج کر رہی ہے...... بس تھوڑا سا صبر...... عائشہ بہن سے کہنا کہ بھائی کی بیوفائی پر صبر کرے اور اس خاندان پر آنے والی مصیبتوں اور تباہی کا تماشہ دیکھے۔'' جگنو کملا اور جھلا ضرور تھا مگر وہ حافظ جی سے بہت قریب اور مانوس تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ حافظ جی یونہی

کوئی بات نہیں کہتے بس جب بھی وہ کچھ کہتے ہیں اللہ کی رحمت سے وہ ہو کر رہتا ہے۔ جگنو اپنے ہی خیالات میں مگن تھا کہ اس کی سماعت سے حافظ جی کی آواز ٹکرائی تو وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''آنیوالا وقت تمہارا ہوگا۔ تمہاری ماں کی جیت ہوگی اور تمہاری ممتا کی معراج بلند رہے گی۔ بس اتنا یاد رکھنا...... ممتا کے عشق میں جو تاوان تمہیں ادا کرنا پڑے گا اس کیلئے اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ عشق تاوان مانگے اور تم اس کی اداؤں کو سمجھ نہ سکو۔ بس پھر اتنا سمجھ لو کہ عشق تمہارا ستیاناس کر دے گا۔ گلیوں کی خاک بن کر در در بھٹکتے پھرو گے...... تاوانِ عشق کیلئے خود کو ہر لمحہ تیار رکھنا۔'' حافظ جی کی آواز بھرائی ہوئی تھی وہ اُٹھ کر اپنے حجرے کی جانب چل پڑے جبکہ جگنو اپنی سرخ اور سوجن زدہ آنکھوں سے ان کو جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

اختر علی نے سلام پھیرا اور آج کے سب سے بڑے اور پہلے فنکشن کی کامیابی کی دُعا مانگنا شروع کر دی مگر دو دن سے شروع ہونیوالی دلی اور ذہنی بے چینی کو قرار نہ مل رہا تھا۔ اختر علی نے آج بڑے بیٹے احمد کی بارات لے کر وفاقی وزیر کے گھر جانا تھا سب انتظامات تسلی بخش تھے۔ روپے پیسے کی فراوانی تھی۔ اولاد بھی اس کے حکم کو اول درجہ دیتی تھی مگر جس دن سے عائشہ بی بی کو امتل اور اختر علی نے ذلیل کر کے گھر سے نکالا تھا تب سے وہ خاموش خاموش رہتا تھا مگر گزشتہ دو دنوں سے عجیب سی بے قراری اور بے چینی نے اس کے دل دماغ پر حاوی ہو کر اختر علی کو بہت سارے کاموں سے بیگانہ کر دیا تھا۔

امتل کے بھی رشتہ داروں سے محل بھرا ہوا تھا جو ابھی تک اونگھ رہے تھے بلکہ اذان فجر سے چند لمحات پہلے ہی سوئے تھے۔ تمام مہمانوں میں اختر علی کی اولاد کے علاوہ اس کا کوئی بھی اپنا اس شادی میں شریک نہ تھا۔ دُنیا بھر میں اس کی ایک ہی بہن تھی جس نے اختر علی کو والدین بن کر پالا تھا مگر آج امتل کی بدزبانی اور اختر علی کے سٹیٹس نے اس خونی رشتے پر بھی پانی پھیر دیا تھا۔ وہ اپنے بہنوئی ابراہیم کا سامنا نہ کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اُنہیں اپنے گھر اس اہم تقریب میں مدعو کرنا چاہتا تھا کیونکہ ابراہیم سبزی کی ریڑھی لگاتا تھا اور اس بات پر اختر علی کو اپنے ''معزز'' مہمانوں کے سامنے شرمندگی اُٹھانا پڑے گی۔ اسی لیئے اس نے بہن کو چھوڑ کر اہم تقریب کو انجام دینے کا فیصلہ کیا تھا مگر چین و قرار نہ مل رہا تھا وہ ٹہلتا ہوا لان میں آ گیا۔ پورا لان میدان جنگ بنا ہوا تھا جگہ جگہ

کرسیاں بکھری ہوئی تھیں۔ سٹیج پر بھی چند گھنٹے قبل گھمسان کا منظر تھا کیونکہ لڑکی والے مہندی لگانے آئے تھے خوب ہلا گلہ مچا تھا۔ اختر علی چلتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا اس نے اوپر منہ کر کے آسمان پر چمکنے والے ستاروں کو دیکھا جو ایک ایک کر کے چاند کا ساتھ چھوڑ رہے تھے اور چاند بھی ایک جانب کو منہ لٹکائے ہوئے جا رہا تھا۔ اختر علی اس منظر کی گہرائی کو سمجھ کر لرز کر رہ گیا۔

ہوا میں خنکی تھی اوس نے گھاس کو چمکدار بنا دیا تھا مگر اختر علی کو رہ رہ کر بڑی آپا کا خیال آ رہا تھا جسے اس نے غریب ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا اور پھر جس بیٹے کی شادی وہ کرنے جا رہا تھا وہ بچپن سے ہی آمنہ کے نام کے ساتھ منسوب تھا اختر علی نے یہ بھی زیادتی کی تھی امتل کے کہنے پر بڑے اور اعلیٰ خاندان کی بیٹی کا رشتہ احمد کے لیئے پسند کیا تھا کیونکہ وفاقی وزیر صاحب امتل کے چچیرا بھائی تھے اور "حنا" امتل کو ایک تقریب میں پہلی ہی نظر میں پسند آ گئی تھی اسی لیئے اس نے گھر میں آتے ہی یہ فساد کھڑا کر دیا تھا کہ اگر احمد کی شادی ہو گی تو اس اعلیٰ خاندان کی بیٹی حنا سے ہی ہو گی۔

اختر علی اس اہم فیصلے کو سن کر سکتے کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور اس بدلے ہوئے فیصلے سے آپا عائشہ کو کیسے آگاہ کرے۔ کافی دن اسی شش و پنج میں گزر گئے تو عائشہ آپا خود ہی ان کے گھر آمنہ اور احمد کے رشتے کی بات طے کرنے چلی آئیں۔ مگر امتل اور اختر علی نے اُنہیں اپنی دولت اور ان کی غربت کی ایسی ذلت آمیز کہانی سنائی کہ عائشہ آپا کے منہ سے نکلنے والی بد دعائیں آج اختر علی کے لیئے بے چینی اور بے قراری کا سبب بنی ہوئی تھیں۔

اختر علی کی ڈبڈباتی آنکھوں نے سٹیج پر کسی چمکتی ہوئی چیز کو حیرانی سے دیکھا اور اُٹھ کر پاس چلا گیا اس نے دیکھا کہ وہ ایک نیکلس تھا جو کسی لڑکی یا عورت کے گلے سے ہلا گلا کرنے کے دوران گر گیا تھا مگر ابھی کسی کو بھی اس بات کا خیال نہ تھا کہ اتنا قیمتی اور وزنی نیکلس کہاں گیا۔ اختر علی نے وہ اُٹھا کر دیکھا اور اس بات کا شکر ادا کیا کہ کسی ملازم کے ہاتھ نہیں لگ گیا اس نے قمیض کی سائیڈ جیب میں ڈال لیا اور جو کوئی مانگے گا اُسے دے دوں گا یہ سوچ کر ارد گرد نگاہیں دوڑانے لگا۔ مگر کوئی اور چیز نہ مل سکی۔

اختر علی نے اپنے آپ کے ساتھ ایک ایسا فیصلہ کیا جو امتل اور باقی افراد کے خلاف تھا مگر اپنی بے چینی اور بے قراری کو قرار دینے کیلئے اختر علی تخلیاتی دنیا میں پورے گھر کے افراد سے ٹکرا

گیا تھا۔ اس نے گیٹ پر پہنچ کر چوکیدار کو گیٹ کھولنے کو کہا تو وہ حیرانگی سے صاحب کی طرف دیکھنے لگا کیونکہ اختر علی کبھی بھی اتنی صبح گھر سے نہ نکلا تھا مگر چوکیدار کی جرأت نہ تھی کہ وہ اس سے کچھ پوچھتا لہٰذا خاموشی سے اُسے جاتا دیکھتا رہا۔

ٹھنڈی اور خشک ہوا نے اختر علی کو چادر صحیح طرح لینے پر مجبور کر دیا تھا دور کہیں کہیں کسی بنگلے میں روشنی کی کرن اس بات کی گواہی دیتی تھی کہ اس محل کے مکین نماز پڑھنے کیلئے بیدار ہو چکے ہیں۔ ان اونچی نیچی اور پرشکوہ عمارتوں کے باہر کسی غریب پر کیا گزر رہی تھی انہیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ سخت گرمیوں میں ان بنگلوں اور محلوں کے اندر چلنے والے ایئر کنڈیشنڈ باہر کے درجہ حرارت میں مزید اضافہ کا باعث بنتے تھے جبکہ سخت سردیوں میں باہر کوئی سردی اور موسم کی سختی برداشت نہ کرتے ہوئے رات بھر ٹھٹھرتا رہتا تھا انہیں کوئی پرواہ نہ تھی وہ اپنے قیمتی اور ریشمی لحافوں میں مست خواب و خرگوش کے مزے لیتے رہتے تھے۔ اختر علی نے ایک رکشہ والے کو ہاتھ دے کر روکا اور اس میں فوری سوار ہو گیا تھا کیونکہ سردی کی ہلکی سی لہر بھی اس سے برداشت نہ ہو رہی تھی۔

اس نے رکشہ میں بیٹھ کر اپنی منزل بتائی اور اپنے دِل و دماغ میں الفاظ کا ذخیرہ جمع کرنے لگا وہ تمام معذرت خواہان الفاظ تھے مگر ان کو ادا کرنا ہی اصل مرحلہ تھا۔ رکشہ والا نے اُسے سڑک پر اتار دیا اس نے کرایہ ادا کیا اور ایک گلی میں چل پڑا ایک گھر کے باہر کھڑا ہو کر غور سے اس گھر کو دیکھنے لگا۔ وہ گلی میں اکیلا ہی کھڑا تھا دور دور تک کوئی بھی نہ تھا مگر اس گلی میں اس کی کالونی کی طرح اندھیرا نہ تھا ہر دوسرے گھر کی لائٹ آن تھی اور کسی گھر سے تو تلاوت کلام مجید کی میٹھی آواز بھی اختر علی کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔

اس گندی گلی میں اختر علی کا بچپن گزرا تھا وہ بھی دوسرے بچوں کی طرح اس گندی گلی میں اخروٹ، کینچے اور دوسری کھیلیں کھیل کر جوان ہوا تھا یہ گندی گلی اس کی اپنی تھی مگر وہ اس وقت خود کو اجنبی اور اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ بچپن اور لڑکپن کی یادوں نے دل و دماغ پر محبت بھرا گھونسا مارا تو اختر علی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں وہ ہونقوں کی طرح ہر گھر کو دیکھنے لگا۔

نظریں گھوم کر اسی دروازہ پر آ کر ٹھہر گئیں جس کے سامنے ایک ہتھ ریڑھی کھڑی تھی اور گھر والوں کی مفلسی کی داستان اس گھر کے باہر اکھڑا ہوا پلستر اور سفیدی سنا رہے تھے۔ اختر علی نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ دروازے پر دستک دی تو دِل کو دھڑکن واضح سنائی دینے لگی اس کے لرزتے ہونٹوں اور سلگتی آنکھوں نے جس ہستی کا دیدار اور بات کرنے کی دِلی دُعا مانگی تھی اندر سے

اسی کی آواز آئی۔

''کون ہے اس وقت؟'' اختر علی یہ آواز سن کر لرز گیا تھا یہ اس کی ماں جائی بہن ماں جیسی عائشہ آپا کی آواز تھی اختر علی کو یاد آ گیا جب وہ مل کی نوکری سے نائٹ ڈیوٹی کر کے نماز فجر کے وقت واپس آیا کرتا تھا تو اسی طرح ہلکی سی دستک پر آپا عائشہ کی یہی صدا انہی الفاظ پر مشتمل ہوتی تھی اور اختر علی کے بھی لب پھڑ پھڑائے کہ وہ اس آواز کے جواب میں وہی الفاظ دہرائے جو وہ بائیس سال قبل دہرایا کرتا تھا۔ ''تمہارا اختر علی ...... آپا...... اختر علی کو اپنی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی مگر اس کی توقع اور امیدوں کے برخلاف دروازہ بہت جلد کھل گیا۔ سامنے آپا عائشہ کھڑی تھیں اور ان کے پیچھے بھائی ابراہیم کھڑے تھے ان کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب دیکھ کر اختر علی کی نظریں جھک گئیں مگر آنکھوں نے ساون کی جھڑی لگا دی تھی۔ ماں جیسی بڑی بہن بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھتے ہوئے دروازے سے ایک طرف ہو گئیں گویا کہ انہوں نے اختر علی کو اندر آنے کا راستہ دیا اور پھر اس کے اندر آنے پر دروازہ بند کر دیا۔

اختر علی طویل عرصہ بعد اس گھر میں آیا تھا کچھ بھی نہ بدلا تھا اس صحن کے اُکھڑے ہوئے فرش کی سرخ اینٹوں سے اُسے مانوس سی خوشبو نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ گھر کی دیواروں نے اختر علی کو دیوانہ وار خوش آمدید کہا تھا۔ وہ چلتا ہوا ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ابراہیم نماز سے فارغ ہو کر منڈی جانے کی تیاری میں تھا۔ تسبیح ہاتھ میں پکڑے وہ اس بات کا منتظر تھا کہ اختر علی کوئی بات کرے مگر کچھ لمحات اسی طرح گزر گئے تو ابراہیم کی آواز گونجی۔ ''اس غریب اور مفلس زدہ گھر میں نہ ہی قیمتی صوفہ اور قالین ہے۔ اس کے باوجود بھی تمہارا اس وقت اتنے سالوں کے بعد اس کچرا گھر میں آنا میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' اختر علی شرم سے زمین میں گڑھا جا رہا تھا وہ جانتا تھا کہ بھائی ابراہیم نے ساری زندگی عاجزی اور خودداری میں گزاری ہے وہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر الفاظ ان کی زبان اور دل و دماغ کے مرہونِ منت رہتے تھے۔

اختر علی راستے بھر جن الفاظ کو اپنا ہمدرد اور ساتھی سمجھتا رہا تھا اب وہ سارے الفاظ ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اب اس میدان جنگ میں اس کی حالت اس کمانڈر جیسی ہو گئی تھی جس کے تمام سپاہی اس کی غلط پالیسیوں کا شکار ہو کر دشمن کے قبضے میں چلے گئے تھے اور وہ اکیلا ہی میدان میں اپنے شکستہ حوصلے اور ٹوٹے ہتھیاروں کے ساتھ کھڑا تھا وہ یا تو بھاگ جانا چاہتا تھا یا پھر دشمن کے سامنے ایک قیدی کی صورت میں اپنے آپ کو پیش کرنے کیلئے ذہن بناتا ہے۔

اس میدان سے بھی اختر علی کو بھاگنے کا موقع نہ ملنے والا تھا کیونکہ یہ جنگ اس نے خود شروع کی تھی اور جنگ لڑتا لڑتا اس مورچے تک پہنچا تھا مگر اب الفاظ ساتھیوں کی صورت میں بھگوڑے ہو چکے تھے لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ خود کو قیدی کی صورت میں پیش کر کے پسپائی اختیار کی جائے۔

''میں...... بہت شرمندہ ہوں آپا...... ابراہیم بھائی!'' اس نے رشتوں کے سپہ سالاروں کے سامنے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے خود کو سرنیڈر کر دیا تھا مگر رشتوں کے عظیم سپہ سالاروں کا فیصلہ ابھی باقی تھا ان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کو اپنے پسپائی والے الفاظ سے فتح کرنا تھا۔

''تمہارے الفاظ میری عائشہ اور جگنو کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کا ازالہ نہیں بن سکتے۔'' عائشہ بی بی شوہر کی بات سن کر بھائی کی حمایت میں کچھ نہ بول سکیں۔ ''میں زندگی میں بہت کم حیرت انگیز باتیں سن سکا ہوں یا پھر بہت کم ایسے مناظر میری آنکھوں نے دیکھے ہیں جو میرے لیئے حیرت و استعجاب کا باعث بنے ہوں۔'' اختر علی ابراہیم کی مدلل گفتگو کا تہہ دل سے قائل تھا مگر فی الحال وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کا بہنوئی کیا کہنے والا ہے کیونکہ ان پڑھ آدمیوں سے پڑھا لکھا شخص ہمیشہ ہی ڈرتا رہتا ہے کیونکہ ان کی سمجھ اور عقل ڈگریوں کی محتاج نہیں ہوتی اور نہ ہی انہوں نے سلیبس سے کوئی سبق پڑھا ہوتا ہے۔ وہ ابراہیم کی بات پوری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

''مگر آج اس وقت جب سارا عالم خواب وخرگوش سے لطف اندوز ہو کر نئی صبح کو قرآن کی تلاوت اور اپنی جبیں پر سجدوں کا نشان سجا کر آغاز کرنے والا ہے۔ تم جیسے امیر کبیر آدمی کا میرے گھر میں آنا مجھے زندگی میں حیران کر گیا ہے۔'' اختر علی کی نظریں مزید جھک گئیں۔ ''اپنے آنے کا مقصد بیان کرو اختر علی!'' ابراہیم کے منہ سے لگی لپٹی بغیر بچی اور کھری باتیں سن کر عائشہ بی بی بھی خاموش ہو گئیں جبکہ آمنہ بھی جاگ گئی اور ماموں اختر علی کو اپنے گھر کے صحن میں دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی حیرت سے کھل گئی تھیں۔ وہ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ جبکہ جگنو کسی کمرے میں گہری نیند سویا ہوا تھا اور عفی حسبِ معمول ابھی تک آیا ہی نہ تھا۔ ''اس دن احمل نے آپ کے ساتھ بہت بدتمیزی کی۔'' اختر علی نے ڈرتے ڈرتے کہنا شروع کیا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی اصل بات کی طرف آنا چاہتا تھا۔ ''میں اس کی طرف سے آپ لوگوں سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ وہ بدتمیز اور بد دماغ ہے۔ اس دن سے آج تک میں بہت بے چین و بے قرار رہا ہوں۔'' وہ سہمے اور شرمندہ لہجے میں بات کر رہا تھا گھر کے تینوں مکین اس کی طرف متوجہ تھے۔

''اگر آپ کہیں تو احمل بھی آ جائے گی...... مگر آج میں آپ لوگوں کو لیکر ہی جاؤں گا۔'' اختر

علی نے اپنی بات غلیل میں ڈال کر الفاظ کا سہارا لیکر بہن اور بہنوئی کے کورٹ میں پھینک دی تھی۔ عائشہ بی بی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں اس کے بولنے سے پہلے ہی ابراہیم بول پڑے۔

''آج کوئی تہوار بھی نہیں ہے۔ میں اسی بات پر حیرت زدہ ہوں کہ ایک بھائی اپنی بہن سے معافی مانگنے منہ اندھیرے کیوں آیا ہے؟ اور میاں اختر علی...... یہ ہمیں کہاں لیجانے کی بات کر رہے ہو۔'' ابراہیم کی باتوں میں جو طنز تھا اُسے سبھی اپنی جگہ محسوس کر رہے تھے۔ اختر علی نے اوپر آسمان کی جانب دیکھا جو ابھی سورج کے نکلنے کی نوید بن کر نیلاہٹ میں ظاہر ہونے لگا تھا۔ وہ ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس لیتا ہوا بولا۔

''معافی مانگنے کیلئے کوئی تہوار یا وقت مقرر نہیں ہوتا...... مگر پھر بھی میں آپ لوگوں کو جس تہوار میں مدعو کرنے آیا ہوں اس کیلئے میں آپ کے پاؤں پڑنے کو بھی تیار ہوں۔'' وہ چارپائی سے اُٹھ کر ابراہیم کی طرف بڑھا تو وہ اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔

''آج احمد کی شادی ہے۔ شام کو بارات ہے۔'' اختر علی نے تینوں مکینوں پر الفاظ کی بجلی بم بنا کر گرائی تھی۔ آمنہ نے لرزتے ہاتھوں سے دروازے کی چوکاٹ کو پکڑ لیا تھا۔ ابراہیم اور آمنہ زمین پر کھڑے تو تھے مگر زندہ انسانوں کی صورت میں نہیں بلکہ بے جان اور بے حرکت مجسموں کی صورت میں۔ اُنہیں ایسے لگا تھا کہ آسمان کی تمام بلائیں ان کے گھر میں چیخ و پکار کر رہی ہیں۔ یہ گھر زمین بوس ہو گیا ہے اور اس کا تمام ملبہ ان دونوں کو زندہ نگل گیا ہے۔ ابراہیم لرزتی ٹانگوں کے ساتھ دیوار کا سہارا لیکر کھڑے ہو گئے جبکہ پتھر چہرہ لیئے زندہ آنکھوں سے آنسوؤں کی لکیروں نے عائشہ بی بی کی زندگی کی نوید دی تھی وہ بت بنیں بھائی کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔

آمنہ کو بھی اپنی ساعت پر یقین نہ آ رہا تھا جبکہ کچھ دن قبل احتل مامی نے اس کے اور احمد کے رشتے پر اماں کی بہت توہین کی تھی۔ ان کی طرف سے صاف اور کورا انکار تھا مگر پھر بھی آج آمنہ کو یوں لگا کہ دل کے اندر بنے ہوئے طاق میں سجائی گئی تصویر کا فریم چھناکے سے ٹوٹ گیا ہے۔

''میری آپ سے درخواست ہے کہ شام کو ضرور تشریف لائیں...... مجھے بہت خوشی ہوگی۔ شاید میں اپنی غلطی اور احتل کی بیوقوفی کا اسی طرح ازالہ کر سکوں۔'' اختر علی اپنی بات یہ دیکھے اور سمجھے بغیر کہہ گیا کہ اس کی بات کسی نے سنی ہے یا نہیں...... مگر بات کی جائے تو گھر تو کیا ارد گرد کے مکانوں کی دیواریں بھی سن لیتی ہیں وہ تو پھر زندہ نفوس پر مشتمل گھرانہ تھا اسی لیئے اختر علی کی بات سبھی نے سُنی۔

''تو پھر دُعا کرو اختر علی!'' عائشہ بی بی بولیں۔ ''شام سے پہلے پہلے آمنہ مر جائے۔'' بات کی گہرائی نے سبھی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ عائشہ بی بی کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیر کے سوا کوئی اثاثہ نہ تھا جسے وہ تاثرات کا نام دے سکتے تبھی تو اختر علی بہن کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی کیونکہ آمنہ اور احمد کی بچپن سے ہی نسبت طے تھی مگر دولتمند اختر علی نے وعدہ خلافی کی تھی اور اب منہ اندھیرے احمد کی شادی اور بارات کا سندیسہ بن کر اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ نے عائشہ بی بی سمیت سب کو بھسم کر دیا تھا۔

''میری محبت کا امتحان لینے آئے ہو اختر علی؟'' عائشہ بی بی کی لرزتی ہوئی آواز نے ان کے دل کی ترجمانی کر دی تھی۔ ''میں اتنی مجال نہیں رکھتا...... مگر میں بھی ممتا کی محبت کا فقیر بن کر آیا ہوں۔'' اختر علی کی آواز بھی رندھ گئی تھی۔

''اپنی بیٹی کی خواہشوں اور آرزوؤں کے مزار پر کوئی بھی ماں خوشی خوشی چراغاں نہیں کرتی۔'' عائشہ بی بی بولیں۔

''آمنہ میری بھی بیٹی ہے۔ اس سارے کھیل کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر میرے بیٹے کی خوشی میں شریک ہو جاؤ۔''

اختر علی کی آواز میں لجاجت تھی۔ ''میں نے سنا ہے کہ جو شخص ارادے کا پکا ہو وہ دُنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے...... اور آپا...... میری دُنیا آپ لوگ ہو۔''

''جو مطلب کی بات ہے وہ سن لی۔ سمجھ لی اور پلے بھی باندھ لی۔ کیا یہ نہیں سنا کہ دُنیا میں وہی لوگ سر بلند ہوتے ہیں جو تکبر کے تاج کو دور پھینک دیتے ہیں۔'' ابراہیم سے الفاظ کی جنگ جیتنا تو درکنار سوچنا بھی حماقت تھی اختر علی نے موقع غنیمت جانا اور ابراہیم کو غافل جان کر اس کے پاؤں پکڑ لیئے۔ اس کی اس حرکت سے سبھی دم بخود رہ گئے۔ اختر علی کی گرفت یقیناً مضبوط تھی۔

''میں بن ماں باپ کا بچہ ہوں۔ اس نفرت کی دنیا میں سب مجھے لوٹنے والے ہی نظر آتے ہیں۔ آپ لوگوں سے مجھے ماں باپ کی خوشبو آتی ہے۔ میری غلطیوں کی اتنی سخت سزا نہ دیں۔ مجھے معاف کر دیں۔'' وہ رونے لگا تھا۔ اس ملک کا ممتاز صنعتکار جس کے بیٹے کی شادی ملک کی نامور سیاسی شخصیت سے ہونے جا رہی تھی وہ ایک غریب اور مفلس سبزی فروش کے کچے اور ٹوٹے ہوئے گھر میں اس کے پاؤں پڑا ہوا تھا۔ اس میں اس کا کوئی مفاد نہ تھا بلکہ وہ رشتوں کے تقدس کی زنجیر کو ٹوٹ کر بکھرنے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عائشہ بی بی شوہر کی طرف دیکھ کر رہ گئیں

اُنہوں نے بڑی قناعت پسندی اور صبر سے زندگی گزاری تھی۔ بھوک اور افلاس کو شوہر کی محبت کا تحفہ سمجھ کر قبول کیا تھا مگر کبھی بھی اس کے حکم کی سرتابی نہ کی تھی۔ اب بھی وہ اختر علی کو شوہر کے پاؤں پڑا دیکھ کر آنسوؤں کی برکھا برسا رہی تھیں مگر اہم فیصلہ ابراہیم نے ہی کرنا تھا۔

''کوئی گھر چل کر آ جائے تو وہ اپنا من مار کر آتا ہے۔ تم نے میرے گھر آ کر معافی مانگ لی اس میں میری عزت تو ہے ہی...... مگر اختر علی...... تم نے اپنے آپ کو بڑا ثابت کر دیا ہے۔'' ابراہیم نے اُسے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے مزید گناہگار مت کرو...... میں اور عائشہ احمد کی شادی پر ضرور آئیں گے اب تو آنسو پونچھ لو۔'' اختر علی کے لبوں پر مسکان پھیل گئی تھی اور عائشہ بی بی بھی کھل اُٹھیں تھیں جبکہ آمنہ آسمان کی طرف دیکھ کر رہ گئی اس کے کانوں میں باپ کی آواز گونجی۔

''احمد اور آمنہ کا جوگ اوپر والے کو منظور نہ ہوگا...... وہ کاتب تقدیر ہے۔ میں اس عظمت والے رب سے شکوہ کر کے گناہگار نہیں ہونا چاہتا۔'' ابراہیم کی آواز لرز رہی تھی۔

''آپ لوگ جگنو' عفی اور آمنہ کو بھی لیکر آئیں...... وہ آپ کا گھر ہے۔ ان بچوں کا گھر ہے۔'' اختر علی کی آواز سے گیلا پن ختم ہو گیا تھا وہ چہک کر بولا۔

''تمہیں تو علم ہی ہے کہ جگنو وہ جگنو ہے جو دن رات کی تمیز کیئے بغیر ہر جگہ جگمگانا شروع کر دیتا ہے۔ اس بار عائشہ بی بی نے بات کا جواب دیا اُنہوں نے اپنے بیٹے کی تعریف بھی اس انداز میں کی تھی کہ اُن الفاظ میں جگنو کا کملا اور جھلا پن بھی چھپ گیا تھا اور بات اختر علی کی سمجھ میں بھی آ گئی تھی۔

''اور آمنہ کو میں لوگوں کی تنقید بھری نظروں اور طنزیہ انگلیوں کے اشاروں کا نشانہ نہیں بنانا چاہتی اس لیئے میں اور تمہارے بھائی ہی آئیں گے۔ ہمیں خوشی ہے۔ بے فکر ہو جاؤ۔'' اختر علی کی بے چینی کو چین اور بے قراری کو قرار مل گیا تھا اُسے یکدم سکون محسوس ہونے لگا تھا اس کے دِل کو بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ مگر اب اصل مرحلہ احتل کو قائل کرنا تھا۔ اور اختر علی جانتا تھا کہ یہ انتہائی کٹھن کام ہے۔

☆☆☆

بیٹی کی خواہشات کا گلہ گھونٹ کر اس کے ارمانوں کا خون کر کے رچائی جانیوالی شادی میں شامل ہونے کیلئے ابراہیم اور عائشہ بی بی اس کی آرزوؤں کے مزار پر رشتوں کے تقدس اور معراج

کی شمع کو روشن کرنے کیلئے پہنچ گئے تھے۔ احتل کے تمام رشتہ دار جمع تھے مگر اختر علی کا ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ اختر علی رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور پھر بہت سے ضروری کام بھی اس کی ذمہ داری تھے وہ اپنی نیند پوری کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے کاموں سے بھی نبرد آزما ہو رہا تھا۔ اس نے گھر والوں کو ابراہیم اور عائشہ بی بی کی آمد کے سلسلہ میں قائل کر لیا تھا۔

عاصم جو کہ اختر علی کا چھوٹا بیٹا تھا کام کی بہت ساری ذمہ داری اس نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ مگر بیرونِ ملک سے آنیوالی کاروباری پارٹیوں سے کوئی بھی معاہدہ کرنے سے پہلے وہ اختر علی سے ضرور مشورہ کرتا تھا اور کوئی بھی اہم نکتہ سمجھ نہ آنے پر وہ اختر علی کو آگے کر دیتا اور پھر معاملہ طے ہو جاتا تھا۔ اب بھی وہ فون پر کسی سے کاروباری ڈیل میں اُلجھا ہوا تھا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اور چند گھنٹوں بعد احمد کی بارات جانے والی تھی اور بات مینجر کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی یا پھر یوں تھا کہ مینجر فون پر عاصم کو سمجھا نہ پا رہا تھا۔ عاصم نے اُکتا کر سامنے بیٹھے ہوئے اختر علی کی طرف دیکھا اور مینجر سے بات کرنے کا اشارہ کیا۔ اختر علی سمجھ گیا کہ معاملہ عاصم کے قد سے اونچا ہے۔

رسمی سلام دُعا کے بعد اختر علی مینجر کی طویل بات سنتا رہا اور ''میں آفس آ رہا ہوں تم پارٹی کو روکو۔'' کہہ کر اس نے مختصر الفاظ میں عاصم کو سمجھایا اور ڈرائیور کے ساتھ شاندار گاڑی میں آفس کی جانب نکل پڑا یونہی اس کی گاڑی گیٹ سے نکل کر بڑی شاہراہ پر دوڑنے لگی عین اسی وقت ابراہیم اور عائشہ بی بی رکشہ میں اس کی شاندار کوٹھی کے سامنے اُتر رہے تھے۔ گیٹ کیپر نے اُنہیں سلام کر کے اندر جانے کا اشارہ کیا ابراہیم اس کوٹھی میں پہلی بار آ رہا تھا اس کیلئے حیرت کا سمندر تھا جو اس کی آنکھوں میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا بے اختیار اس کے دِل سے نکلا۔ ''میری آمنہ کی حیثیت ہی کیا ہے۔ میرے اللہ مجھے صبر عطا کر۔'' حلق میں غبار کا ایک گولہ سا پھنس گیا تھا مگر یہ وقت کسی بھی طرح کسی بھی بات کے اظہار کا نہ تھا۔ کیونکہ رنگ برنگ لباس میں ملبوس لڑکیاں اور عورتیں ان کے لباس کی طرف دیکھ کر حیرت و طنز کا اظہار کر رہی تھیں۔

ابراہیم عمارت کے جہازی سائز لکڑی کے بنے ہوئے خوبصورت دروازے پر جا کر رک گیا۔ دونوں میاں بیوی نے عجیب سی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو ابراہیم کے دل کا غبار اس کی زبان پر آ گیا۔

''عائشہ...... میرا لباس اور میری حیثیت مجھے اندر جانے سے روک رہے ہیں۔'' عائشہ بی بی شوہر کی خودداری کی تہہ دل سے قائل تھیں مگر اب یہاں سے واپس جانا ان کی اپنی توہین تھی جبھی

تو وہ شوہر کو تسلی دینے والے انداز میں بولیں۔ ’’میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ہم اختر علی اور احمد کو مبارک دیکر یہاں پارک میں کرسیوں پر آ کر بیٹھ جائیں گے۔‘‘ عائشہ بی بی کے اشارہ کرنے پر ابراہیم نے وسیع لان پر غور کیا جس میں کرسیوں کی ان گنت تعداد موجود تھی۔ ابراہیم کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ اس کی آنکھوں میں چھانے والے مایوسی اور غم کے سایوں کے ساتھ ساتھ مفلسی کے ڈورے بھی تیر رہے تھے۔ چاروناچار اس نے قدم آگے بڑھا دیئے وہ عمارت کے دروازہ سے اندر داخل ہوئے تو عاصم سے ان کی ملاقات ہوگئی وہ تیزی سے باہر نکل رہا تھا ٹکراؤ ہوتے ہوتے بچا تھا وہ ان دونوں کو دیکھ کر خجل سا ہوگیا تھا۔ پھر بھی تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کیلئے اس نے سلام کرنے میں پہل کی۔

’’اسلام علیکم! پھوپھو اسلام علیکم! انکل!‘‘ عائشہ بی بی نے وعلیکم السلام کہہ کر اس کے سر پر پیار دیا جبکہ ابراہیم نے اپنا دایاں ہاتھ سلام لینے کیلئے آگے بڑھایا تو عاصم نے جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے پاس سے گزرنے والے ملازم کو آواز دیکر بلایا اور بولا۔

’’دیکھو یہ میری پھوپھو اور یہ میرے پھوپھا جی ہیں۔ ان کا ہر طرح خیال رکھنا۔ کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیئے۔‘‘ عاصم کا مخلصانہ رویہ دیکھ کر عائشہ اور ابراہیم کو اپنا خوف جھوٹا لگا مگر اچانک شیشے پر تکون پتھر پڑا جس سے ابراہیم اور عائشہ کے دِل میں تعمیر ہونے والا محبت اور خلوص کا تاج محل کرچی کرچی ہوگیا۔

’’تمہیں ان کے لباس اور حال سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ میرے پھوپھا جی کی کوئی فیکٹری یا مل نہیں ہے بلکہ سبزی کا ٹھیلا لگاتے ہیں اور رشتہ داری تو نبھانی ہی پڑتی ہے۔‘‘ یہ پتھر عاصم نے پھینکا تھا طنز اور تکبر کا یہ وزنی پتھر مفلس اور خوددار تاج محل کو چوراچور کر کے دِل کی کئی راہداریوں کو زخمی کر گیا تھا۔ عاصم تو چلا گیا تھا مگر ابراہیم کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں عائشہ بی بی سے چھپی نہ رہ سکی تھیں۔ ابھی بارات جانے تک نجانے کتنے کرب، دکھ طنز اور طعنوں کے پتھروں کا سامنا ان کا مقدر تھا۔

ملازم نے اُنہیں ایک بیش قیمت صوفے پر بٹھایا اور خود ان کی تواضع کیلئے کولڈ ڈرنک لینے چلا گیا بہت سی مہمان خواتین میں عائشہ بی بی کو کوئی بھی چہرہ شناسا نہ لگا تھا اور یہی حال ابراہیم کا تھا وہ بھی سوٹڈ بوٹڈ مردوں اور نوجوانوں کو دیکھ رہا تھا جو اس وسیع ہال میں بنا مقصد ہی گھوم رہے تھے تب تک دیر میں فریحہ اُن کے پاس پہنچ چکی تھی عائشہ بی بی اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اس نے بھی

دونوں کو سلام کرنے میں پہل کی تھی۔ اس نے ابراہیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’انکل آپ تو پہلی مرتبہ ہمارے گھر آئے ہیں نا۔؟‘‘ اس کے سوالیہ انداز میں بے پناہ خلوص تھا ابراہیم مسکرا کر بولا۔ ’’کیا کروں بیٹی!...... وقت ہی نہیں ملا۔‘‘ مگر دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں کی ہنسی گم ہوگئی اس کی جگہ گہرے کرب اور دُکھ نے لے لی کیونکہ پُرخلوص فریحہ بھی دولت اور تکبر کی زبان سے بھاری بھرکم پتھر ان کی خودداری کے تاج محل پر برسانے لگی۔

’’ہاں! آج کل تو ہر کوئی مصروف ہے۔ چاہے وہ مل اونر ہو یا سبزی کا ٹھیلا لگاتا ہو۔ آپ کبھی کبھار ہی اِدھر آ جایا کرو۔ وہ اپنی ریڑھی لیکر جس پر آپ سبزیاں سجا کر بیچتے ہیں۔‘‘ پھر وہ مسکراتی ہوئی عائشہ سے اجازت لے کر مہمانوں میں گم ہوگئی۔ مگر ابراہیم کے اندر کا کرب اس کے چہرے سے ظاہر ہونا شروع ہوگیا تھا۔ ملازم نے ٹرے میں سجائے ہوئے کولڈ ڈرنکس کے گلاس ان کے ہاتھوں میں تھمائے اور خود چلتا بنا۔

ابھی اُنہوں نے ایک ایک گھونٹ ہی پیا تھا کہ ان کے کانوں میں احتل کی زہریلی آواز گونجی۔

’’آ۔ ہا۔ آج تو میرے گھر مستقبل بتانے والی ہستیاں آئی ہوئی ہیں۔‘‘ اس کا اشارہ اس بات کی طرف تھا جو عائشہ بی بی نے جگنو کے حوالے سے کی تھی کہ احتل کو ایک دن اسی کملے اور جھلے کی چوکھٹ پر جھکنا پڑے گا اس کی بات کا طنز ان دونوں نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ احتل ابھی تک زرق برق لباس میں ملبوس نہ تھی مگر پھر بھی اس نے جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ کافی قیمتی تھے۔

’’ارے ارے یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ حاجی صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔‘‘ ابراہیم ذہنی طور پر تیار ہوگیا تھا کہ اگر اس نے اس بار عائشہ کی توہین کی تو وہ احتل کو کھری کھری سنائے گا۔ مگر بظاہر بلا ٹلتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ’’آپ کولڈ ڈرنکس سے اپنے اندر لگی ہوئی حسد کی آگ کو بجھائیں میں فی الحال مصروف ہوں...... اور ویسے بھی تم لوگ اختر علی کے جاننے والے ہو...... وہی تمہیں ڈیل کریں گے۔‘‘ وہ اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ چلی گئی مگر پانی کے گھونٹ ابراہیم کو زہر لگ رہے تھے وہ گلاس وہیں چھوڑ کر باہر کی جانب چل پڑا تو عائشہ بی بی کو بھی شوہر کی تقلید کرنا پڑی۔ خوبصورت مگر گھٹن زدہ ہال سے باہر آ کر ابراہیم کو کھلی فضا میں سانس لینا اس وقت سب سے بڑی اور اعلیٰ نعمت محسوس ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ عائشہ بی بی بھی شوہر کے دُکھ کو سمجھتی تھیں۔ وہ بھی اس کے پہلو میں آ کر کرسی پر بیٹھ

گئیں۔

"رُوپ رون تے کرم کھان۔" ابراہیم کے منہ سے یہ بات سن کر عائشہ بی بی کو احساس ہوا کہ ابراہیم نے یہ بات کیوں کہی ہے۔ ان کی سوچ سے پہلے ہی ابراہیم نے اپنی بات کی وضاحت کر دی۔ "عائشہ! رنگ روپ تو اللہ کے بنائے ہوئے ہیں مگر خدا کی قسم اصل کی اولاد میری اولاد سے خوبصورت نہیں ہے۔ بس مقدر کی یاوری ہے کہ اتنے عیش و آرام ان کے حصے میں لکھے ہوئے ہیں۔" ابراہیم کی آواز نم ہو گئی تھی۔ "کاش...... اس اتنے بڑے محل میں انسان بستے ہوتے...... رشتوں کے دلال نہیں۔" "اختر علی نجانے کہاں ہے۔" عائشہ بی بی کی کربنا کی بھی قابل دید تھی مگر دونوں ہی ایک دوسرے سے منہ چھپا رہے تھے۔ "ہم اُسے سلامی دیکر ابھی چلے جائیں گے۔" وہ بھی اس گھٹن زدہ ماحول سے تنگ تنگ لگ رہی تھیں اور پھر الفاظ کی جس سولی پر اُنہیں لٹکایا گیا تھا اس پھندے نے اُن کی جان نہیں نکلنے دی تھی۔ بس اُنہیں ادھ موا کر کے تڑپنے کیلئے چھوڑ دیا تھا۔ یا پھر ان دونوں کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اس مچھلی کی مانند تھے جسے پانی سے تو نکال لیا گیا تھا مگر سامنے ہی پانی رکھا تھا تاکہ وہ تڑپ تڑپ کر اس پانی میں جانے کی کوشش کریں اور اسی تگ و دو میں اپنی زندگی کی چند سانسیں پوری کر لیں۔

"اختر علی وہ شکاری ہے جس نے ہمیں شکار کر کے خونخوار درندوں کے آگے پھینک دیا ہے۔" ابراہیم کی دُکھ میں ڈوبی آواز گونجی۔ "بس فرق صرف یہ ہے کہ ان کے دانت نوکیلے نہیں ہیں جبھی تو ابھی تک ہمارا گوشت محفوظ ہے۔ بس ان کے الفاظ زہریلے ہتھیاروں اور نوکیلے دانتوں کا بھرپور وار دِلوں پر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرا سینہ اب پھٹنے کو ہے اور میرا دِل دھڑکنا بھول رہا ہے......" اس نے تکلیف سے عائشہ کی طرف دیکھا۔ "مجھے یہاں سے لے چلو عائشہ! ابھی اور اسی وقت...... ورنہ میں ابھی مر جاؤں گا...... مجھ سے اب اور برداشت نہیں ہوتا۔" ابراہیم کی آنکھوں نے ساون بھادوں کی جھڑی لگا دی تھی تو عائشہ نے حسرت سے بلند عمارت کی سمت دیکھا جو اس کے بھائی اور ماں جائے کی ملکیت تھی مگر عائشہ بی بی کو اتنا اختیار نہ تھا کہ وہ اس عظیم الشان محل کے کسی کمرے میں تو کیا کسی کونے کھدرے میں ہی بیٹھ جاتے۔ ابراہیم نے دور سے احمد کو اپنی طرف آتے دیکھ کر آنکھوں سے آنسو صاف کیئے اور مسکرانے کی اداکاری کرنے لگا۔ عائشہ بی بی بھی شوہر کو داد دے کر رہ گئیں۔

"السلام علیکم!" احمد نے سلام کیا تو ابراہیم نے سوچا کہ پہلے والوں نے بھی سلام ہی کیا تھا

طنز اور تکبر کے نشتر تو بعد میں چلے تھے اب دیکھتے ہیں اس کے پاس کتنے طنزیہ تیر اور دِل کو گھائل کرنے والے لفظی نشتر ہیں۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہو احمد بیٹا!؟" عائشہ بی بی نے اُس کے جھکے ہوئے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو اندر سے آمنہ کی ہوک سنائی دی۔ احمد نے ابراہیم کی طرف سلام لینے کیلئے ہاتھ بڑھایا تو وہ حیرانگی سے احمد کا منہ دیکھنے لگا اور پھر اپنے ہاتھوں کو۔ اُسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر احمد بولا۔

"کیا سوچ رہے ہیں پھوپھا جی؟" احمد کی مٹھاس بھری آواز اور پیار بھرا لہجہ سن کر ابراہیم بول پڑا۔

"تم سے ہاتھ ملانے سے پہلے سوچ رہا ہوں بیٹا کہ کہیں ایک سبزی فروش کے گندے ہاتھ ایک مِل اونر کے وجود کو داغدار نہ کر دیں۔" احمد نے حیرت سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی گول گول آنکھوں میں الجھاؤ تھا مگر معمہ کیا تھا وہ حل کرنے سے قاصر تھا۔ پھر اس نے ابراہیم اور عائشہ بی بی کو حیران کر دیا۔ اُس نے ابراہیم کے ہاتھ پکڑ کر چوم لیئے اور حیرت زدہ ابراہیم کو کچھ بھی بولنے سے پہلے اس نے وہ ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیئے۔ ابراہیم اور عائشہ بی بی کی آنکھوں میں حیرت و استعجابت رقصاں تھی احمد بولا تو وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ "اِن ہاتھوں کی محنت کی بدولت ہی تو ہم پورے قد کے ساتھ کھڑے ہیں۔ مجھے ابو نے سب کچھ بتایا ہے کہ آپ کی محنت اور پھوپھو کی تربیت نے ہی اُنہیں اس مقام پر کھڑا کیا ہے۔" کتنا فرق تھا اس میں اور باقی افراد میں۔ حالانکہ سبھی ایک ہی کنبہ سے تعلق رکھتے تھے اور ایک ہی چھت تلے رہتے تھے۔

"جگنو کیسا ہے؟ آمنہ کیسی ہے؟ بہت دیر ہو گئی ہے اُنہیں دیکھے ہوئے۔" احمد کی معصوم باتوں نے آمنہ کے والدین کے دِلوں میں کچوکے لگا دیئے تھے۔ وہ سمجھے کہ ایک بار پھر ان کے صبر کا امتحان شروع ہونیوالا ہے۔

"آپ لوگ کبھی آئے ہی نہیں۔ رشتوں ناطوں کی پہچان تو آنے جانے سے ہی قائم رہتی ہے۔" ابراہیم نے کہا تو احمد کے چہرے پر ندامت پھیل گئی۔ وہ شرمندگی سے بولا۔

"پھوپھا جی!...... دراصل کیا ہے کہ...... پہلے یورپ رہا اور پھر آتے ہی بزنس سنبھالنا پڑا۔ میرا خیال ہے کہ کم از کم دس سال تو ہو گئے ہونگے آپ لوگوں کی محبتوں سے دُور۔"؟

"ان دس سالوں میں ہماری طرف سے کوئی کمی نہیں آئی...... بس...... تمہاری ماں نے ہی

بیچ میں دیواریں کھڑی کر دیں۔'' عائشہ بی بی نے کہا تو ابراہیم نے گھور کر انہیں دیکھا جیسے کہ امتل کی بات نہیں کرنا چاہئے تھی۔ عائشہ بی بی کی جھکی نظریں دیکھ کر احمد مسکراتا ہوا بولا۔

''مجھے ماما کی عادت کا پتہ ہے۔ وہ تھوڑی سی ترش ہے......'' ابھی یہ باتیں ہو رہی ہیں تھیں کہ امتل چند عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کے ساتھ واویلا مچاتی ہوئی اُنہی کی طرف آتی دکھائی دی۔

''احمد بیٹا!'' اس نے دُور سے ہی پکار لگائی۔ ''ان چوروں کو جانے نہ دینا۔'' احمد نے گھوم کر امتل کی طرف دیکھا اور پھر ابراہیم اور عائشہ کے پیچھے دور تک خالی کرسیوں کو دیکھا اور پھر حیرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھا جو اپنے جھمگٹے کے ساتھ ان کے سروں پر پہنچ چکی تھی۔

''غریب رشتہ داروں سے تعلق جوڑنے کا مطلب ہے ذلالت اور بدنامی کو خود خریدنا۔'' امتل نے آتے ہی عائشہ پر لفظی حملہ کیا تو وہ دونوں ہی ہکا بکا رہ گئے جبکہ احمد کو اپنی ماں کی چرب زبانی نے مزید شرمندہ کر دیا تھا۔ وہ احتجاجاً بولا۔

''مما!...... آپ کو پتہ ہے آپ کیا کہہ رہی ہیں اور کن کے بارے میں کہہ رہی ہیں؟'' ابراہیم اور عائشہ شرم سے پانی پانی ہو گئے تھے۔ احمد نے طنزیہ تیروں اور لفظی نشتروں کی بارش سے بچانے کیلئے اُن کے سروں پر جو پیار اور خلوص کی چھتری تانی تھی وہ یکدم ہٹ گئی۔ وہ غربت' افلاس اور بھوک کی تیز و سخت اور جھلسا دینے والی دھوپ میں خود کو کھڑا محسوس کر رہے تھے۔ ان کے سروں پر سخت چلچلاتی دھوپ تھی اور دِلوں پر طنز و تکبر کے سنگریزوں کی بارش ہو رہی تھی۔

''اچھی طرح جانتی ہوں کہ کیا کہہ رہی ہوں اور کن کو کہہ رہی ہوں۔'' امتل آنکھیں نچاتے ہوئے بولی اور عائشہ بی بی کی طرف مُڑی۔ ''تمہاری اس پھوپھو نے چندا کا قیمتی نیکلس چُرا لیا ہے۔'' امتل کی زبان سے زہریلا تیر نکلا اور عائشہ بی بی کے دِل و دماغ میں پیوست ہو گیا۔ ابراہیم زمین میں زندہ گڑھ جانے کو جگہ تلاش کرنے لگا اور احمد بے یقینی کی کیفیت میں کبھی ماں اور کبھی پھوپھو کے چہرے کے دیکھنے لگا۔ عورتوں کے جھمگٹے میں رونے کی آواز سنائی دی تو چندا ہجوم سے برآمد ہو گئی وہ رو رو کر عائشہ بی بی کو بار بار چور کہے جا رہی تھی۔ چندا امتل کی بھانجی تھی اور عاصم سے اس کی منگنی ہو چکی تھی۔

''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے......'' عائشہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی امتل نے اپنا غصہ ان پر نکالنا شروع کر دیا۔ ''میں نے منع کیا تھا اختر علی کو...... گند کو چھیڑو گے تو اس کے چھینٹوں سے اپنے آپ کو داغدار کر لو گے...... مگر اس پر بہن کے پیار اور ممتا کا بھوت سوار تھا...... سیدھی

طرح چندا کا نیکلس واپس کر دیں آپا......؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے ملازم لڑکیوں سے کہہ کر تمہاری تلاشی لینی پڑے۔''

''آپ پھوپھو کی توہین کر رہی ہیں......'' احمد نے امتل سے کہا تو وہ عجیب سی نظروں سے بیٹے کی جانب دیکھنے لگی جبکہ عائشہ بی بی اور ابراہیم مجرم بنے امیروں کے ہجوم میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ احمد ان کی طرف مُڑا اور عائشہ کے ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔

''پھوپھو! آپ نے جس طرح ابو کی پرورش اور تربیت کی ہے کوئی ماں بھی اس طرح اپنے بیٹے کی پرورش نہیں کرتی ہوگی۔'' اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں مگر عائشہ کی آنکھیں تو برسات بنی ہوئی تھیں۔ احمد نے ان کے ہاتھ ہونٹوں سے چومتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''میں جب ابو کے ہاتھ پکڑتا ہوں یا پھر کبھی ان کے پاس بیٹھتا ہوں تو مجھے ان کے وجود سے آپ کی مہک محسوس ہوتی ہے۔'' اس بات نے ابراہیم کو بھی رلا دیا۔ ''مجھے ساری زندگی افسوس رہے گا کہ میں نے آپ کی کوکھ سے جنم کیوں نہیں لیا۔''

''احمد!'' امتل چیخ کر بولی۔ ''تم یہ باتیں کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں...... یعنی کہ جس کی کوکھ سے تم نے جنم لیا ہے وہ جھوٹی ہے اور یہ دو ٹکے کی عورت سچی ہے۔'' ''مما...... اس سے آگے مزید کچھ مت کہیئے گا۔ آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ آپ پھوپھو کی توہین کریں۔'' احمد کی گونجدار آواز نے اور بہت سے مہمانوں کو اپنی طرف یا یوں کہیے کہ اس تماشے کی طرف متوجہ کر لیا تھا اب لان میں اچھا خاصا ہجوم جمع ہو گیا تھا جو صرف امیر لوگوں کا طرفدار تھا۔

''اتنا اعتبار ہے اس عورت پر؟'' امتل نے ناگن جیسا پھن پھیلا کر بیٹے سے کہا۔

''آپ میری ماں ہیں...... آپ نے میری پرورش اور تربیت اپنے طور طریقے سے کی ہے...... اس لیئے میں آپ کی محبت کو خون بن کر اپنے جسم کے ہر ریشے میں محسوس کرتا ہوں...... مگر اس دُنیا میں میری آئیڈیل شخصیت میرے ابو ہیں اور ان کی پرورش اور تربیت کا سہرا اس عظیم عورت کے سر ہے۔'' احمد کی بات نے بہت ساری زبانیں بند کروا دی تھیں وہ چندا کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''کتنے کا نیکلس تھا؟'' اس نے روتے ہوئے امتل کی طرف دیکھا جیسے کہ اس سوال کا جواب امتل دے گی۔ ''عاصم نے اسے منگنی کا تحفہ دیا تھا تقریباً ساڑھے تین لاکھ کا تو ہوگا۔'' امتل کی بات سن کر عائشہ اور ابراہیم تو جیتے جی ہی مر گئے تھے۔ اتنا بڑا الزام ان کے سر تھوپ دیا گیا تھا۔ ان کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔

"چندا!" احمد براہِ راست چندا سے مخاطب ہوا تو چندا کی ٹانگیں لرزنے لگیں کیونکہ وہ احمد کے غصے کو اچھی طرح جانتی تھی اور گھر بھر میں کسی کی جرأت نہ تھی کہ احمد کی بات کو جھٹلا دیتا۔ اور احمد رشتے میں اس کا ہونیوالا جیٹھ بھی تھا اس لیئے وہ ٹپٹا کر احمد کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمہارا نیکلس پھوپھو نے ہی لیا ہے۔" ابراہیم احمد کے الفاظ پر غور کرنے لگا کیونکہ اس نے اپنے الفاظ میں یہ نہیں کہا تھا کہ عائشہ نے چرایا ہے۔ چندا کو شاید احمد سے اس سوال کی توقع نہ تھی مگر وہ جواب دینے کیلئے تیار تھی۔ اس نے امتل کی طرف دیکھا اور پھر احمد کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"ہم لوگ چینج کر رہے تھے کہ میرا نیکلس نہ ملنے پر میں نے آنٹی امتل سے پوچھا...... مگر نہ ملنے پر ہر جگہ دیکھا تو بھی نہ ملا تو ہم نے......"

"تو تم لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ غریب لوگ تمہارا نیکلس چرا کر لے گئے ہیں شرم آنی چاہیے تم سب کو...... جانتی ہو یہ کون ہیں...... جانتی ہو۔" وہ دھاڑا تو چندا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جس گھر کے عالیشان کمروں میں تم دندناتے پھر رہے ہو...... یہ سب ان دونوں کی بدولت ہے...... اور ان کے ساتھ جو سلوک مما اور دوسرے لوگوں نے کیا ہے میں وہ بھی دیکھ رہا ہوں۔ اُنہی کمروں میں جانا تو درکنار ان کے دروازوں کے سامنے سے بھی گزرنے کا حکم نہیں ہے انہیں۔" اتنی دیر میں اختر علی بھی ہیں آ گیا اس نے مجمع لگا دیکھا تو حیرت زدہ ہوا مگر پھر احمد کو دیکھ کر آگے بڑھا تو اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا کہ اس کی بہن اور بہنوئی کو تماشا بنایا جا رہا ہے مگر معاملہ کیا تھا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"کیا تمہارا نیکلس اڑ کر اس جگہ ان کی جھولی میں آ گرا تھا؟" احمد کی بات سن کر اختر علی کو جیسے ہوش آ گیا وہ آگے بڑھتا ہوا بولا۔

"کیا معاملہ ہے؟ کیا تماشہ لگا رکھا ہے؟" اس نے عائشہ بی بی اور ابراہیم کی سوجن زدہ آنکھیں دیکھ لی تھیں اور اب بات بھی سمجھ گیا تھا اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو احمد کی آواز سنائی۔ "ابو جی! چندا کا نیکلس اس کے کمرے سے گم ہو گیا ہے اور ان لوگوں کا خیال ہے کہ ان لوگوں یعنی پھوپھو اور پھوپھا جی نے لیا ہے۔" احمد کی بات سن کر مفلسی کے مارے وہ دونوں پھر رونے لگے۔ اختر علی آگے بڑھے اور امتل کے سامنے جا

کر کھڑے ہو گئے اس کا ایک ہاتھ ابھی تک اپنی قمیض کی جیب میں تھا وہ امتل کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کہ پہلی بار دیکھا ہو۔ اس کے چہرے پر کرب اور دُکھ کی لکیریں نمایاں ہونے لگی تھیں۔

"میں نے ان سب سے علیحدہ ہو کر تم سے منت بھرے لہجے میں کہا تھا کہ میری بہن کو تماشہ نہ بنانا۔" اختر علی کا لہجہ تلخ ہوتا جا رہا تھا اور اتنے مہمانوں میں امتل کی بے عزتی امتل کیلئے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔

"مگر تم نے اپنی اوقات دکھا دی۔ یہ جانے بغیر یہ سمجھے بغیر کہ جو لوگ اس جگہ سے اندر نہ گئے ہوں وہ تیسری منزل سے ایک کمرے سے ہار چرا کر لے آئے اور پھر یہاں آ کر بیٹھ گئے۔" اس کے لہجے کی تلخی اور ترش آواز نے ہجوم پر سکوت طاری کر دیا تھا۔ فریحہ اور عاصم بھی پہنچ گئے تھے وہ حیرانگی سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

"پورے گھر میں...... تمام مہمانوں میں تمہیں یہی لوگ ملے تھے الزام لگانے کیلئے...... کیونکہ یہ لوگ تمہارے ہم پلہ نہیں ہیں۔ غریب ہیں اور غربت اس دور کا سب سے بڑا جرم اور اس صدی کا سب سے بڑا گناہ ہے۔"

"اختر علی نے ہار نکال کر امتل کے ہاتھ پر رکھ دیا اس کی حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چندا اور باقی پورے مجمع کا بھی یہی حال تھا جبکہ احمد فخر سے عائشہ بی بی اور ابراہیم کی طرف دیکھ رہا تھا جن کی آنکھوں سے خوشی اور شکرانے کے آنسو نکل رہے تھے۔

"یہ نیکلس تو واپس تمہیں مل گیا ہے امتل بیگم!" اختر علی پھر دھاڑا۔ "مگر اتنے مہمانوں میں ان لوگوں کو تم نے چور کہہ کر میرے خاندان پر جو داغ لگانے کی کوشش کی ہے اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔" اختر علی کا لہجہ اٹل تھا مگر امتل اور دوسرے لوگ نہ سمجھ سکے کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔

"میری ماں جیسی بہن اور باپ جیسے بہنوئی کی تم نے جو توہین کی ہے اس کا ازالہ ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ اس تمام مجمع کے سامنے تم ان دونوں سے معافی مانگو گی۔" بم بن کے گرنے والے الفاظ نے امتل کو پوری طرح راکھ بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک حیرت انگیز بات سن کر ناقابل حد تک پھیلی ہوئی تھیں اُسے اپنی سماعت پر یقین نہ آ رہا تھا کہ جس اختر علی کو اس نے سالوں سے اپنے رعب اور حسن کے دبدبے تلے دبا کر رکھا تھا آج اسی اختر علی نے ان

غریبوں کی وجہ سے اس سے بغاوت کردی ہے۔ وہ بے یقینی کی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ معاملے کو مزید بگڑتا دیکھ کر عاصم آگے بڑھا اور بات کو سلجھانا چاہا۔

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا ابو جی! اب آپ لوگ مما کو تماشہ نہ بنائیں...... ان کی جگہ میں پھوپھو سے سوری کرلیتا ہوں۔"

"غریب کی عزت کوئی عزت نہیں۔" احمد آگے بڑھا اور عاصم سے مخاطب ہوا تو اس کی نظریں بڑے بھائی کے احترام میں جھک گئیں۔ "جب جی چاہا جہاں دِل چاہا ان کی عزت سے کھیلا اور تماشہ لگا کر چل دیئے...... کیا یہی اصول ہے اس ملک کا؟ کیا ہم لوگ کافروں سے بھی گئے گزرے ہیں جو اپنی غلطی ماننے اور معافی مانگنے میں پہل کرتے ہیں...... یہی تو ہماری خرابی اور بدقسمتی ہے کہ ہم لوگوں نے اللہ رسول کی تمام باتوں اور کلام مجید کے تمام الفاظ کو بھلا دیا ہے۔ ہماری تنزلی کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے وہ تمام اصول اور قانون بھلا دیئے ہیں جو صرف ہمارے لیئے ہی بنے تھے مگر کافر لوگ ان قوانین کو اپنا کر ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں۔"

مجمع میں سے چند خواتین کھسکنے لگیں تو احمد کی گونجدار آواز نے اُنہیں رُکنے پر مجبور کر دیا۔

"کوئی نہیں جائیگا!...... جن لوگوں نے ان غریبوں کا تماشہ دیکھ کر تالیاں بجائی تھیں...... اب اس تماشے کا انجام بھی ان سب کے سامنے ہوگا۔" وہ آگے بڑھا اور امتل سے مخاطب ہوا۔

"مما!...... ان لوگوں سے معافی مانگ کر آپ کی عزت کم نہیں ہوگی بلکہ مزید بڑھے گی۔" اس کا انداز اور لہجہ باادب تھا کیونکہ وہ پڑھا لکھا اور باشعور نوجوان تھا اُسے معلوم تھا کہ وہ اپنی ماں کے سامنے کھڑا ہے۔

"اگر میں انکار کردوں تو......؟" امتل کی گردن میں ابھی تک خم نہ آیا تھا اس کا غرور اور تکبر اس کی زبان سے انکار کی صورت میں سانپ بنا کر باہر نکلا تھا مگر اس کے سامنے اس کی اپنی اولاد تھی۔ جس کی پرورش اور تربیت امتل نے اپنے مخصوص انداز سے کی تھی۔

عائشہ اور ابراہیم نے دیکھا کہ معاملہ ان کی وجہ سے بگڑ گیا یہ اختر علی کے گھر کا معاملہ تھا مگر اس کھیل میں مرکزی کردار ادا کرنے والے وہ دونوں ہی تھے ابراہیم نے آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا مگر احمد نے اُنہیں پیار سے منع کر دیا۔ "نہیں پھوپھا جی! آپ کو کچھ بھی نہیں کہنا کیونکہ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ آپ مجرم نہیں ہیں۔" وہ ایک بار پھر امتل کی طرف مڑا اور بولا۔ "آپ کو معلوم

ہونا چاہیئے مما کہ میں آپ کا بیٹا ہوں...... آپ میں پائی جانیوالی تمام ہٹ دھرمی اور ضد مجھ میں کئی گنا بڑھ کر میرے خون میں شامل ہو گئی ہے۔"

"کیا کرو گے تم...... ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ ان دو ٹکے کے لوگوں کی خاطر تم اپنی ماں سے کس طرح اُلجھتے ہو" امتل کی آنکھیں چنگاریاں برسا رہی تھیں مگر احمد کے ہونٹوں پر سنگین مسکراہٹ دیکھ کر اس کا دِل بھی دہل رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ احمد بہت ضدی اور خود سر ہے پتہ نہیں کیا کرے یا پھر کیا کہہ دے۔

"میں یہ شادی نہیں کرونگا۔" احمد کے الفاظ نے امتل کے کانوں میں کئی من سیسہ انڈیل دیا تھا اور مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا اختر علی اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا جبکہ امتل ہونقوں کی طرح بیٹے کا منہ دیکھ رہی تھی۔ جبکہ ابراہیم اور عائشہ بی بی کو افسوس ہونے لگا کہ اتنا محبت کرنیوالا بیٹا ان کی کوکھ سے کیوں پیدا نہیں ہوا جس نے ان کی عزت کی خاطر اپنی ماں سے ٹکر لے لی تھی اس عورت کو ان کے سامنے جھکانے کیلئے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی جبکہ شادی کی تمام تیاری مکمل تھی اور پھر سراج دین صاحب جن کے گھر بارات جانا تھی ان کا بھی کوئی مقام تھا۔ امتل اور اختر کے بھی تعلقات تھے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر امتل نے ان سے معافی نہ مانگی تو احمد واقعی شادی نہیں کرے گا اور معاملہ تمام عمر کیلئے بگڑ جائیگا اور بدنامی ابراہیم اور عائشہ بی بی کے نام لکھی جائیگی۔ بہت سوچ بچار کے بعد ابراہیم آگے بڑھا اور احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

"سرکارِ مدینہ کی حدیث مبارکہ ہے کہ اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی عبادت نہیں ہے کہ کسی مسلمان کا دِل خوش کر دے۔ تم نے اپنی پرخلوص باتوں سے ہمارے دل خوش کر دیئے مگر بیٹا میں تمہیں سوائے دعاؤں کے کچھ بھی نہیں دے سکتا...... کیونکہ غریب ہوں اور اس ملک کی عدالت میں غربت بدترین جرم ہے۔" ابراہیم کا اشارہ امتل کی طرف تھا جبکہ اختر علی سمجھتا تھا ابراہیم کی باتیں حکمت اور دانشمندی سے بھرپور ہوتی ہیں وہ چاہتا تھا کہ ابراہیم مزید کچھ کہے۔

"وہ شخص خدا کے نزدیک بہت ہی معزز ہے جو خدا کی خوشنودی کیلئے اس شخص کو معاف کر دے جس نے اُسے ضرر پہنچایا ہو۔" احمد کا بھی دِل خوش ہو گیا تھا مگر ابراہیم کو امتل کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ حیران ہو گیا تھا۔ "امتل بی بی! میں ان پڑھ اور جاہل سا بندہ ہوں مگر اتنا جانتا ہوں کہ

مکاری اور عیاری کا کمبل اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ اگر اس سے سر ڈھانپیں تو پاؤں ننگے ہو جاتے ہیں اور پاؤں ڈھانپیں تو سر ننگا ہو جاتا ہے اور جب سر ننگا ہو جاتا ہے تو وہ شیطان کا مسکن بن جاتا ہے اور پھر اس شیطان کو بھگانے کیلئے جوتیاں کدھر کدھر سے پڑتی ہیں یہ سمجھ نہیں آتی احتل بی بی۔"

ابراہیم جانے کیلئے مڑا تو عائشہ بی بی آگے بڑھیں اور احتل سے مخاطب ہوئیں جو کہ اس مجمع میں بلکہ اپنے رشتہ داروں میں گھری کھڑی تھی خود کو اب چور اور چغد محسوس کر رہی تھی۔ پہلے اس نے ان دونوں کو تماشہ بنایا ہوا تھا مگر اب وہ خود تماشہ بنی کھڑی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب بوریت ہونے لگی ہے اس کھیل کو ختم ہونا چاہیئے۔

"میری پیشین گوئی آج بھی اپنی جگہ پر اٹل حقیقت کی طرح قائم ہے۔ میں نے کہا تھا کہ تم ایک دن اپنے ہاتھوں کا کشکول لیکر میری چوکھٹ پر آؤ گی...... تو یاد رکھو تم آؤ گی...... کیونکہ وقت آنیوالا ہے۔ میں نے تمہیں تمہارا گناہ اور قصور اس احمد بیٹے اور اپنے بھائی کے صدقے معاف کیا۔" وہ کہہ کر چل پڑیں تو ابراہیم نے بھی ان کا ساتھ دیا مگر احمد اور اختر علی نے آگے بڑھ کر اُنہیں روک لیا۔

"میں بہت نادم ہوں آپا!" اختر علی کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ مگر عائشہ بی بی نے اُسے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔ "اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے...... مگر اب ہمارا ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ ہمیں مت روکو اختر علی ہمیں جانے دو!...... تمہیں بیٹے کی خوشیاں مبارک ہوں۔" نمناک آنکھوں سے اختر علی نے ابراہیم کی طرف دیکھا مگر اس نے سر جھکا کر عائشہ کے فیصلے کی تصدیق کر دی۔

عائشہ نے احمد کو سینے سے لگا کر پیشانی پر بوسہ دیا تو اختر علی روتی ہوئی آنکھوں سے آگے بڑھا۔

"آپا!"؟ عائشہ بی بی کو یاد آ گیا کہ وہ اختر علی کی پیشانی پر بوسہ دیکر اُسے گھر سے رُخصت کیا کرتی تھیں اب بھی اختر علی چاہتا تھا کہ آپا اس کی پیشانی پر بوسہ دیں۔ عائشہ بی بی نے اختر علی کو بھی بوسہ دیا مگر دُور کھڑکی میں کھڑی احتل کی رگیں غصے سے پھول رہی تھیں جبکہ چندا، عاصم اور فریحہ بھی اس منظر کو دیکھ کر دل ہی دِل میں کُڑھ رہے تھے۔

☆☆☆

شہر کے سب سے بڑے بکسٹال پر کھڑے ہوئے کندن کو پندرہ منٹ ہو گئے تھے مگر خلیل احمد تھا کہ آنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ "سالا۔ مسلے تو ایسا کرتا ہے جیسے ہندوستان کا سب سے بڑا عالم ہو۔ مگر وقت کی پابندی نام کی کوئی چیز اس میں ہے ہی نہیں۔" کندن کا پارہ ہائی ہو رہا تھا وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا تقریباً پچیس منٹ بعد خلیل احمد کی پھٹیچر موٹر بائیک آ کر دکان کے باہر رکی تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ تیزی سے اُٹھا اور آ کر خلیل احمد کو کھری کھری سنانے لگا مگر وہ مسکراتا ہوا بولا۔

"کیا کروں یار! نماز کا وقت تھا۔ مسجد میں گیا تو امام صاحب کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے مجھے امامت کرنا پڑی...... سوری یار۔ مجھے دیر ہو گئی۔" کندن کا ہائی پارہ یکدم ڈاؤن ہو گیا۔

"تم نے کچھ خریدا؟" خلیل احمد نے کندن سے پوچھا۔ اب وہ دکان کے اندر داخل ہو گئے تھے اور الماریوں پر لکھے ہوئے مضامین پڑھتے جا رہے تھے۔ خلیل احمد کی رفتار بھی تیز تھی اور نگاہ بھی سامنے والی الماریوں پر مرکوز تھی کیونکہ اس میں "اسلامی کتب" کا بورڈ لگا ہوا تھا اور خلیل احمد اکثر یہاں آتا رہتا تھا۔

"میں کیا خریدوں گا؟ مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ اسلام کیا ہے۔ اور اس کے بارے میں کون سا لٹریچر خریدنا ہے؟" کندن نے اپنی بے بسی ظاہر کی تو خلیل احمد سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ متعلقہ الماری کے پاس پہنچ گئے تھے۔ کندن نے غور کیا تو اپنے اردگرد کتب کے وسیع ذخیرے کو پا کر اُسے سمجھ نہ آیا کہ مسلمانوں نے مذہب اسلام پر اتنی زیادہ کتب تحریر کر دی ہیں۔ وہ دکان کیا تھی اچھی اور پاکیزہ کتب کا وسیع سمندر تھا۔

خلیل احمد نے اُسے اسلام کے متعلق کافی ساری کتابیں خرید کر دے دیں۔ بل ظاہر ہے کندن نے ہی دینا تھا اور پھر ان کتب کو بھی خلیل احمد نے اپنے گھر ہی رکھنا تھا کیونکہ کندن کے گھر ان کتب کا مطلب تھا دونوں مذاہب کے درمیان جنگ اور کندن چوپڑہ کے گھر اس جنگ کی آماجگاہ۔

ہوا یوں تھا کہ خلیل احمد کے ساتھ گھومنے اور اس کی باتیں سننے کے بعد کندن کے دِل میں [illegible] روشنی کی کرن پھوٹی تھی۔ جو بار بار اس بات کی طرف اُسے مائل کر رہی تھی کہ تم اپنا مذہب بے شک نہ بدلو مگر ایک بار صرف ایک بار اسلام کا مطالعہ کر لو۔ اس نے اپنے خیالات سے اپنے گھر والوں کو بھی بے خبر رکھا تھا بس خلیل احمد کو بتایا تھا جو کہ اس کیلئے بہت بڑی خبر تھی اس نے کندن کی

دل سے مدد کرنے کی ٹھانی تھی۔ اب کتب جس میں سرفہرست قرآن کریم تھا جو کہ اعلیٰ پائے کے عالم صاحب کا ترجمہ کیا ہوا تھا جس میں قرآن کریم کی تمام باتوں کو بالکل آسان اردو میں واضح کیا گیا تھا۔ احادیث وسنتوں پر مبنی کتب بھی ان کی فہرست میں شامل تھیں۔ کتب خرید کر خلیل احمد کے گھر رکھ دی گئیں تھیں اور قرآن کریم ایک خوبصورت گتے کے ڈبے میں بند کر کے کندن کو دے دیا گیا تھا۔ جسے اس نے سب سے چھپا کر اپنے کمرے میں رکھنا تھا۔ خلیل احمد نے اُسے سمجھا دیا تھا کہ مسلمان قرآن کریم کی حرمت اور عزت پر کوئی بھی حرف یا آنچ برداشت نہیں کرتے لہٰذا احتیاط کرنا کندن پڑھا لکھا اور باشعور تھا وہ خلیل احمد کی باتیں غور سے سنتا تھا اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

☆☆☆

آج تیسرا دن تھا کندن نے قرآن کریم کا باترجمہ مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ خلیل احمد نے اُسے وضو کرنے اور غسل کرنے کی تمام سنتوں پر مبنی کتب بھی لے دی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ جب بھی قرآن مجید پڑھنا چاہتا تو وضو کر لیتا تھا اب بھی وہ باوضو ہو کر قرآن کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا کہ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اس نے احتیاط سے قرآنِ کریم کو ایک الماری میں چھپایا اور دروازہ کھول دیا سامنے پوجا بھابی کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی۔ بھابی اندر داخل ہو گئیں تو کندن نے دروازہ کھلا رہنے دیا۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ بھابی اس کے کمرے میں آئیں اور زیادہ دیر ٹھہریں کیونکہ سبھی لوگ اپنی اپنی جگہ پر اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کیلئے آزاد تھے۔

''کندن!'' پوجا نے بات کا آغاز کیا وہ کندن کے چہرے کا بغور جائزہ بھی لے رہی تھی یا پھر وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کی کہی جانے والی بات کا کندن کے چہرے کے تاثرات سے پتہ چلانا ہوگا کندن بھابی کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

''تمہیں کاجل کیسی لگتی ہے؟'' کندن بھابی کے منہ سے اس کی بہن کا نام سن کر حیران رہ گیا تھا۔ یہ کوئی حیران کن بات نہ تھی کاجل کا ذکر پہلے بھی کئی بار اس گھر میں ہو چکا تھا اور وہ بھی کئی کئی راتیں یہاں آ کر رہ جاتی تھی۔ کندن کا اس کے ساتھ کھلا مذاق بھی تھا اور اچھی دوستی بھی۔ مگر بھابی کے اندازِ تخاطب سے کندن حیران ہوا تھا۔

''اچھی ہے۔'' کندن کا جواب سادگی سے بھرپور تھا۔ اب وہ بھابی کے چہرے کی طرف

دیکھ رہا تھا۔ ''تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔'' پوجا بھابی اب کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ ''جس انداز میں میں کاجل کا ذکر کر رہی ہوں تم اس انداز میں جواب نہیں دے پائے۔'' بھابی کے لبوں پر شرارتی مسکان دیکھ کر کندن سنبھل گیا۔ ''میں تو اتنا جانتا ہوں کہ وہ آپ کی بہن ہے جس طرح آپ اچھی اور پیاری ہیں وہ بھی انہی خصلتوں کی مالک ہے۔'' کندن بدستور کھڑا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ بھابی چلی جائے تا کہ وہ اپنا کام کر سکے۔ ''مگر ایک بات اس میں اور آپ میں مختلف ہے۔ وہ یہ کہ کاجل میری اچھی دوست ہے۔''

''صرف دوست ہے یا اس سے آگے بھی کوئی بات ہے؟'' انداز بدستور شرارتی تھا۔

''فی الحال تو دوستی ہی ہے۔ آپ کھل کر کہیں کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' وہ اس موضوع سے بوریت محسوس کرنے لگا تھا اس لیئے سیدھا بات پر آ گیا۔

''تمہارے بھیا اور ماما جی کی خواہش ہے کہ کاجل اس گھر میں چھوٹی بہو کے روپ میں آئے۔'' وہ بھابی کی صاف گوئی پر ان کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ ''انہوں نے تمہارے خیالات معلوم کرنے کیلئے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔'' کندن سمجھدار تھا وہ اس معاملے کو اچھی طرح ہینڈل کرنے چاہتا تھا کیونکہ گھر میں بھابی کی بہت زیادہ قدر اور اہمیت تھی اور پھر یہ ماما اور بھیا کی خواہش بھی تھی۔ مگر وہ ابھی اپنی پڑھائی مکمل کرنا چاہتا تھا اور پھر ابھی ابھی تو انہوں نے بہت بڑی شادی کی تھی۔ لوگ بہت سی باتیں کریں گے وہ ان بکھیڑوں میں پڑنے سے پہلے بہت سا پڑھنا چاہتا تھا۔ اس لیئے اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بھابی کو مناسب جواب دیا۔

''بھابی میں آپ کی مرضی اور پسند سے ہی شادی کروں گا مگر فی الحال میری تعلیم کا مسئلہ ہے اور پھر میں کاجل سے مل کر اس معاملے پر بھی ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ زندگی بھر کے معاملات ہوتے ہیں۔'' پوجا اس کی بات سن کر کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔ تم نے میرا مان رکھ لیا ہے۔'' وہ کندن کے کندھے پر ہاتھ رکھتی ہوئی بولی۔ ''اچھی طرح سوچ لو...... اس معاملے پر کاجل کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ کندن کمرے میں اکیلا کھڑا رہ گیا تھا۔ دُور سے اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو اُسے چونکنا پڑا کیونکہ وہ باوضو تھا اور پوجا بھابی کے آنے سے پہلے قرآن کریم کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا اس نے دروازے کی کنڈی لگائی اور الماری سے قرآن کریم کھول کر اُسے باادب طریقے سے پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ جوں جوں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھتا جاتا اس کے دل کی دُنیا سے اندھیرا

دور ہوتا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے بہت واضح طور پر اپنی اس کتاب میں مسلمانوں کیلئے ہی نہیں بلکہ تمام جہانوں کیلئے زندگی گزارنے کے جامع اصول وضع کر دیئے تھے۔ اللہ کے سوا دوسروں کو معبود سمجھ کر گمراہی اور اندھیروں میں کھو کر زندگی گزارنے والے یقیناً نقصان اور گھاٹے میں ہیں اور رہیں گے۔ مگر زندگی کے آخری سانس تک بھی سچے دل سے رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے کو اللہ کی رحمت اپنے دامن میں سمو لیتی ہے۔ اس نے انسانوں کو بخشنے کے بہت سے بہانے اور جواز اس کتاب میں پیش کیئے تھے ہر طرف اس کی واحدانیت اور رحمتوں کا پرچار تھا مگر اس کے منکروں اور کافروں کیلئے دردناک عذاب کی نوید بھی سنائی گئی تھی۔ کندن پڑھا لکھا تھا وہ قرآن کریم کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ اور اس کے اجداد اللہ تعالیٰ کے سوا مٹی اور گارے سے بنے ہوں بتوں کو پوجتے ہیں جنہیں اُنہوں نے خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنایا ہوا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیئے جہنم کی آگ صدیوں سے دہکا دی گئی تھی۔ یہ آگ ان لوگوں کا مقدر تھی جو رب کی واحدانیت میں کسی اور معبود کو شریک عبادت کرتے تھے۔ قرآن کریم میں جہنم اور عذاب کی تفصیل پڑھ کر اس کی روح کانپ کر رہ گئی۔ وہ ایک بار تو لرز کر رہ گیا اس نے قرآن کریم کو احتیاط سے بند کیا اور واضح طور پر اپنی پیشانی پر پسینے کے قطرے محسوس کیئے۔

اس نے قرآن کریم کو کتنی ہی ساعتوں تک اپنے سینے سے لگائے رکھا اس کی بے ترتیب دھڑکنوں کو سکون ملنے لگا۔ اس کی ناہموار سانسیں اپنی روٹین پر آنے لگیں اس کی آنکھوں نے ٹھنڈک محسوس کی اور سینہ جو کہ کفر اور شرک کی آگ سے جل رہا تھا یکدم ٹھنڈا ہو گیا اس نے سکون کی سانس خارج کرتے ہوئے قرآن کریم کو الماری میں رکھا اور تالا لگا کر چابی بیڈ کے میٹرس تلے رکھ دی۔ وہ بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے سینے سے پرسکون اور مطمئن سانسیں خارج کرنے لگا۔

☆☆☆

''میں پہلے ہی شادی شدہ ہوں۔ مجھے ہاتھ مت لگانا۔'' حجلہ عروسی میں دُلہن کے منہ سے یہ الفاظ سن کر احمد کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں کبھی دُلہن آسیہ کا چہرہ دیکھتا تھا اور کبھی ہزاروں روپوں سے سجے ہوئے اس کمرے کو جو کہ خاص اس رات اور ان دُلہا دلہن کیلئے سجایا گیا تھا۔

''مذاق کر رہی ہو۔؟'' احمد کو اپنی ہی آواز کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مگر دوسرے لمحے اس کی حیرت مزید دو چند ہو گئی جب آسیہ نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر احمد کی طرف بڑھا دیا۔ احمد نے کاغذ کھول کر پڑھا تو گزشتہ سات ماہ پہلے آسیہ کا نکاح کسی عامر نامی شخص سے ہو چکا تھا اس کی سمجھ نے کام کیا اور نکاح نامہ لیکر فوراً باہر نکل گیا اس کے ماتھے پر چمکنے والے پسینے کے قطرے اس کی دلی ترجمانی کر رہے تھے۔

پل بھر میں یہ خبر آگ کی طرح پورے محل میں پھیل گئی تھی۔ بہت سے مہمان اور احتل کے رشتہ دار ابھی سونے کی تیاری کر رہے تھے مگر عائشہ اور ابراہیم کی ذلت کے بعد ان کو ایک اور ڈرامہ دیکھنے کو مل گیا تھا۔ اختر علی اور احمد مہمانوں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے تھے جبکہ احتل نے الگ ہی پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے واویلا مچانے سے عجیب ہی صورت حال ہو گئی تھی۔ اختر علی نے احمد سے مشورہ کے بعد وزیر موصوف کو فون کر دیا تھا وہ لوگ بھی پہنچنے والے تھے اور تماشہ مزید قائم رہنے کی امید ہو چلی تھی۔

احتل آسیہ کو اس کے کمرے سے باہر نکال لائی تھی چند اسمیت سبھی نوجوان کنواری لڑکیاں اس کو دیکھ کر تھو تھو کر رہی تھیں مگر آسیہ کے چہرے پر ذرا برابر بھی ندامت نہ تھی۔ وہ پرسکون انداز میں اپنا تماشہ دیکھنے والوں کو دیکھ رہی تھی۔

''اری بے غیرت! ہماری عزت کا ناس کر دیا تم نے۔'' احتل اب باقاعدہ آسیہ کو کوسنے لگی تھی۔ اس کے منہ سے بددُعاؤں کا طوفان شور کی صورت میں سبھی کو برا لگ رہا تھا مگر اس لمحہ وہ مظلوم تھی اس کے ساتھ بہت ہی زیادتی ہوئی تھی۔ ''پہلے ہی کسی کے ساتھ منہ کالا کر چکی ہو تو پھر میرے پھول سے بیٹے کے مستقبل سے کھیلنے کی جرات کیسی کی؟ میں کہتی ہوں رنڈی۔ دھوکے باز کس جنم کا بدلا لیا ہے تم نے ہم سے۔'' احتل اپنے غصے کو قابو نہ رکھ سکی اور آگے بڑھ کر دلہن بنی آسیہ کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو اس نے احتل کا جوڑا پکڑ لیا اور بولی۔

''احتل بی بی! اپنی اوقات میں رہو۔'' آسیہ کے یہ الفاظ بم بن کر تمام مکینوں پر گرے تھے اور ابھی پل بھر میں پتھر کے مجسموں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اس پر بھی آسیہ خاموش نہ رہی اس نے پھر تماشے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے اپنا نیا بیان جاری کیا۔

''احتل بی بی! میرے گھر میں تم جیسی نوکرانیاں آگے پیچھے پھرتی ہیں۔ میں اب تک خاموشی سے سب کچھ اس لیئے سہہ رہی تھی کہ میں اپنے بابا جان کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر اب اگر تم

نے زبان سے ایک بھی لفظ نکالا تو مجھ سے بُرا نہ ہوگا۔" آسیہ کی شہادت والی انگلی احتل کے دل میں گڑھ گئی تھی۔ اس کی زبان کو چپ لگ گئی تھی وہ ہونقوں کی طرح کبھی آسیہ کو اور کبھی تمام رشتہ داروں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اُسے یکدم ہوش آیا وہ اختر علی سے مخاطب ہوئی۔

"اس کا بے غیرت باپ جب آجائے اسے اس کے کھونٹے سے باندھ کر میرے گھر کو اس کی داغدار شخصیت سے صاف کر دینا اختر علی!" وہ یہ کہہ کر ایک طرف بڑھ گئی تو تمام لوگوں پر سکوت چھا گیا۔ آسیہ ایک صوفے پر بیٹھ چکی تھی جبکہ احمد اور اختر علی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے بیت جانے والے واقعات اور آج کے خوشیوں بھرے دِن کو یاد کر رہے تھے۔

لاکھوں روپے لگا کر اختر علی نے بیٹے کی شادی طے کی تھی۔ کئی دِن پہلے ہی گھر میں لائٹنگ ہو گئی تھی اور مہمانوں نے آنا شروع کر دیا تھا۔ احمد کو مبارکباد دینے والے دوستوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ بارات والے دِن یعنی آج کے دِن وہ شہزادہ لگ رہا تھا مگر تقدیر نے اس سے کسی طرح کا انتقام لیا تھا۔

اختر علی کے ذہن میں ایک ہی خیال بار بار بجلی بن کر کوندتا تھا کہ احتل نے بھرے گھر میں عائشہ آپا اور ابراہیم کو تماشہ بنایا تھا مگر قسمت نے اُسے اپنے ہی گھر میں اپنے ہی فیصلے پر پچھتانے کیلئے ایک نیا ڈرامہ لگا دیا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے آپا عائشہ کی آنسوؤں بھری آنکھیں بار بار یہی بات کہہ رہی تھیں۔

"دعا کرو اختر علی کہ شام سے پہلے پہلے میری آمنہ مر جائے.....کوئی ماں خوشی خوشی اپنی بیٹی کی خوشی یا حسرتوں کے مزار پر چراغاں نہیں کرتی۔" اختر علی کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کے گال کو تر کر کے وزیر صاحب چند معززین علاقہ کے ساتھ آئے تھے اُنہوں نے اپنی بیٹی سے معاملہ پوچھا تو آسیہ نے صاف بتا دیا کہ وہ پہلے سے ہی نکاح کر چکی ہے۔

"تو پھر میری عزت کا جنازہ نکالنے کیلئے اتنی دھوم دھام کا اہتمام کیوں کیا تھا آسیہ؟" وزیر صاحب نے آسیہ سے کہا تو وہ ڈھٹائی سے باپ کو جواب دینے لگی۔

"میں نے گزشتہ برس آپ کو اور مما کو بتا دیا تھا کہ میں عامر کو پسند کرتی ہوں مگر آپ نے میری اور عامر کی محبت کو اپنی وزارت اور دولت کے پلڑے میں تول کر اُسے ٹھکرا دیا تھا۔ میں نے تبھی فیصلہ کیا تھا کہ گھر والوں سے چھپ کر چوری چوری اپنی محبت کو پروان چڑھاؤں گی۔"

"مگر ان لوگوں کا کیا قصور تھا؟ تم نکاح سے پہلے ہی بتا دیتی۔ میں اب برادری کو کیا منہ

دکھاؤں گا؟" بے بس باپ نے بیٹی سے دل برداشتہ لہجے میں کئی سوال کیئے۔

"میں گھر سے بھاگ کر اپنی جائیداد اور دولت کا حصہ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی اسی لیئے خاموش رہی۔ مگر میرا جسم اور میرا پیار صرف میرے عامر کی امانت ہے......"

چٹاخ۔ تڑاخ...... دو تھپڑوں نے ہی آسیہ کا منہ گھما دیا تھا۔ وزیر صاحب انتہائی نادم ہو کر اختر علی کی طرف مڑے اور اس کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا۔

"اختر علی! میں نے تم سے دوستی کی بنیاد پر رشتہ داری پکی کرنے کا سوچا تھا مگر آج ایک بار پھر تقدیر نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم جیسے سیاستدان کتنے بھی مخلص ہو جائیں مگر برائی ہمارا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ اس ناخلف اولاد کی وجہ سے میں تمہارا مجرم ہوں مجھے معاف کر دو اختر علی!" وہ بری طرح رو رہے تھے مگر اختر علی مجسمہ بن کر سب کو دیکھے جا رہا تھا۔

"میں نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں اور ان کی سزا کا طلبگار بھی ہوں۔ مگر مجھے اس صورت میں اتنی بھیانک سزا ملے گی میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔" وزیر صاحب کی آنسوں سے رندھی ہوئی آواز نے سب کے دِلوں میں ان کے لیئے ہمدردی اور آسیہ کیلئے نفرت بھر دی تھی۔

"اپنی اس بیٹی کو لے جاؤ جو میری عزت اور کاروباری ساکھ کو ناقابل تلافی نقصان کا سبب بنی ہے۔" اختر علی نے بہت دیر بعد زبان کھولی تھی وہ وزیر صاحب کو اوپر اُٹھاتا ہوا بولا۔ "تقدیر نے تمہیں ایسی اولاد دے کر تم سے یقیناً کوئی بھیانک انتقام لیا ہوگا مگر تمہاری اولاد نے میری خوشیاں چھین کر اچھا نہیں کیا میں تمہیں بددُعا نہیں دے سکتا...... مگر معاف کرنا...... معافی بھی نہیں دے سکتا۔" اختر علی یہ کہہ کر بوجھل قدموں سے ایک طرف چل پڑا جبکہ احمد بھی باپ کے پیچھے ہی چل پڑا۔

وزیر صاحب نے نفرت اور غصے کی شدت سے آسیہ کی طرف دیکھا جو پرسکون کھڑی تھی۔ وہ آج اس بیٹی کی وجہ سے اس گھر میں تماشہ بن گئے تھے۔ اسمبلی میں گونجدار آواز سے مخالفین کی نیندیں اور ہوش اڑانے والے وزیر صاحب بے بسی اور ندامت کی زندہ تصویر بن کر تماش بینوں کو دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

تقدیر اس پر مہربان ہوگئی تھی۔ ایک بہت بڑی گارمنٹس فیکٹری میں اس کی جاب ہوگئی تھی۔ روزانہ اخبارات میں "ضرورت ہے" کے اشتہارات دیکھ دیکھ کر ان جگہوں پر اپنا سی وی بھیجنا اور

پھر ایک انٹرویو اور اسکے بعد جان لیوا انتظار اور پھر انکار یا جواب ہی نہ آنا۔ان سب باتوں نے آمنہ کو چڑ چڑا کر دیا تھا وہ بہت بدظن ہو گئی تھی اب آخری بار اسے گارمنٹس فیکٹری سے انٹرویو کا بلاوہ آیا تھا عائشہ بی بی نے اُسے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا وہ متعلقہ جگہ پہنچی تو اس کے ہوش گم ہو گئے تھے بہت بڑی عمارت جس کے سامنے سے وہ کئی بار گزری تھی مگر ہمیشہ ہی سرسری انداز میں نگاہ ڈال کر آگے بڑھ جاتی تھی آج وہ اس عمارت میں داخل ہو کر اپنی قسمت سنوارنے کی آخری کوشش کرنے والی تھی۔"علی گارمنٹس" کا قیمتی بورڈ اس کے چلانے والوں کی اچھی کاروباری ساکھ کا ثبوت تھا۔وہ ایک نظر بورڈ پر ڈالتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

ویٹنگ روم میں چند لڑکیاں اور لڑکے بھی موجود تھے جو اس کی طرح انٹرویو کیلئے کال کیئے گئے تھے ہر امیدوار اپنی اپنی جگہ پر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا مگر آمنہ پر سکون انداز میں بیٹھی تھی۔اس سے پہلے جانیوالی دو لڑکیاں منہ لٹکائے واپس جا چکی تھیں۔باوردی ملازم نے آکر اس کا نام پکارا تو وہ اپنا ہینڈ بیگ اور ضروری کاغذات کی فائل لیکر ملازم کی سربراہی میں چل پڑی۔وہ اس عمارت کی صفائی اور میٹریل کی اعلیٰ کوالٹی سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ہر چیز ہر شخص اپنی جگہ پر مکمل فٹ نظر آرہا تھا۔وہ بہت سے اداروں اور فیکٹریوں میں گئی تھی مگر اس طرح کا انتظام اس نے کہیں نہ دیکھا تھا۔

ملازم ایک دروازے کے سامنے جا کر رک گیا جس پر جنرل منیجر کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔پہلے تو وہ حیران ہوئی کہ جنرل منیجر کو کیا ضرورت ہے انٹرویو کرنے کی..... مگر اس نے اپنی حیرت پر جلد ہی قابو پا لیا کیونکہ دروازہ کھل چکا تھا وہ دبیز قالین کو اپنے پاؤں تلے روندتی ہوئی دائیں ہاتھ مڑ گئی۔ایلومینیم سے بنا ہوا فریم براؤن رنگ کے شیشے دوسرے کمرے کا ماحول باہر سے دکھانے سے قاصر تھے۔وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو کلیوں کی خوشبو نے اُسے خوش آمدید کہا ایک لمحہ تو وہ مسحور کن خوشبو اس کے دل و دماغ میں رچ بس گئی۔بالکل سامنے بڑے سے ٹیبل کے گرد سیاہ فوم کی کرسی پر مردانہ وجاہت کا اعلیٰ نمونہ شخصیت جنرل منیجر صاحب براجمان تھے۔آمنہ اس کی شخصیت میں ہی کھو جاتی اگر منیجر صاحب کی آواز اُسے اپنی طرف متوجہ نہ کرتی۔

"ویل کم ٹو علی گارمنٹس..... مس آمنہ!" آواز میں مٹھاس اور لہجے کا ٹھہراؤ نے آمنہ کو بہت متاثر کیا تھا۔"ہیواے سیٹ پلیز" "Have A Seat Pleas"

"تھینکیو سر!" وہ کہتی ہوئی اکلوتی کرسی پر بیٹھ گئی۔اس کی نظر منیجر صاحب کے ٹیبل پر رکھی

ہوئی نام کی تختی پر گئی۔"احمد" تو ان صاحب کا نام احمد ہے آمنہ نے سوچا اور ایک نظر اُٹھا کر احمد کی دل آویز شخصیت کا جائزہ لینے لگی خوبصورت چہرے پر خون کی سُرخی۔بھرے بھرے سُرخ ہونٹ۔کلین شیو چہرے پر مکمل جچی ہوئی خوبصورت ناک اور بڑی بڑی آنکھیں درمیان میں گھرے سیاہ بالوں کی مانگ کو طریقے سے نکالا گیا تھا۔

"اس کام میں آپ کا کتنا تجربہ ہے؟" احمد کی آواز نے آمنہ کے کانوں میں رس گھولا تو وہ پوری توجہ سے اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"تجربہ کام کرنے سے ہوتا ہے سر! آپ جاب دیں گے تو تجربہ ہو گا۔" آمنہ نے سلجھا ہوا جواب دیا۔"مگر ہماری ریکوائرمنٹ تو تین سالہ تجربہ ہے۔"

"جس شخص کو تین سال کا تجربہ ہو گا وہ اپنی جاب چھوڑ کر آپ کو جوائن کیوں کرے گا کیونکہ تجربہ کار تو پہلے ہی جاب کر رہا ہے اور اچھی سیلری بھی لے رہا ہو۔" احمد اس کا جواب سن کر لبوں پر مسکان سجاتا ہوا بولا۔"لگتا ہے زندگی کی حقیقتوں کا آپ کو اچھی طرح ادراک ہے۔"

"آج کل تو زندگی حقیقت نہیں بلکہ ایک خواب سمجھ کر گزارنا پڑتی ہے۔ہاں البتہ مجھے انٹرویوز کا خاصا تجربہ ہے۔اتنی ڈگریاں اور پھر اعلیٰ تعلیم کے مزید حصول نے ہمیں یہ بھلا دیا ہے کہ تعلیم اور ہنر کی اس ملک میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"مس آمنہ! میں آپ کی تعلیمی قابلیت سے بہت متاثر ہوا ہوں۔مگر ہماری ریکوائرمنٹ تین سالہ تجربہ ہے۔آئی ایم سوری!" احمد کے منہ سے یہ الفاظ سن کر آمنہ اداس ہونے کی بجائے مسکرانے لگی تو احمد حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔اس کی نظروں میں استفسار دیکھ کر آمنہ نے اپنی فائل اُٹھائی اور اُٹھتی ہوئی بولی۔"آپ کو سوری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے سر! میں ذہنی طور پر اس جواب کیلئے تیار تھی۔کیونکہ اس ملک کا المیہ یہ ہے کہ تجربہ حاصل کرنے کیلئے کام نہیں کرنے دیا جاتا اور پھر ملازمت کے الفاظ کو سفارش اور رشوت کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے۔تھینکیو سر!" اس کی ایپلی کیشن (Application) فائل احمد کے پاس ہی رہ گئی جبکہ وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی دفتر سے نکل گئی۔

احمد حیرانگی سے ابھی تک اس دروازے کو دیکھے جا رہا تھا جس سے وہ گزر کر گئی تھی اس کی بات نے احمد کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔یہ وہی احمد تھا جو اختر علی کا بیٹا اور آمنہ کا کزن تھا مگر اس لمحہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو پہچان نہ پائے تھے کیونکہ احمد دس سال کا عرصہ یورپ میں گزار آیا تھا

اور اس سے پہلے کا عرصہ بھی وہ پھوپھو اور ان کے خاندان سے دور ہی رہا تھا۔ اس نے آمنہ کو نہ پہچانا تھا کیونکہ اس نے جب آمنہ کو آخری بار دیکھا تھا تقریباً پندرہ برس گزر گئے ہونگے۔

آمنہ بھی اپنے کزن احمد کو نہ پہچان پائی تھی کیونکہ ان کی پہچان کی راہ میں وقت اور فاصلوں کی دیوار حائل تھی۔ اس نے گھر پہنچ کر فائل میز پر پٹخ دی اور ہمیشہ کی طرح عائشہ بی بی نے اُسے پانی کا گلاس پیش کیا وہ دونوں ماں بیٹی اس روٹین کی عادی ہو چکی تھیں۔ عائشہ بی بی آمنہ کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولیں۔

''اس باس کے بارے میں کیا تاثرات ہیں؟'' اُنہوں نے ہمیشہ کی طرح پوچھا کیونکہ آمنہ جب ناکام لوٹ کر آتی تھی تو انٹرویو لینے والوں کے بارے میں یہ دِلچسپ تاثرات بیان کرتی تھی۔

''شکل وصورت تو اچھی تھی مگر......'' آمنہ نے احمد کی شخصیت اور دلچسپ انٹرویو پر تبصرہ شروع کیا۔

''مگر کیا؟''

''وہی گھسے پٹے سوال۔ تجربہ کتنا ہے۔ اس سے پہلے کہاں کہاں کام کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔''

آمنہ کے انداز بیان سے بے زاری جھلکتی دیکھ کر عائشہ بی بی مسکرانے لگیں۔ ''اچھا تم منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہارے لیئے کھانا لے کر آتی ہوں۔ آج میں نے اچار گوشت پکایا ہے۔''

''کیا بات ہے اماں! آج تو طبیعت خوش کر دی آپ نے۔ اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ بس جلدی سے کھانا لاؤ۔'' وہ اُٹھ کر صحن کی جانب بڑھ گئی جہاں لوہے کے حمام سے ہاتھ دھوتے تھے۔

''میرا پیا گھر آیا...... میرا پیا گھر آیا'' جگنو گھر میں داخل ہوا وہ گانا گانے والے انداز میں جھومتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی دیدنی تھی۔ وہ جھوم رہا تھا اور ساتھ ساتھ گاتا بھی جا رہا تھا۔ آمنہ اور عائشہ بی بی کیلئے اس کا یہ انداز نیا نہ تھا مگر آج اس کی آواز میں کچھ نیا پن ضرور تھا۔

آمنہ نے اُسے جھومتے ہوئے روکا اور ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''آمنہ باجی!'' جگنو اپنے مخصوص انداز میں دِل کی خوشی بیان کرنے لگا۔ وہ اپنے ٹیڑھے ہاتھ کو نچا نچا کر بتانے لگا۔ ''وہ جو...... حافظ جی ہیں نا...... وہ...... نورولی مزار والے......'' آمنہ کے چہرے پر حیرت دیکھ کر وہ عورتوں کے انداز میں ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

''ہائے ہائے۔ میری قسمت ہی خراب ہے ان پڑھ لوگوں میں پھنس گیا ہوں۔'' آمنہ اور

عائشہ بی بی اس کے اس انداز پر بری طرح مسکرانے لگیں تو وہ اور بھی تپ گیا۔ ''بات کی سمجھ ہوتی نہیں ہے اور پوچھنا شروع کر دیتی ہو۔ جگنو کیا ہوا۔'' آمنہ مسکراتی ہوئی بولی۔

''اچھا اچھا۔ سوری۔ بتاؤ...... آج اتنے خوش کیوں ہو؟''

''پہلے کانوں کو ہاتھ لگا کر سوری بولو'' وہ ناراض لگتا تھا۔ آمنہ نے کانوں کو ہاتھ لگا سوری کہا تو وہ سیکنڈوں میں مان گیا اور پھر وہی پہلے والے انداز میں گویا ہوا۔

''میرا پیا گھر آیا...... وہ جو حافظ جی ہیں نا...... اُنہوں نے کہا ہے...... آمنہ باجی کیلئے بہت بڑے گھر سے اچھا رشتہ آئے گا' عائشہ بی بی مسکرا رہ گئیں جبکہ آمنہ جھلے جگنو کو مزید ستانے لگی۔

''اچھا...... اور کیا کہا ہے حافظ جی نے۔'' اس کے الفاظ میں شرارت تھی مگر جگنو اس گہرائی کو نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس لیئے وہ مزے مزے سے بتانے لگا۔

''وہ کہتے ہیں آمنہ باجی کو اچھی نوکری بھی مل جائیگی۔ تم سب کے حالات اچھے ہوں گے...... مگر......'' وہ پریشان ہو گیا اس کے چہرے پر قوس قزح کی جگہ فکر اور اداسی نے لے لی۔

اتنی دیر میں عائشہ بی بی پلیٹوں میں سالن نکال چکی تھی وہ بہن بھائی کی گفتگو سے لطف اٹھا رہی تھیں مگر جگنو کی ''مگر'' پر وہ بھی جگنو کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

''مگر کیا......؟...... یہ سسپنس نہ ڈالا کرو۔'' آمنہ چڑ سی گئی۔

''وہ کیا ہوتا ہے؟'' جگنو کی سادگی پر وہ مسکرانے لگی۔

''اتنے پڑھے لکھے ہو۔ سسپنس کا نہیں پتہ؟'' جگنو نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اچھا بتاؤ...... حافظ جی نے اور کیا کہا تھا؟'' اس بار عائشہ بی بی تجسس سے بولیں تو وہ ماں کے چہرے کی طرف پیار سے دیکھتا ہوا بولا۔

''اُنہوں نے کہا کہ پہلے پریشانیاں اور دُکھ اُٹھانے پڑیں گے۔'' اس کے منہ سے بات سن کر عائشہ بی بی دِل مسوس کر رہ گئیں کیونکہ اختر علی نے انہیں اپنے گھر احمد کی شادی پر مدعو کر کے ان کی پریشانی میں اضافہ کر دیا تھا۔ اور پھر وہاں جو اختر اور چندا نے تماشہ لگایا تھا وہ بھی ان کیلئے دُکھ کا باعث بنا تھا۔ حافظ جی کی کہی ہوئی بہت سی باتیں آمنہ اور عائشہ بی بی کے علاوہ اس آبادی کے لوگوں نے بھی پوری ہوئی دیکھی تھیں۔ اب نجانے اُنہوں نے کس پریشانی اور دُکھ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اُنہوں نے ان خیالات کو ذہن سے فی الوقت جھٹک کر کھانا کھانا شروع کر دیا۔

☆☆☆

گھر کے سبھی لوگ اس وقت پوجاپاٹ میں مصروف تھے۔ چوپڑہ نے اپنے گھر کے صحن میں بھگوان کی بہت بڑی مورتی سجائی ہوئی تھی۔ یہ پوجا کا خصوصی تہوار تھا سبھی افراد میں کندن بھی موجود تھا مگر سب سے الگ تھلگ نجانے کیوں اس کا من ان سب باتوں اور ڈھونگی چیزوں سے اچاٹ ہوگیا تھا۔ اس نے قرآن حکیم کو بغور پڑھ لیا تھا سمجھ لیا تھا اب اس نے جان بھی لیا تھا کہ اللہ ایک ہے کوئی اس کا ہمسر یا شریک نہیں ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ ہی کسی نے اس کو پیدا کیا ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا۔ وہ تب سے ہے جب کچھ بھی نہ تھا اور وہ تب بھی ہوگا جب کچھ بھی نہ ہوگا۔

ایک پتھر کی بے جان مورتی کو پرستش اور پوجاپاٹ سے بھگوان بنانے والے یقیناً اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ یہ بت انہیں نہ کوئی نفع دے سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نقصان...... مگر پھر بھی اجداد سے چلتا ہوا سلسلہ ان لوگوں کو برقرار رکھنا تھا۔ کندن کے ذہن میں اس وقت قرآن کریم کی آیات گونج رہی تھیں۔

''میں وہ خدا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔''

''جنہوں نے اللہ کی راہ میں کوشش کی اللہ ان کو اپنا راستہ دِکھاتا ہے۔''

''اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔'' اس آخری آیت کے ذہن میں آتے ہی کندن کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ اس دکھاوے اور ڈھونگ سے اُسے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس سے پہلے کہ وہاں سے جانے کے لیئے قدم اُٹھاتا اس کے دِل و دماغ میں ایک ہی فقرہ گونجنے لگا۔

''اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔'' اس کا دماغ گھومنے لگا تھا سر چکرانے لگا بے اختیار اس کی شہادت کی اُنگلی آسمان کی جانب اُٹھی اور وہ بے اختیار ہو کر پکار اُٹھا:۔

''اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ وَ اَنَّ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہ''

پھر اس کی ٹانگوں اور ذہن نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا وہ تیورا کر گر پڑا مگر چوپڑہ خاندان کے افراد کی پیشانیوں پر حیرت و استعجاب اور فکرمندی کی لکیروں کو واضح کر گیا تھا۔ کیونکہ بھجن گانے کی آواز میں اس کی آواز کی گونج نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

ایمبولینس آگئی تھی اُسے ہسپتال لیجایا گیا ایمرجنسی میں ڈاکٹرز کی ماہر ٹیم نے معائنہ کے بعد

اس ''بیماری'' کو نہ سمجھتے ہوئے ہاتھ کھڑے کر دیئے تھے۔ بے ہوش کندن کو ایک خصوصی کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اس کا بڑا بھائی موہن چند اس کے پاس تھا وہ بھی کندن کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کو بغور سن چکا تھا پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ یہ مسلمانوں کے کلمہ شہادت کے الفاظ تھے۔ مگر کندن کی زبان سے بے اختیار ہو کر کیوں نکلے؟

اس بات کا جواب گھر کے کسی فرد کے پاس نہ تھا اس کا جواب تو صرف کندن ہی دے سکتا تھا جو موہن چند کے سامنے بے ہوش پڑا ہوا تھا۔

پرساد چوپڑہ اس وقت پریشانی کے عالم میں گھر کی راہداری میں ٹہل رہا تھا۔ مہارانی بھی ایک جگہ پر اپنی فکرمندی جبیں کے ساتھ اپنے پتی کو دیکھ رہی تھی۔ جبکہ پوجا بھابی اپنے کمرے میں کھڑی تھی وہ بھی کندن کی وجہ سے فکرمند اور پریشان تھی کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ اس کی بہن کاجل کندن کی پتنی بن کر اس گھر میں چھوٹی بہو کی حیثیت سے راج کرے۔ مگر کندن نے سب کو گھما کر رکھ دیا تھا۔

پرساد چوپڑہ کے موبائل پر بیل ہوئی تو موہن چند کا نمبر دیکھ کر اس نے جلدی سے رابطہ کیا۔

''ہاں موہن! کہو کیا ہوا؟''

''پتا جی کندن کو ہوش آگیا ہے وہ بالکل نارمل ہے اور ڈاکٹروں نے اُسے گھر آنے کی اجازت بھی دے دی ہے۔'' دوسری طرف سے موہن چند کی پرجوش آواز سن کر پرساد چوپڑہ نے بھی بھگوان کا شکر ادا کیا۔

''میں کندن کو لے کر گھر آرہا ہوں۔ آپ لوگ فکر نہ کریں۔'' دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوا تو پرساد چوپڑہ پرجوش انداز میں مہارانی کو بتانے لگا اور پھر بھاگتا ہوا لان میں سجائی گئی بھگوان کی مورتی کے سامنے سجدہ ریز ہوگیا۔ مہارانی نے بھی اس کی تقلید کی۔

کچھ دیر بعد موہن چند کی قیمتی گاڑی محل میں داخل ہوئی تو کندن اس میں سے ہمیشہ کی طرح خوش باش اترا۔ بالکل ایسے تھا کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں یا پھر اگر کچھ ہوا تھا تو اُسے یاد ہی نہیں۔ پرساد چوپڑہ آگے بڑھ کر کندن کے گلے لگاتا ہوا بولا۔

''میں تلخ خواب کو بھول کر حقیقت کا سامنا کرنے والے اپنے بیٹے کو نئی زندگی کی مبارکباد دیتا ہوں۔''

''نئی زندگی؟'' کندن کے لہجے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔ ''میں تو بھگوان کی پوجا کر رہا

تھا کہ اچانک مجھے چکر آیا...... میرا تو خیال ہے کہ معاملہ اتنا سیریس نہیں ہے۔ آپ لوگ تو خوانخواہ ہی پریشان ہو گئے؟"

کندن کے منہ سے بھگوان کی پوجا کے الفاظ سن کر مہارانی اور چوپڑہ نے سکون کا سانس لیا۔

"تم نے واقعی کوئی جاگتی آنکھوں سے سپنا دیکھا ہوگا۔ میرے لعل...... مجھے تو تم نے پریشان کر دیا تھا۔" مہارانی کی ممتا بھری بات میں مٹھاس تھی۔

کندن نے مہارانی کے پاؤں کو چھو کر ان سب کے من میں آنیوالی کھوٹ کو دھو ڈالا تھا۔ اب وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تو سبھی لوگوں نے پرسکون سانس خارج کرتے ہوئے اُسے جاتا دیکھا۔

"میرا خیال ہے پتا جی!" موہن چند کی بات پر ماتا پتا اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "کندن کے منہ سے نکلنے والے الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ ہم خوانخواہ ہی پریشان ہو گئے۔"

"تمہارا خیال غلط ہے۔" پرساد چوپڑہ نے بڑے بیٹے کے خیال کی نفی کرتے ہوئے اُسے سمجھانا شروع کر دیا۔ "ہم جو بھجن گاتے ہیں جو اشلوک بھگوان کی تعریف میں پڑھتے ہیں وہ ان الفاظ سے بالکل ہی مختلف اور نرالے ہیں جو کندن نے ادا کیئے تھے۔" مہارانی بھی سر ہلاتی ہوئی بولی۔

"میں نے بغور وہ الفاظ سنے تھے جو مسلمانوں کی مسجدوں میں اذان کے دوران ادا ہوتے ہیں۔"

"مگر ان الفاظ کا کندن سے کیا تعلق؟" موہن چند حقیقت سے منحرف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ان الفاظ اور معمولی واقعہ کو اہمیت دو موہن چند۔ مجھے یہ معاملہ بہت گھمبیر لگتا ہے۔" پرساد چوپڑہ کی آواز میں چھپا ہوا ڈر اس کی بیوی اور بیٹے نے بھی محسوس کیا تھا۔ "اس کے دوستوں کی فہرست بناؤ۔ اس کے احباب میں کون کون سے لوگ کن کن مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ کس کا تعلق کس ذات اور کس برادری سے ہے؟ مجھے ان تمام باتوں کی تفاصیل سے جلد از جلد آگاہ کرو...... بس سمجھ لو کہ یہ صرف تمہاری ڈیوٹی ہے اور بھگوان کی کرپا سے اس اچھے کام کیلئے تمہیں چنا گیا ہے۔" پرساد چوپڑہ کا لہجہ اٹل تھا۔ کیونکہ کندن نے ان کی ساکھ اور عزت کی دھجیاں بکھیرنے کی وارننگ عجیب وغریب الفاظ میں دی تھی۔ چوپڑہ خاندان کا بڑا مقام تھا ہندوستان کے کئی بینک

ان کے پیسے سے چلتے تھے۔ شوبز' کاروبار اور دیگر تمام امور میں اس خاندان کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ چوپڑہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات باہر نکلے اور اس کی ذات برادری میں سبکی ہو۔ اس نے موہن چند کی ڈیوٹی لگا کر سختی سے عمل درآمد کرنے کی ہدائت کر دی تھی۔

کندن اپنے کمرے میں پہنچا تو اُسے اپنے کہے ہوئے الفاظ اور وہ پورا واقعہ یاد آ گیا۔ یاد کیا آ گیا بلکہ وہ اس لمحے کو بھولا ہی نہ تھا جب اس کے سامنے خانہ کعبہ کا عکس اُبھرا تو وہ بے اختیار بول اُٹھا تھا۔ اُسے خود پر قابو نہ رہا تھا اس کے خون نے جوش مارا اور خانہ خدا کو دیکھتے ہوئے اس کے دل کی آواز ہونٹوں پر آ گئی تھی۔ مگر کندن کے دل کی دنیا اتھل پتھل ہو چکی تھی۔ وہ اس منظر کو دوبارہ دیکھنے کے لیئے تڑپنے لگا تھا۔ اس نے کئی بار ایک ہی جگہ اپنی نظریں اور ذہن کو مرکوز کر کے اس منظر کو زندہ کرنے کی کوشش کی مگر بے سود رہا تھا۔

اس کے دل کو قرار داد اور ذہن کو سکون کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی وہ کمرے میں بے دلی اور بے قراری کے عالم میں ٹہلنے لگا تھا۔ وہ اپنے دل کو دائیں ہاتھ سے سہلانے لگا۔ اس کا انداز بالکل اس ماں جیسا تھا جو روتے ہوئے بچے کو اپنے ممتا بھرے دستِ شفقت سے سہلا کر سلانا چاہتی ہے۔ وہ اپنے دل کی بے قرار کیفیت کو کوئی بھی نام نہ دے رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا وہ واش بیسن کی طرف بڑھا اور آستین چڑھا کر وضو کرنے لگا۔ اس نے پرسکون انداز میں وضو کیا تھا کیونکہ کسی بھی چیز کی تعمیر میں اس کی بنیاد درست رکھنا ہی کامیابی کی دلیل ہے۔

اس نے تحمل سے وضو کرنے کے بعد بیڈ کے میٹرس کے نیچے سے چابی نکالی اور الماری کھول کر قرآن مجید کو بوسہ دیکر آنکھوں سے لگایا تو بے قرار دل کو قرار اور ذہن کو سکون ملنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے برسات جاری ہو گئی تھی۔ دل کا غبار' ذہن کی بے سکونی' خون کی بے ترتیب روانی اور پورے وجود کا مطمئن ہو جانا اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے راستے بہہ بہہ کر قرآن کریم کو بھگونے لگا تھا۔ اس نے کتنی ہی ساعتیں اسی طرح گزار دیں تو دور سے اذان کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے قرآن کریم کو واپس الماری میں رکھا اور بھاگنے والے انداز میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔

اس کی نگاہ دور مسجد کے مینار پر گئی جس کے سپیکروں سے موذن کی محبت بھری صدا خالق کائنات کی شاعری کو اپنی پرسوز اور دل کو گداز بخشنے والے انداز میں سنائی دینے لگی۔ وہ مسجد کے

اکلوتے مینار کو بھی غور سے دیکھنے لگا جو بالکل الف کی طرح سیدھا کھڑا تھا اور اللہ کی وحدانیت کا پرچار کر رہا تھا۔ اس کی نظریں آسمان کی بلندیوں پر اُڑتے ہوئے پرندوں پر گئیں جو بظاہر تو چہچہا رہے تھے مگر ان کی معصوم صدائیں اللہ اللہ کی پکار بن رہی تھیں۔ اس کی نظریں اپنے لان میں کھلے ہوئے پھولوں پر گئیں تو وہ بھی مسکراتے ہوئے کھلتے ہوئے رب تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مصروف دِکھائی دیئے۔

اذان ختم ہو چکی تھی مگر کندن بت بنا کھڑکی میں ہی کھڑا تھا وہ کائنات کے ذرے ذرے میں رب تعالیٰ کو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بے اختیار ہو کر گردن جھکا کر دل کی طرف دیکھا وہ بھی ''اللہ ھو اللہ ھو کی صدا بلند کرتا ہوا محسوس ہوا۔ کندن کی آنکھوں سے آنسو ایک بار پھر جاری ہو گئے تھے۔ وہ اپنے وجود کی بدلتی ہوئی کیفیت کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔

اُسے یاد آیا کہ کتنے ہی دن گزر گئے ہیں خلیل احمد سے کوئی رابطہ نہیں ہوا کیوں نہ اس سے رابطہ کیا جائے اس نے یہ خیال آتے ہی اپنا موبائل نکالا اور خلیل احمد کو فون کرنے لگا۔ مگر بار بار یہی جواب ملتا تھا کہ آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت ''آف'' ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ خلیل احمد نماز پڑھنے گیا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ جس کسی پر مہربان ہوتا ہے اُسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔ اپنے عشق کی دَولت عطا کر کے بندے کا ظرف دیکھتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میری طرف قدم بڑھانے والا میری رحمت اور برکتوں سے فیض یاب ہونے کیلئے کس نیت اور ارادے سے میری طرف بڑھ رہا ہے مگر اس کے شرائط اور قانون انوکھے ہوتے ہیں وہ قادرِ مطلق ہے ہر چیز پر اس کی حکومت ہے ہر چیز پر۔ نفس اس کے بنائے ہوئے قانون کے تابع ہے وہ دعائیں مانگنے والوں کے نیک ارادے بھانپ کر ان کی تقدیریں بدل دیتا ہے۔

مگر آج تک اس کا کوئی ہمسر پیدا نہیں ہو سکا اور نہ ہوگا کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے بنائے ہوئے کسی بھی قانون میں تبدیلی کی جرات کر سکے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد فرماتا ہے کہ عورتوں کو نامحرم مردوں سے پردہ کرنا چاہیئے حجاب میں اپنا چہرہ چھپانا چاہیئے مگر اس کا قانون اس کے حکم پر اسی کے گھر میں بدل جاتا ہے۔ عمرہ اور حج کے دوران طوافِ کعبہ کرتے وقت حکم ہے کہ عورت اپنا جسم لپیٹے مگر چہرہ ننگا ہونا چاہیئے۔ وہاں لاکھوں غیر محرم ایک دوسرے سے کندھے سے کندھا چھو کر طواف' سعی یا منیٰ میں حج و عمرہ کے فرائض و نوافل ادا کرتے ہیں۔

پانی بیٹھ کر پیو' مگر زم زم کا معطر و متبرک پانی کھڑے ہو کر پینے کا حکم ہے۔ یہ اس کے قوانین ہیں جنہیں کوئی نہیں بدل سکتا۔ وہ اللہ ہے جس کی کسی کو سمجھ نہیں ہے مگر سمجھداروں کو اس کی بہت سمجھ ہے۔ وہ اپنی طرف قدم بڑھانے والے کو اپنی محبت اور رحمت سے نوازتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سے طور پر گفتگو (کلام) اور اپنے پیارے محبوب سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کو اپنے پاس عرشِ بریں پر بلوا کر گفتگو اور دیدار بھی کرواتا ہے۔ کسی کو تشنہ رکھتا ہے تو کسی کے لبوں اور قلب کو اپنی حُب سے سیراب کر دیتا ہے۔ اس کی راہوں پر چلنے والے گرد آلود پاؤں کے نیچے آنے والی مٹی کے ذرے بھی رحمتِ خداوندی کے حق دار بن جاتے ہیں۔

کندن کو ان راہوں پر چلنے کے لیئے کسی کامل مرشد کی ضرورت تھی مگر اس سے پہلے اس کی نیت اور نیک ارادے کا عمل دخل اس کی آنے والی زندگی میں بہت اہمیت کا حامل تھا۔ بیت اللہ کی دَتی برابر جھلک نے ہی اسے ہوش سے بیگانہ کر دیا تھا اگر اللہ تعالیٰ اپنے ابتدائی اور بنیادی قانون کے مطابق اُسے اپنے محبوب اور باعثِ تخلیقِ کائنات۔ جانِ کائنات۔ رحمتِ دو عالم۔ معطر و مطہر۔ شفیع الرحم۔ صاحبِ جود و کرم۔ غریبوں یتیموں کے والی۔ سرورِ قلب و سینہ حضورِ مدینہ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے میٹھے میٹھے پیارے پیارے گنبدِ خضریٰ کا معمولی سا دیدار بھی کرا دیتا تو شائد کندن اپنے ہی گھر میں اپنے ماتا پتا کے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا۔

اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے محبت کرنے سے پہلے اپنے محبوبؐ کی عظمت و بڑائی اور اسؐ کی ثنا خوانی کا حکم دیتا ہے۔ وہ بار بار قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے کہ ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔'' وہ خود اپنے محبوب کی مدحت خوانی کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں کئی جگہوں پر اس نے اپنے پیارےؐ کو محبت بھرے کئی ناموں سے پکارا ہے۔ اذان میں اُن کا نام نماز میں آقا علیہ الصَّلوٰۃُ والسلام پر درود کو لازم کر کے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ''اے ایمان والو۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے آپؐ پر درود و سلام پڑھتے ہیں۔ تم بھی آپ ﷺ پر درود و سلام پڑھو۔''

یہ سب دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیئے بنیادی چیزیں ہیں مگر ان سب باتوں اور ربِ واحد کے قوانین سے آگاہی کیلئے کندن کو بہت محنت سے کسی اللہ کے سفیر کو ڈھونڈنا تھا جو کندن کو معرفتِ حق سے متعارف کروا سکے۔ وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تھا اس کی عمر بتوں کو پوجتے گزر رہی تھی مگر قرآن کریم کو محبت و احترام سے پڑھنے پر اس کی قسمت اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ اُسے گھر

میں ہی دیدار بیت اللہ کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔

مگر اس چھوٹی سی جھلکی نے اس کے ذہن اور دِل کو سکون بخشنے کی بجائے اس کی تشنگی کو اور بڑھا دیا تھا۔ اس کے دِل کو تڑپا دیا تھا اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ اس کی سانسیں ناہموار ہو کر اس سے ناطہ توڑنے کی کوشش کرنے لگی تھیں۔ آنکھیں چندھیا کر کسی اور منظر کو دیکھنے سے انکاری تھیں۔ اس سے پہلے کہ اس کی بے قرار و بے چین رُوح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑتی وہ بے اختیار شہادت کی انگلی آسمان کی طرف کر کے کلمہ شہادت کے الفاظ پکار اُٹھا تھا جبکہ اس نے زندگی میں کبھی بھی ان الفاظ کو نہ پڑھا تھا۔

☆☆☆

جگنو کی کہی ہوئی بات سچ ہو گئی تھی آمنہ کو ارجنٹ میل کے ذریعے علی گارمنٹس میں جاب مل گئی تھی۔ وہ خط کو بار بار چوم رہی تھی اور گھر بھر میں خوشی سے جھوم رہی تھی۔ جگنو اور عائشہ بی بی بھی اس کی اس دیوانگی پر خوش تھے۔ جگنو دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر جس کی آواز ایک ہاتھ ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے بے ڈھنگی تھی اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا جبکہ عائشہ بی بی نے جاءنماز بچھا کر رب تعالیٰ کے حضور دو نوافل شکرانہ ادا کیا تھا۔

''آمنہ باجی...... آمنہ باجی!'' وہ جگنو کے پکارنے پر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ''آمنہ باجی میں آپ کو ایک تحفہ دوں گا۔'' آمنہ اور عائشہ بی بی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگیں تو وہ اپنے مخصوص انداز میں ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گیا۔ ''ہائے ہائے! تم لوگ ان پڑھ ہو میری بات کو سمجھ نہیں سکتے...... بتاؤں؟'' اس کا انداز بچپنا لیئے ہوئے تھا وہ اس گھر کا بڑا بیٹا تھا مگر تقدیر نے اس کے ہاتھ پاؤں کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ میں بھی معمولی سا نقص ڈال دیا تھا یہ سب کچھ پیدا کرنے والے مصوّر کا کھیل تھا۔

''بتاؤ؟'' دونوں ماں بیٹی اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ''کیا تحفہ دو گے؟''

''جب آمنہ باجی کو اش کے شاب شے بہت شارے پیشے ملیں گے میں ان پیشوں میں شے اپنے لیئے ایک شوٹ (سوٹ) خریدوں گا۔'' اس کی بات سن کر ان دونوں کی آنکھیں بھیگ گئیں وہ بات کو ٹھیک طرح سے ان تک پہنچا چکا تھا مگر ادا نہ کر سکا تھا۔ فقروں اور الفاظ کی ترتیب نے اس کا ساتھ نہ دیا تھا۔ غریب آدمی کیلیے وہ دن روز عید ہوتا ہے جب وہ نیا سوٹ پہنتا ہے۔ مگر جگنو اپنی خواہشات اور دلی ارمانوں کی ترجمانی کے لیئے الفاظ ادا کرنے کے قابل نہ تھا۔

شام کو ابراہیم تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا تو جگنو ہمیشہ کی طرح لڑکھڑاتا ہوا اس کے گلے لگ گیا۔

''ابا جی! ابا جی...... ایک بات شناؤں؟'' اس کا اپنا ہی انداز تھا وہ کملا جھلا یہ بھی نہیں سمجھتا تھا کہ اس کا باپ دِن بھر ریڑھی کو دھکا لگا کر آوازیں کس کس کر سبزی فروخت کر کے تھکا ہوا ہو گا مگر ابراہیم کی بھی تمام تھکن جگنو کے اِس انداز سے اُتر جاتی تھی۔

''سناؤ'' اب بھی ابراہیم مسکراتا ہوا بولا۔ آمنہ نے اُسے سلام کیا اور پانی کا گلاس پکڑا دیا۔ وہ صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر سکون کی سانس خارج کرتے ہوئے گلاس ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگا۔ تبھی جگنو نے دھماکہ خیز خبر ابراہیم کو سنا دی۔

''آمنہ باجی شاب بن گئی ہے۔'' ابراہیم نے نا سمجھنے والے انداز میں جگنو کی طرف دیکھنے سے گریز کیا اور عائشہ بی بی کی طرف دیکھا کیونکہ جگنو ماتھا پیٹنے لگا تھا۔

''آمنہ کو علی گارمنٹس میں نوکری مل گئی ہے۔'' ابراہیم نے سنا تو بے اختیار دونوں ہاتھ اُٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر جگنو کا منہ چوم لیا۔

''مجھے کیوں چوم رہے ہو...... میں تو شاب نہیں بنا۔'' وہ چڑنے والے انداز میں بولا تو ابراہیم اس پر فریفتہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم نے مجھے خوش خبری جو سنائی ہے۔'' عائشہ بی بی نے ابراہیم کے آگے کھانا رکھ۔

''جگنو صاحب؟'' ابراہیم نے کہا تو وہ جی جان سے متوجہ ہو گیا۔ ''ہاتھ دھو آؤ تا کہ کھانا کھا لیں۔''

''میں نے دربار شریف سے کھا لیا تھا۔'' ابراہیم سمجھ گیا کہ اس نے پنڈارا کھا لیا ہو گا۔ ''وہ جو حافظ جی ہیں نا...... اُنہوں نے کہا تھا کہ آمنہ باجی کو اچھی نوکری مل جائیگی۔'' ابراہیم اس کی باتیں بھی سنتا جا رہا تھا اور کھانا بھی کھاتا جا رہا تھا کیونکہ جگنو دِن بھر کی کارکردگی اُسے ہی سناتا تھا۔

''انہوں نے اور بھلا کیا کہا؟'' اس کے سوالیہ انداز پر ابراہیم کو اپنا نوالہ روکنا پڑا۔

''تم بتاؤ...... مجھے کیا پتہ؟'' اس نے نوالہ اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تو جگنو اس کے اور قریب ہو کر بیٹھ گیا وہ اپنا منہ ابراہیم کے کان کے قریب لا کر رازدارانہ لہجے اور انداز میں گفتگو کرنے لگا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کی آواز پورے گھر نے سنی تھی۔

''آمنہ باجی کے لیئے بہت اچھا رشتہ بھی آئیگا۔'' ابراہیم کا منہ رک گیا وہ حیرت سے جگنو کی

طرف دیکھنے لگا۔ ''یہ بات حافظ جی نے کہی تھی۔''؟ اُسے آمنہ کے رشتے کے حوالے سے بے یقینی تھی۔ کیونکہ وہ غریب تھا۔ اس کا گھر بھی ٹوٹا پھوٹا تھا۔ کسی بھی کمرے میں کوئی ڈھنگ کی جگہ نہ تھی جہاں پر آنیوالے مہمانوں کو اچھی طرح بٹھایا جاتا۔

مگر حافظ جی نے کہا تھا تو اللہ بھی ان پر مہربانی کرنیوالا تھا۔ کیونکہ حافظ جی جگنو سے معرفت اور راز کی باتیں کر لیتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان پر بہت عطا کی ہوئی تھی۔ وہ رب تعالیٰ کی رحمت ورضا سے آنیوالے حالات سے آگاہی بھی کر لیتے تھے۔ اب جگنو کے منہ سے سن کر ابراہیم کو یقین ہو گیا تھا کہ اللہ ان پر ان کی بیٹی پر مہربانی کرنے والا ہے۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ آمنہ اپنے گھر چلی جائے اور پھر عفی کی شادی کر کے اس کے گلے میں بھی بیوی نام کے رشتے کا پٹہ ڈال دیا جائے۔

ابراہیم نے آمنہ کو اپنے پاس بلایا اور زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے لگا۔ گو کہ اُسے اپنی بیٹی پر اندھا اعتماد تھا مگر دنیا میں کیا کچھ ہوتا تھا یا ہو رہا ہے ابراہیم اپنا تجربہ اور علم بیٹی کو منتقل کرنا چاہتا تھا۔

''غم اور مصیبتیں ہمیں بیدار کرنے کیلئے ہوتی ہیں۔ ان کا مقابلہ ہمت اور چاک و چوبند ذہن سے کرنے والا ہی کامیاب ہوتا ہے۔'' آمنہ بڑی محویت سے باپ کی باتیں سن رہی تھی جبکہ جگنو وہیں سو گیا تھا۔ ''عزت کی حفاظت جان سے بڑھ کر ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی پر بھروسہ بھی۔ زندگی ایک بار ہی ملتی ہے اور پوری زندگی انسان عزت بنانے میں گزار دیتا ہے۔ اسی لیئے زندگی کی نسبت میں عزت بچانے کو ترجیح دونگا۔''

''آپ بے فکر رہیں ابا جی!'' آمنہ نے اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''آپ کو مجھ پر اعتماد ہے تو میں آپ کو اس اعتماد پر پورا اتر کر دکھاؤں گی۔ میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''میں نے کوشش کی ہے کہ تم لوگوں کو حلال کما کر کھلاؤں اور اللہ کا شکر ہے کہ میں اس کوشش میں کامیاب بھی ہوا ہوں۔'' وہ ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ دروازہ پیٹا جانے لگا۔ سبھی حیرت زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ آمنہ نے دیوار پر لگے کلاک پر نظر ڈالی تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ''میں دیکھتا ہوں...... کوئی ہمسایہ ہوگا۔'' ابراہیم نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے ہمسائے خیر بخش کو دیکھنے لگا جس کے منہ پر بارہ بج رہے تھے۔

''کیا ہوا ہے خیر بخش؟'' ابراہیم اتنا ہی کہہ پایا۔

''عفی کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔'' خیر بخش کے منہ سے خیر کے الفاظ نہ نکلے تھے۔ یہ

بات سن کر ابراہیم بھی لرز گیا اور دونوں ماں بیٹی بھی۔

''ایسی بد بخت اولاد اللہ کسی کو نہ دے۔ جو بویا وہی کاٹنا ہے اس نے۔ اطلاع دینے کا شکریہ خیر بخش۔'' ابراہیم نے دروازہ بند کر دیا اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے وہ آمنہ اور عائشہ سے نظریں نہ ملا رہا تھا جیسے کہ عفی کی گرفتاری میں اس کا عمل دخل ہو۔

''اب کیا ہوگا جگنو کے ابا۔'' عائشہ بی بی کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز سے اُسے چونکا دیا۔ وہ بڑے دُکھ اور تاسف سے بولا۔ ''میں غلط کہہ رہا تھا کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا ہوں۔ میرے اللہ میرے غرور اور تکبر کو معاف کر دے۔ تکبر صرف تیری ذات کو ہی جچتا ہے۔ ضرور میری کمائی میں کوئی نہ کوئی حرام کا پیسہ شامل ہوا ہے جو قدرت نے مجھے عفی کی صورت میں اولاد دی ہے۔'' ابراہیم بچوں کی طرح رونے لگا تھا۔ ''مجھے اس عذاب سے محفوظ رکھ مولا۔ میں اس عمر میں تھانے کچہریوں کے چکر نہیں کاٹ سکتا۔ مجھے موت دے دے۔ مجھے موت دے دے۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنے لگا تھا۔

آمنہ نے آگے بڑھ کر باپ کے ہاتھ پکڑے۔ ''ایسا مت کہیں۔ آپ کے سوا ہمارا ہے ہی کون؟''

''ایسے الفاظ منہ سے مت نکال جگنو کے ابا۔'' عائشہ بی بی بھی روتی ہوئی زمین پر ہی بیٹھ گئیں۔ ''پتہ نہیں کس گھڑی منہ کی بات پوری ہو جائے۔ ہماری طرف دیکھ—— ہمارا کون ہے—— ہم عفی سے تعلق توڑ لیں گے اُس کو اس گھر میں آنے کی کوئی اجازت نہیں ہے—— پر آپ اپنے منہ سے ایسی باتیں منہ نکالو۔'' ہنستا بستا گھر پل بھر میں اداسی اور سوگواری میں ڈوب گیا تھا۔ سب کے چہرے سُتے ہوئے لگ رہے تھے۔ کئی ساعتیں اسی طرح گزر گئیں تو دروازہ ایک بار پھر کھٹکھٹایا جانے لگا۔ سب کی نظریں کسی اور بُری خبر کو سننے اور دیکھنے کے دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔

ابراہیم ایک بار پھر اُٹھ کر جھکے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور ٹانگیں کانپنے لگی تھی وہ کنڈی کو ہاتھ لگانے سے اس طرح ڈر رہا تھا جیسے وہ لوہے کا کنڈا نہ ہو بلکہ دروازے سے سانپ لپٹا ہوا۔ وہ شش و پنج میں جلتا اسی طرح کھڑا تھا کہ دروازہ ایک بار پھر کھٹکھٹایا گیا وہ ڈر گیا پھر حوصلہ کر کے اس نے کنڈا کھولا تو سامنے عفی کو کھڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کبھی عفی کو اور کبھی پیچھے مڑ کر عائشہ اور آمنہ کی طرف دیکھتا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو ابا جی!؟'' عفی کا بات کرنے کا مخصوص انداز تھا۔ ابراہیم نے اُسے اندر

آنے کا راستہ دیا وہ ڈھٹائی سے چلتا ہوا عائشہ بی بی کے پاس پہنچا تو وہ پوچھ بیٹھیں۔

"کہاں سے آ رہے ہو...... اور اتنے دن گھر کیوں نہیں آئے؟" عائشہ بی بی کے آخری فقرے میں ممتا کی جھلک نمایاں تھی۔ مگر وہ شوہر کی طرف دیکھ کر نظریں جھکا کر رہ گئیں۔

"مجھے پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔" عفی نے ماں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ آمنہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"کس گناہ میں۔ کون سا جرم کیا تھا تم نے؟" ماں کا کلیجہ ایک بار پھر تڑپا۔

"اسے کیا پوچھتی ہو عائشہ بیگم۔ مجھ سے پوچھو۔" ابراہیم بھی پاس آ گیا تھا۔" جو بیٹا راتوں کو گھر نہ آئے اسلحہ سمیت جوان بہن کے سامنے بے غیرتی کا مظاہرہ کرے۔ باپ کے ماتھے پر پستول تان لے۔ کوئی بھی کام دھندہ کیے بغیر اس کی جیب نوٹوں سے بھری رہی...... اس سے پوچھ رہی ہو کہ کیا جرم کیا تھا؟" ابراہیم کا سانس پھولنے لگا تھا۔" کیوں آئے ہو اس گھر میں ہم سے کوئی رشتہ رکھنا چاہتے ہو تو غیر اخلاقی اور غیر قانونی دھندے چھوڑ دو۔ ورنہ......"

"ورنہ کیا...... ابا جی!؟" عفی بے دید اور جاہل بن گیا تھا۔

"ورنہ یہ گھر چھوڑ دو۔" ابراہیم کی آواز میں دُکھ واضح تھا۔

"اگر یہ گھر نہ چھوڑوں تو......؟" عفی کا جاہل پن اور اکھڑا ہوا لہجہ بدستور قائم تھا۔

"تو پھر نکال اپنی ڈب سے پستول اور ہم سب کو گولی مار دے۔ ہم سے روز روز مرا نہیں جاتا۔" ابراہیم نے آگے بڑھ کر عفی کا گریبان پکڑ لیا۔" مجھ سے ابتدا کرو۔ کیونکہ میرا ہی قصور ہو تم۔ میرے کسی گناہ کی سزا ہو تم۔ ختم کر دو مجھے عفی۔ ختم کر دو مجھے۔" وہ عفی کے گریبان کو پکڑ کر جھٹکے دیتا ہوا رو رہا تھا۔ مگر حیرانگی کی بات تھی کہ عفی نے پہلے کی طرح پستول نکال کر باپ کی پیشانی پر نہ رکھا تھا۔ اُس نے آہستگی سے باپ کے ہاتھ پکڑے اور ان کو روتے ہوئے بوسہ دیا۔ عائشہ بی بی اور آمنہ بھی حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اس نے حیران ابراہیم کو چھوڑ کر عائشہ بی بی کے پاؤں میں اپنا سر رکھ دیا اور زار و زار رونے لگا۔ اُنہوں نے عفی کو اُٹھایا اور کچھ بولنا چاہا مگر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُنہیں خاموش کرا دیا۔ پھر وہ جگنو کے پاس بیٹھ گیا جو کہ ٹیڑھے میڑھے انداز میں سویا ہوا تھا۔ عفی نے بڑے بھائی کے ناتے سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اس کی طرف محبت سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں برسات کی طرح رم جھم برسا رہی تھیں۔ گھر کے باقی تینوں نفوس بھی اس کی

اس حالت پر حیرت و استعجاب میں مبتلا تھے۔

اس نے آمنہ کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر اُسے اپنے سینے سے لگاتا ہوا بولا۔

"میں تمہارا اچھا بھائی نہ بن سکا۔" اس کا لہجہ آنسوؤں کی آمیزش سے تر تھا۔ آمنہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے آمنہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر اداس نظروں سے گھر کے در و دیواروں کو ایک نظر دیکھا اور ابراہیم کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ بھی مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ آپ میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا کہ میں اس گھر سے جاؤں مگر میں جس خطرناک راہوں پر چل نکلا ہوں ان راہوں سے واپسی نہیں ہوتی۔ میں آپ کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مگر آپ لوگوں کی زندگیوں کا سودا کر کے نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے کتنے دشمن ہیں اور یہ بھی نہیں چاہتا کہ میری دشمنی کی گندی چھینٹ میرے گھر والوں کی عزت پر پڑے اور میرے باپ کی زندگی بھر کی حلال کمائی کو پل بھر میں داغدار کرتی ہوئی حرام میں بدل دے۔ میں آپ لوگوں کو بہت یاد کیا کروں گا۔ مجھے معاف کر دینا۔" وہ یہ کہہ کر باہر کی جانب چل پڑا۔ عائشہ اور ابراہیم اُسے پکارتے ہی رہے۔ مگر وہ جن راہوں کا مسافر بن چکا تھا ان راہوں پر پیچھے مڑ کر دیکھنے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔

ماں چھلنی چھلنی کلیجے سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیکھنے کیلئے ننگے پاؤں اس کے پیچھے گلی میں گئی مگر وہ اس تاریکی میں تاریکی کا حصہ بن چکا تھا۔ باپ اپنے لختِ جگر کو جیتے جی قبر میں اترتا ہوا خاموش تماشائی بن کر کھڑا تھا۔ بہن اپنے کہار کو ڈولی کو بغیر کندھا دیئے ہی جاتا دیکھتی رہ گئی۔ اس بھائی نے کبھی بھی اس کی خوشیاں پوری کرنے کی کوشش نہ کی تھی مگر پھر بھی ایسا لگا کہ جسم کا ایک حصہ کسی نے بے رحم اور بے دردی سے کند چھری سے کاٹ دیا ہو۔ جھلا کملا جگنو جو اس گھر کا بڑا تھا اس دُکھ اور صدمے سے بے نیاز ہو کر سو رہا تھا کہ اس زمانے نے بڑی بے رحمی سے اس کا بازو کاٹ دیا ہے۔ اس کا بھائی اس گندے سسٹم کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔

☆☆☆

"ان لوگوں کی نحوست نے ہی میرے بیٹے کی خوشیاں برباد کی ہیں اور تم کہتے ہو میں ان کو فریحہ کی شادی پر پھر بلا لوں۔" اصل نے اختر علی کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ ان کی بد دعائیں میرے گھر کی خوشیاں چھین کر لے گئی ہیں۔"

"سب سے مشکل حفاظت زبان کی ہے۔" اختر علی ٹھنڈی سانس بھرا ہوا بولا۔" میں نے تو

یونہی کہہ دیا تھا ان لوگوں کے پاس ایک عزت ہی تو ہے جس کا تم نے کباڑہ بنانے کی کوشش کی تھی۔"

"جوتیاں پاؤں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ ان کو سر پر رکھنے سے تاج کا درجہ نہیں مل جاتا۔" وہ دونوں اس وقت کسی تقریب سے واپس آئے تھے اور اپنے بیڈروم میں تھے۔ احمل بیگم اپنی جیولری اتار کر طریقے سے رکھ رہی تھی۔ جبکہ اختر علی بیڈ پر پُرسکون انداز میں لیٹا ہوا تھا کہ اس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر انگوٹھی میں نگینے کی طرف فٹ تھی۔ "مجھے اور مجبور مت کرنا اختر علی ورنہ میں شادی والے دن یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔" احمل نے قطعی لہجے میں کہا تو اختر علی بے بسی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ "تم کہتے ہو ان لوگوں کو فریحہ کی شادی میں بلوانا چاہئے...... میں تو کہتی ہوں ایسے لوگوں کی نحوست سے اپنے گھر کو محفوظ رکھنے کیلئے اپنی ہر قسم کی خوشیوں سے بھی بے خبر رکھا جائے۔" وہ بھی بیڈ پر بیٹھ چکی تھی مگر زبان سے طنز اور تکبر کے نشتروں کا رخ ابراہیم اور عائشہ بی بی کی طرف مسلسل تھا۔

"جو لوگ تمہاری نظر میں چھوٹے ہوتے ہیں۔ حقیقت میں ان کا قد کاٹھ تم سے بہت اونچا ہوتا ہے۔" اختر علی بہن اور بہنوئی کی وکالت کر رہا تھا۔ "میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو ماں باپ اپنے بچوں کو اچھا اخلاق اور بہترین تربیت سے سنوارتے ہیں وہ اس زمانے میں بہت بڑے اور اعلیٰ ہیں۔"

"میرے والدین کی توہین کرنے کی تمہیں کوئی اجازت نہیں ہے۔ یہ اچھا اخلاق اور ان کی اعلیٰ تربیت کی ہی بدولت تم اعلیٰ سوسائٹی میں پہچانے جاتے ہو۔" احمل کا تکبر بدستور قائم تھا۔ "تم کیا تھے؟ کبھی اس بارے میں بھی سوچا ہے اختر علی!؟"

"میں اپنے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں احمل بیگم!" وہ اُٹھ کر ننگے پاؤں ہی کمرے میں بچھے ہوئے قالین پر ٹہلنے لگا۔ "میں وہ کسان ہوں جو مالک کی زمینوں پر اپنا خون پسینہ بہا کر بیج بوتا ہے اور جب اس کے ہاتھوں اور محنت سے لگائے گئے پودے پھل دینے کے قابل ہوتے ہیں تو مالک چند روپوں کے عوض اس کی محنت اور محبت پر اپنے تکبر اور امارت کی لات مار دیتا ہے۔" اس کی پیشانی پر سوچ اور فکر کی لکیریں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔

"میں جانتا اور مانتا ہوں کہ میں تمہارے والد کی مل میں منیجر تھا مگر یہ بھی یاد رکھو ایک مل کو ملز بنانے میں میری آنکھوں نے کتنی نیندیں قربان کی ہیں۔ میرے ہاتھوں کے چھالے آج بھی

میری کھال پر اپنی موجودگی کا نشان ثبت کیئے ہوئے ہیں۔ مجھے اپنے پاؤں کی تھکن آج بھی یاد ہے ان کی سوجن اتنی ہوتی تھی کہ میرے موزے پھٹ جاتے تھے۔" اختر علی کی خوابناک لہجہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ اپنے محنت کے دِنوں کو یاد کرتا ہوا خود بھی ماضی کا حصہ بن گیا ہے۔

"میرے والدین تو تھے نہیں جو میرا حوصلہ بڑھاتے بس یہی بہن اور ابراہیم بھائی تھے جنہوں نے مجھے گھی اور شکر کی روٹی کی چوری کھلائی۔ میری ماں جیسی بہن ہر روز صبح کو میرے ماتھے پر اپنی ممتا بھری محبت کا بوسہ دیکر مجھے کام پر رخصت کرتی تھی۔" اختر علی کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرانے لگے جنہیں یاد کر کے اس کی آنکھوں نے جگنا اور جلنا شروع کر دیا تھا۔

"میں راتوں کو دیر سے آتا تو آپا عائشہ مجھے دروازے میں ہی کھڑی ملتی تھیں۔ میں نے تیرہ برس کی ان تھک محنت اور ان کی محبت بھری پرورش سے تمہارے باپ کو کمپنیوں کے قرض سے نجات دلائی۔ ان کی ایک ٹیکسٹائل ملز کی جگہ تین تین ملز بن گئیں۔ تمہارے باپ نے تمہارا رشتہ مجھ سے کرنے کے عوض مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میری ماں۔ میرے باپ جیسا بہنوئی...... مگر ان لوگوں کی عظمت اور اعلیٰ تربیت کو میں ہر روز دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سلام کرتا ہوں کہ اُنہوں نے میری خوشی کو مقدم جانا اور مجھے گھر جمائی بن کر رہنے کی اجازت ان دُعاؤں کے ساتھ دی کہ میں اس ملک کی بنیادوں کو اپنے شب و روز سے اور بھی مستحکم کروں۔ ان کی زبان پر اف تک نہ تھی۔ ان کا گھر چھوڑ کر میں جب تمہارے گھر میں داخل ہوا تو میں زرخرید غلام بن چکا تھا۔" اختر علی کے گالوں پر آنسو اپنی لکیریں بنا کر اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔

"مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میرے مالک نے میری مزدوری کے عوض مجھے چند روپے نہیں دیئے بلکہ اپنی بیٹی اس محنتی اور جفاکش کسان کے سپرد کر دی ہے۔ مگر تمام جائیداد اس کی بیٹی کے نام ہی تھی۔ آج تم جس مقام پر کھڑی ہو کر مجھے پل پل بلیک میل کرتی ہو۔ یہ مقام میرا ہی دیا ہوا ہے۔ مگر مجھے اچھا کام کرنے کی تربیت دی گئی ہے۔ میں تمہاری ہر بات چپ چاپ سہتا اور خاموش ہو جاتا ہوں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس جائیداد پر میرا کوئی حق نہیں ہے تمہارے والد کے مرنے کے بعد جتنی بھی پراپرٹی بنی ہے وہ سب میرے نام ہے۔ مگر میں تمہاری طرح کمینہ اور کم ذات نہیں ہوں کہ تمہارے والدین کو برا بھلا کہوں۔ میں آج بھی یہ سب کچھ چھوڑ کر اس کچے گھر میں رہنے کو تیار ہوں جس کی اینٹوں سے نکلنے والی بھر بھری مٹی میں میری محبتوں کی خوشبو رچی بسی ہے۔ اس کچے آنگن میں میرا بچپن بسا ہے۔ مگر احمل بیگم!" احمل بیگم اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ہم نے اپنے اردگرد سٹیٹس کی جو دیوار بنالی ہے وہ اتنی بلند ہوگئی ہے کہ اس کے پار جھانکنے کیلئے ہمارے قد بہت چھوٹے ہیں۔ میں ان بچوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تمہاری حیثیت میری آپا عائشہ کی جوتی سے زیادہ نہیں ہے۔''

''تم حد سے بڑھ گئے ہو اختر علی!'' وہ آخری فقرہ سن کر تلملانے لگی۔ ''اس غریب بڑھیا کی خاطر میری توہین کر رہے ہو۔'' وہ غصے میں پیر پٹختی ہوئی اختر علی کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔

''کیا اس غریب بڑھیا جیسی محبت ایک بھی دن اپنے بچوں کو دے پائی ہو اطل!؟''

''اپنے دِل پر ہاتھ رکھ کر ممتا کی قسم کھا کر کہو کیا تم ان کی وہ ماں بن سکی ہو جو خالد آباد کے کچے مکان میں اپنے بھائی کی ماں بن گئی تھی؟''

''کیا کبھی اپنے شوہر کی اس طرح خدمت کی ہے جس طرح وہ غریب بڑھیا کرتی ہے؟''

''اپنے ایمان سے کہو اطل! کیا تمہارے دل میں وہ سکون ہے جو اس غریب بڑھیا کے چہرے سے جھلکتا ہے۔''

''نہیں نا...... نہیں...... تم ابھی بہت چھوٹی ہو اطل! ان غریبوں کے اخلاق کی برابری کرنے کیلئے تمہیں بہت حد تک جھکنا پڑے گا۔ مگر میں جانتا ہوں تم ٹوٹ سکتی ہو مگر جھک نہیں سکتی!'' اختر علی نے آج تیس برس کا غبار تیس منٹوں میں نکال کر اطل کو اس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔ مگر وہ کتے کی وہ ٹیڑھی دم تھی جو بارہ سال بعد بھی ٹیڑھی ہی رہی۔

''میں ان لوگوں کی طرفداری اور حمایت میں کوئی لفظ بھی نہیں سننا چاہتی!'' اطل نے دو ٹوک لہجے میں کہا تو اختر علی کے لبوں پر پھیلی مسکان دیکھ کر وہ لال پیلی ہوگئی۔ ''میں تمہاری اس طنزیہ مسکراہٹ کو کیا نام دوں؟''

''شکست۔'' اختر علی کا مختصر جواب اُسے اور بھی تلملا گیا۔

''میں نے ہمیشہ زندگی میں فتح حاصل کی ہے۔ ہارنا نہیں سیکھا۔''

''دوسرے فریق کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُسے لڑائی پر مجبور کرو گے تو یقینی فتح تمہاری ہوگی۔''

''فریحہ کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوگی۔'' اطل موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ''ہم اس اہم موضوع پر بات کرتے ہوئے نجانے کتنی دور نکل گئے۔'' ''بس مہمانوں کی فہرست میری مرضی سے بنے گی۔ اور میری مرضی کی فہرست میں اس خاندان کا نام نہیں ہے۔ دیٹس آل۔''

وہ گویا اپنا فیصلہ سنا کر تمام مقدمے کو ہی ختم کر گئی تھی۔ وہ بیڈ پر جا کر لیٹ گئی اور لائٹ بند کر لی۔ اختر علی اکیلا ہی کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے دِل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی اپنے پالنے والوں کے بغیر کر رہا تھا۔ پھر اُسے احمد کی شادی کا واقعہ یاد آ گیا۔ اطل نے ان لوگوں کو بے گناہ ہونے کے باوجود بھی چوری کا الزام لگا کر ذلیل و رسوا کیا تھا۔ اُسے اس کڑوی گولی کو نگل ہی لینا چاہیئے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آپا عائشہ اور ابراہیم بھائی کی ذلت ہو۔

☆☆☆

''اگر پہاڑ کو سر کرنے کا ارادہ ہے تو پہلے ذروں کو سر کرنا سیکھو کیونکہ اچھے کام کرنے کیلئے پیسے کی ضرورت کم اور اٹل ارادہ کی زیادہ ضرورت اور اہمیت ہوتی ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پاس پیسہ بہت زیادہ ہے مگر ابھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمہارا ارادہ بھی مضبوط اور پختہ ہے۔'' پروفیسر فائز احمد نے غور سے کندن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خلیل احمد کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ کیونکہ خلیل احمد اس کی دِلی تشنگی بجھانے کیلئے پروفیسر فائز احمد کے پاس لے کر آیا تھا۔ پروفیسر فائز احمد کہیں سے بھی صوفی نہ لگتے تھے۔

عمر کوئی چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی جبکہ وہ پینٹ شرٹ پہنے ہوئے فریش کلین شیو کیئے ہوئے تازہ چہرے کے ساتھ ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے بلکہ وہ کرسی پر اور یہ دونوں ہی نیچے کارپٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کندن ایک نظر ان کو دیکھ کر پہلے تو سمجھا کہ خلیل احمد نے اس کے ساتھ کوئی سنگین مذاق کیا ہے۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس معاملے میں خلیل احمد بہت سنجیدہ اور بہترین مددگار ہے۔ پروفیسر فائز احمد کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ ان کا دُور دُور تک مذہب اور صوفیانہ طرزِ زندگی سے بھی کوئی تعلق ہوگا۔

''میں تو اتنا جانتا ہوں سر!'' کندن نے ہمت کر کے زبان کھولی۔ ''جس کا ارادہ مصمم ہو وہ یا تو زندگی حاصل کرتا ہے یا پھر موت میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں اور یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ میرے والدین اور مذہبی برادری مجھے زندہ نہ چھوڑے گی۔'' خلیل احمد اور فائز احمد اس کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ ''میں نے قرآن حکیم میں پڑھا ہے کہ موت اٹل حقیقت ہے اصل زندگی مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے میں ایسا مرنا چاہتا ہوں کہ مجھے مرنے کے بعد والی زندگی پر رشک آئے۔'' کندن کی آواز میں جوش تھا اور اس کی پلکیں آنسوؤں سے

بھیگ رہی تھیں۔

"بے احتیاطی سے کوئی بات منہ سے نکل جائے تو اس کی تردید ہو جاتی ہے مگر تحریر میں آنے کے بعد وہ ایک سند کا درجہ اختیار کر لیتی ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔" پروفیسر فائز احمد کندن کے اٹل ارادے سے متاثر ہوئے تھے۔ مگر وہ بھی مذاہب اور نسلوں کا ٹکراؤ نہ چاہتے تھے۔ ہندوستان میں اکثریت ہندو مذاہب کی تھی۔ ایک مسلمان کی غلطی سبھی کمیونٹی کو بھگتنا پڑتی تھی۔ فائز احمد تحمل مزاج اور بُردبار آدمی تھے اس سے پہلے اُنہوں نے کئی لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا تھا مگر سارے میں تحمل اور صبر کا مظاہرہ شامل تھا۔

اللہ تعالیٰ نے پروفیسر فائز احمد کو ان کی عبادت وریاضت کا بہت بڑا انعام دیا تھا وہ بغیر ریش کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ ملک کی مشہور یونیورسٹی میں اسلامیات اور عربی پڑھاتے تھے ہر سوال کا جواب بغیر کتاب دیکھے دیتے تھے ساتھ ساتھ کتاب کا نام صفحہ نمبر اور مصنف کے نام بتانا بھی اللہ رب العزت کے انعامات میں سے ایک انعام تھا۔ سادگی اور مردانہ وجاہت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ ان کے طلباء وطالبات دِل کی گہرائیوں سے ان کی عزت کرتے تھے۔ اور پوری دُنیا میں ان کے ہزاروں شاگرد دین اسلام کی خدمت کر رہے تھے۔ اُنہی ہزاروں شاگردوں میں سے خلیل احمد کو بھی ان کے شاگرد خاص ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔

"مذہب اسلام میں نیت کی پاکیزگی اولین شرط ہے۔" وہ پھر کندن سے گویا ہوئے تو وہ ہمہ تن گوش ہو کر ان کی بات سننے لگا۔ "یہ یاد رکھنا کندن دائرہ اسلام میں داخل ہو کر اس سے روگردانی کرنا یا منحرف ہونا دُنیا میں ہی ربِ واحد کے عذاب اور قہر کو آواز دینے کے مترادف ہے۔ میں کل سے پندرہ دِنوں کیلئے آکسفوڈ یونیورسٹی میں لیکچر دینے جا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اچھی طرح سوچ لو کیونکہ تمہاری بات ابھی زبان سے نکلی ہے۔ تحریری طور پر اگر سند ہو گئی تو انحراف مشکل ہوگا۔ ابھی اور کتب کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ مذہب اسلام کو اپنے طریقے سے انتہائی قریب سے جاننے کی کوشش کرو۔ میں تمہارے جذبات اور اٹل ارادہ کی دِل سے قدر کرتا ہوں مگر اسلام زبردستی کا درس نہیں دیتا۔ پندرہ دِنوں میں تمہارے لیئے بہت سے راستے کھلیں گے۔ جو تمہیں واپسی پر بھی مجبور کریں گے اور آگے بڑھنے کے مواقع بھی دیں گے۔ دُکھ، تکالیف اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنا سیکھو کیونکہ میں اللہ کی رحمت سے دیکھ رہا ہوں کہ آنیوالا وقت تمہارے لیئے سہل اور آسان نہ ہوگا۔" وہ سانس لینے کیلئے رُکے اور خلیل احمد کی طرف متوجہ ہوئے۔

"خلیل احمد! اللہ اللہ کرنے سے اللہ نہیں ملتا۔ اپنے دوست کو سمجھا دو کہ یہ راہِ عشق ہے اس پر خاردار راہیں اور کٹھن منازل ہیں۔ دُنیاوی عشق کو پیسے کے تاوان سے سرخرو کیا جا سکتا ہے۔ مگر عشق حقیقی ایسا تاوان مانگتا ہے جو جانوں کے نذرانے دیکر سرخروئی حاصل کیا جاتا ہے۔" خلیل احمد اور کندن ان کی باتوں کی گہرائی کو سمجھ رہے تھے۔ اور پروفیسر کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔

"خلیل احمد! دین اسلام کو زندہ و تابندہ کرنیوالے حقیقی کرداروں سے کندن کو آشنا کرواؤ۔ بتوں اور جہالت کا پرچار کر کے کئی کئی خداؤں کو پوجنے والوں کیلئے جب اسلام کی شمع روشن ہوئی تو اس نور کا ذکر کرو جو رب تعالیٰ نے اپنے نور سے پیدا فرما کر بشری روپ میں ہم لوگوں کی رہنمائی کیلئے بھیجا۔ اس چراغِ عرب کا ذکر کرو جسؐ نے اپنے نور کی روشنی اور چہرے کی تجلیات سے جاہلیت کے اندھیرے کو دور کرنے کیلئے اسلام کی سربلندی اور رب تعالیٰ کی وحدانیت کا پرچار کرنے کیلئے حُبِ الٰہی سے عشق کیا مگر اس کا تاوان......" پروفیسر فائز احمد کی آواز بھرا گئی وہ اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

"اسلام اور ربِ واحد کے دشمنوں نے اُنؐ پر پتھر برسائے۔ گندگی پھینکی، طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ مگر سبحان اللہ پیارے آقاؐ کے پیارے عشق پر صد آفرین اُنؐ کی زبان سے کسی بھی کافر اور دشمن کیلئے کبھی بھی بد دُعا یا سخت الفاظ نہ نکلے تھے۔ اتنا زبردست تاوان...... سبحان اللہ۔ یہ سب کچھ عشق کی سربلندی کیلئے اور رب تعالیٰ کی وحدانیت کی معراج کو بلند رکھنے کیلئے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیںؐ سرخروئی عطا فرمائی ان کا ادا کیا گیا تاوان قبول کیا اور معراجِ عرش سے سرفراز فرمایا۔ کیونکہ۔ خود خداوند کریم بھی عشق مصطفیٰ ﷺ سے سرشار ہے۔ وہ بھی اپنے مطلوب و طالب کی جدائی گوارہ نہ کر سکا۔ بالکل سامنے بٹھا کر کئی راتوں دنوں مہینوں اور سالوں تک اپنے ہی شاہکار کو دیکھتا رہا اور قربان جاؤں اُس طالب و مطلوبؐ کے اپنی ذات اور آل کیلئے کچھ بھی نہ مانگا۔" کندن کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ خلیل احمد اچھی طرح ان باتوں کو جانتا تھا مگر پروفیسر صاحب کا لب ولہجہ عشق مصطفیٰ ﷺ سے سرشار تھا اور حُبِ الٰہی سے لبریز بھی تھا۔

"اسلام کی سربلندی کیلئے نواسہ رسولؐ کے سر مبارک کو نیزے پر لٹکایا گیا۔ اُنہوں نے اپنے نانا جانؐ کے مذہب اور عشق الٰہی کا تاوان اس طرح ادا کیا کہ رب تعالیٰ کو اُن کی ادا پسند آ گئی۔ اور دشمنوں کو تا قیامت سینہ کوبی کرنے کی سزا مل گئی۔ ابراہیم علیہ السلام عشق الٰہی کی خاطر سالوں پر

محیط بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینک دیئے گئے۔ اللہ نے ان کی اس ادا کو پسند کیا اور آگ کو گلنار بنا دیا۔ بلال حبشیؓ امیہ کے غلاموں میں سے تھے۔ ربِ واحد کے عشق کی جوت دل میں جگی تو دشمنوں اور منکرین اسلام نے انہیں گرم ریت پر لٹا کر ان کے پیٹ پر پتھر رکھ دیا مگر عشق کی سربلندی کیلئے منہ سے اُف کہنے کی بجائے۔ اللہ۔ اللہ۔ اللہ کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔ ان کی اس ادا کو رب تعالیٰ نے پسند فرمایا اور انہیں غلامانِ مصطفیٰ ﷺ کی صف میں شامل کر دیا۔ اسلام کے پہلے موذن بنا دیئے گئے۔ اور بلال حبشی کو سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنا دیا۔'' پروفیسر فائز احمد کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا ان کی آنکھوں میں خون کی لالی اتر آئی تھی۔ وہ چند لمحات کیلئے خاموش ہوئے۔

''کندن' صاحب!'' وہ براہِ راست کندن سے مخاطب ہوئے۔ ''ان راہوں پر چلنے سے پہلے تاوانِ عشق ادا کرنے کیلئے تیاری باندھیئے۔ عشق کی منازل طے کر کے اذیت ناک تاوان ادا کرنے والے فرزندانِ اسلام کے قصے سن کر آپکا دل چاہے تو پندرہ دن بعد ہماری ملاقات اسی وقت اور اسی جگہ ہوگی...... اب آپ لوگوں کو اجازت ہے۔''

☆☆☆

بارش تھم چکی تھی مگر جگہ جگہ پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ سڑکوں کے کنارے' گلیوں میں' بس سٹینڈز اور ریلوے کی تمام پٹڑیوں پر بھی پانی نے اپنا ڈیرہ جما لیا تھا۔ مسافروں کو پریشانی ہو رہی تھی کیونکہ موسلا دھار بارش کے بعد بجلی اور مواصلات کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ اپنے اپنے عزیزوں اور احباب کو اطلاع کرنے کیلئے لوگ پریشان تھے۔ صرف موبائل کا سسٹم کام کر رہا تھا جن کے پاس موبائلز فون تھے انہوں نے اپنی روانگی اور آمد کی اطلاع گھر والوں کو کر دی تھی۔ ان کی پریشانی میں قدرے کمی ہو گئی تھی۔

آگرہ کا ریلوے سٹیشن اس وقت مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سمجھوتہ ایکسپریس پاکستانی مسافروں کو لے کر جانے کیلئے ابھی تیار نہ تھی۔ مسافر ادھر اُدھر بیٹھ کر اپنا وقت پاس کر رہے تھے۔ کنٹین والوں کی چاندی ہو رہی تھی۔ قلی صاحبان بھی ٹرین کے چلنے کا انتظار کر رہے تھے تا کہ کوئی ہل جل ہو اور کام دھندہ چلے۔ مگر ہنوز ٹرین پلیٹ فارم پر ہی نہ پہنچی تھی۔ ہلکی ہلکی سردی نے مسافروں کو کوئی نہ کوئی گرم کپڑا بدن پر لپیٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تین گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے۔

مسافر لوگ اس [illegible] سے کافی خائف نظر آتے تھے مگر وہ بھی کیا کرتے بمشکل ہی دونوں ملکوں [illegible] اور پاکستان کے رہنے والے لوگ ایک دوسرے ملک

میں بذریعہ ٹرین اپنے عزیز و اقارب سے مل پائیں۔ اتنا وسائل بھی کافی تھا۔ ٹرینیں کسی بھی ملک کی ہوں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔

بچے رو دھو کر ماؤں کی گود میں سو گئے تھے جو نہیں سوئے تھے وہ پلیٹ فارم کے پکے فرش پر اٹھکیلیاں کر رہے تھے کبھی کبھار کوئی ''سیانا'' اُن کی شرارتوں پر انہیں جھڑک دیتا تو وہ کچھ دیر ٹھہر جاتے اور پھر اپنے کھیل میں مشغول ہو جاتے۔ گویا سیانوں کا سمجھایا یا جھڑکا بیکار ہی جاتا۔

''اٹین شین پلیز'' سبھی مسافروں کے کان کھڑے ہو گئے۔ ''پاکستان جانیوالی سمجھوتہ ایکسپریس پندرہ منٹ بعد پلیٹ فارم نمبر تین پر آ رہی ہے۔'' یہ اعلان دوبارہ دہرایا گیا تو مسافروں کا جوش دیدنی تھا۔ ہر کوئی نئے سرے سے اپنے بندھے ہوئے سامان کو دوبارہ باندھنے لگا۔ بوڑھوں نے بھی اس طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا جس طرف سے ٹرین آنیوالی تھی۔ عورتیں اور بچے بھی پاکستان جانے کی خوشی چہروں پر سجائے ٹرین کے انتظار میں کھڑے ہو گئے تھے اور پھر حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب ٹرین واقعی ٹھیک پندرہ منٹ بعد پلیٹ فارم نمبر تین پر گھنٹیاں بجاتی ہوئی پہنچ گئی۔ اگرچہ ہر کسی کی سیٹ بکنگ کے مطابق ریزرو تھی مگر ہر کوئی پہلے چڑھنے کی تگ و دو میں تھا۔

تقریباً آدھ گھنٹہ میں پلیٹ فارم پر بیٹھے مسافر ٹرین کی مختلف بوگیوں میں سما چکے تھے۔ اب صرف انہیں رخصت کرنے والے ہی رہ گئے تھے۔ مختلف نصیحتیں' پیار بھری باتیں' اداس اور غمگین لہجے' پریشان اور خوشحال چہرے دوبارہ ملنے کے وعدوں پر ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ پیاروں کے بچھڑنے پر پیارے رو رہے تھے۔ دل کی اداسی کو آنکھوں کے رستے بہہ جانیوالے ساون کا خراج پیش کر رہے تھے۔ ٹرین نے روانگی کا پہلا وسل بجایا تو بوگیوں کے اندر کھڑے رخصت کرنے والے باہر کی جانب جبکہ کھڑے اندر کی جانب لپکے تو عجیب ہی منظر تھا۔ یہ سلسلہ پانچ سات منٹ تک چلتا رہا پھر ٹرین نے روانگی کا تیسرا اور آخری وسل دیا تو اندر سے اور باہر سے الوداعی ملاقات کیلئے دائیں ہاتھ ٹاٹا کے انداز میں ہلنے لگے۔

گاڑی پلیٹ فارم پر سانپ کی مانند رینگنے لگی تو بہت سے لوگ کھڑکیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافروں کو الوداعی باتیں کرنے کیلئے ساتھ ساتھ بھاگنے لگے۔ ایسا عمل خطرناک بھی ہو سکتا تھا مگر جب گاڑی نے رفتار پکڑی تو بھاگنے والے کئی باتیں دل میں لیئے ہی ہانپنے لگے اور گاڑی کا ساتھ نہ دے سکے۔ گاڑی ریلوے اسٹیشن سے نکل کر آنکھوں سے اوجھل ہوئی تو مسافروں کو رخصت کرنے والے بھی آہستہ آہستہ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ یوں چند گھنٹے پہلے جو سٹیشن

مسافروں سے بھرا پڑا تھا لمحوں میں ہی خالی ہو گیا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے مسافروں کو ٹرین کی کھڑکیاں بند کرنے پر مجبور کر دیا تھا ٹرین کے آخری چار ڈبے جو کہ اکانومی کلاس پر محیط تھے ان میں رش زیادہ تھا ان بوگیوں کے آخر میں ایک بوگی ایسی بھی تھی جس میں کیمیکل کے چند ڈرم رکھے ہوئے تھے اور پھر آخر میں گارڈ کا ڈبہ تھا جو فی الحال خالی تھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ کچھ مسافر تو بیٹھے بیٹھے ہی اونگھنے لگے اور کچھ ساتھ لایا ہوا کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ دو گھنٹوں سے زیادہ کا وقت بیت گیا تھا ٹرین ابھی انڈیا میں ہی مختلف ریلوے سٹیشن کراس کرتی ہوئی وسل بجاتی ہوئی خوشی سے بھاگتی جا رہی تھی مگر......؟

تقدیر کے بہت سے فیصلے ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم قبول کرنا نہیں چاہتے یا پھر قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کاتب تقدیر نے جب دُنیا کو بنایا تو فرشتوں نے پوچھا۔ ''یا باری تعالیٰ اتنے لوگ اس زمین پر کیسے سمائیں گے؟'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ''میں موت کو پیدا کروں گا جو ان کی کمی میں کردار ادا کرے گی۔'' پھر عرض کی ''یا پروردگار اس طرح تو مرنے والے کے لواحقین کہیں گے کہ اللہ نے ان سب کو موت دے دی۔'' فرمایا۔ ''میں موت کو بلاوجہ ہی نہیں بھیجوں گا۔ ساتھ ایسا بہانہ ہوگا کہ لوگ کہیں گے ایسا ہوگا ان کی موت یا فلاں شخص کی موت اس وجہ سے ہوئی ہے کاش وہ یہ نہ کرتا۔ وہ وہاں نہ جاتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ فرشتے رب جلیل کی باتیں اور حکمت سن کر خاموش ہو گئے۔ عزرائیل علیہ السلام کو ملک الموت کا روپ دے دیا گیا اور موت کا ذمہ دار خدا نے انسان کو ہی بنایا۔

ہوا یوں کہ کیمیکل رکھی گئی بوگی میں چند شرپسند جو کیمیکل کے مالکوں کے رُوپ میں سوار تھے اُنہوں نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ اپنے جسموں کے گرد فوم اور گدوں کی وردیاں باندھ لیں۔ کیمیکل کے ڈرموں کا ڈھکن اتار کر ان کو تھوڑا سا ٹیڑھا کر دیا نتیجہ کیمیکل گرنا شروع ہو گیا۔ ایک مخصوص جگہ پر ٹرین کی رفتار آہستہ ہونا طے پایا تھا وہ مقام آ گیا تھا چند کلومیٹر کا ٹوٹا ٹرین نے ایسے طے کیا کہ آدمی تیز بھاگ کر اُسے پکڑ سکتا تھا یا پھر باآسانی آہستگی سے اس سے اتر سکتا تھا۔ یہ سب کچھ طے شدہ پلان تھا اس میں ڈرائیور سمیت اس شفٹ کے عملہ کا بہت بڑا کردار تھا۔

ایک مسافر دروازے میں کھڑا سموکنگ کر رہا تھا اندر ہوا کی ٹھنڈک نے پوری بوگی کا ماحول ٹھنڈا کر دیا تھا کہ ایک اور نوجوان اُٹھ کر اس آدمی کو دروازہ بند کرنے اور ٹرین کی رفتار انتہائی کم

ہونے پر تبصرہ کرنے کیلئے پہنچا تو دروازے میں کھڑے آدمی نے دروازے سے باہر لٹک کر آہستگی سے پائیدان چھوڑا اور پٹڑی پر دور تک بھاگتا گیا۔ کھڑکیوں میں بیٹھے مسافروں نے حیرت و پریشانی سے اُسے دیکھا مگر ٹرین کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہو گئی۔

اس دوران کیمیکل گرا کر اُسے آگ دِکھانے والے شرپسند بھی ٹرین سے کود چکے تھے اب ٹرین کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تھی مسافروں کو ڈرائیور کی اس منطق کی سمجھ نہ آئی۔

''پیچھے سے پٹڑی خراب ہوگی۔'' ایک بڑے میاں بولے۔ ان کی بات کے جواب میں نوجوان جو دروازہ بند کر کے آیا تھا غصے سے بولا۔ ''پٹڑی خراب نہیں تھی بلکہ حرامخوروں نے اپنے رشتہ داروں کو اتارنا تھا۔ میں نے خود دیکھا ہے ایک آدمی کو ٹرین سے اترتے ہوئے۔'' اس کی بات سن کر ایک بنگالی بابو بھی بول پڑا جو چار پانچ سیٹیں چھوڑ کر کھڑکی کی طرف بیٹھا ہوا تھا۔

''اڑے بھائی ہم نے بھی دیکھا کہ چند مسافر اُترا ہے۔'' اس کی بات نے بھی مسافروں کو وقتی طور پر تو پریشان کر دیا مگر کئی لمحات سکون عافیت سے گزر گئے تو حکم ربی سے بھی مسافر اپنے اپنے کام دفعل میں مصروف ہو گئے۔

آگ نے کیمیکل والے ڈبے سے آگے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تھا حالانکہ تیز ہوا کی وجہ سے آگ کا رُخ پیچھے کی جانب ہونا چاہئے تھا مگر کیمیکل کا بہاؤ اگلی بوگی کی جانب تھا۔ ایسا ہی کچھ تین بوگیاں چھوڑ کر اگلی بوگی میں بھی کیا گیا تھا اس میں کیمیکل کے پلاسٹک کے کین رکھے گئے تھے جن کو آگ لگا کر اترنے والے اتر چکے تھے گاڑی کی تیز رفتاری نے آگ کو مزید بھڑکنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ پورے جوبن پر پہنچ گئی تو کئی مسافروں کی نگاہ آگے اور پیچھے بوگی پر پڑی جو آگ کی لپیٹ میں شعلوں کا کفن اوڑھ کر بُری طرح جل رہی تھیں۔ مسافروں کا شور برپا ہو گیا تھا ہر کوئی آگ آگ پکار رہا تھا۔ مرد و عورتیں بُری طرح رونے لگے تھے کئی لوگوں نے کھڑکیوں سے باہر جھانکا مگر ان کے آگے بھی لوہے کی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو جگانا شروع کر دیا تھا۔ ہر طرف ایک بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ بہت سے ضعیف اور بچے بھگدڑ میں پاؤں تلے آ کر کچلے جا چکے تھے۔ ٹرین کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی تھی آگ نے ایک بوگی کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا دروازوں کے سامنے بہت سا وزنی سامان پڑا ہوا تھا۔ دروازے بھی کھولنا ناممکن تھا۔ جبکہ کھڑکیوں سے کودنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ ہر مسافر پریشانی کے عالم میں افراتفری کی دوڑ میں شامل تھا بعض لوگوں نے موبائلز پر ریلوے کے ہیڈ

کوارٹرز میں رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر یہ ایسا علاقہ تھا کہ جہاں کسی بھی سیلولر کمپنی کا کوئی ٹاور دُور دُور تک نہ تھا۔ ماؤں نے موت کو قریب آتے دیکھ کر اپنے لختِ جگروں کو سینوں سے چمٹا لیا تھا۔ دُکھ اور کرب کی پکاریں ہر طرف سے بلند ہو رہی تھیں۔ پہلی بوگی کے تمام مسافر زندہ جل گئے تھے۔ مگر آگ کی تشنگی نہ بجھی تھی۔ کیمیکل بہت تیزی سے پھیل رہا تھا اور آگ کی لکیریں ایک اژدھے کی طرح اپنا منہ کھولے زندہ انسانوں کو نگلنے کیلئے بے چینی اور بے قراری سے آگے بڑھ رہی تھیں۔

دھڑا دھڑ جلنے والی بوگی سے گوشت کے جلنے کی بُو نے پوری ٹرین کے مسافروں کو پریشان کر دیا۔ بے حال اور چیخ و پکار کرنے والے نڈھال ہو کر لحہ بہ لحہ اپنی طرف بڑھنے والی موت کو دہشتناک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ٹرین کی رفتار غیر معمولی حد تک تیز تھی جبکہ ٹرین کو لگنے والی آگ کے شعلے ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ مگر ڈرائیور کو لگتا تھا کہ کسی بات کی پرواہ نہیں ہے وہ بہرا ہو گیا تھا اس کے کانوں تک کسی معصوم بچے کی دلخراش چیخ نہ پہنچ پا رہی تھی۔ کسی ماں کے کلیجے پر لگنے والا پھٹ نظر نہ آ رہا تھا۔ بزرگوں اور نوجوانوں کی لحہ بہ لحہ دم توڑتی آہیں سنائی نہ دے رہی تھیں وہ اپنا ''فرض'' پورا کرنے میں بڑی تندہی سے جُتا ہوا تھا۔

آگے جانے والی بوگیوں کے مسافروں نے بھی آگ کے شعلوں کو دیکھ لیا تھا۔ بہتوں نے دروازے کھول کر اجاڑ اور ویران جنگل میں چھلانگیں لگا دی تھیں اُن کی چیخیں ہوا میں ہی دم توڑ گئی تھیں۔ جو جل کر مرنے سے ڈر گئے تھے وہ بے پناہ رفتار کی وجہ سے اندھی چھلانگیں لگانے کے بعد ہڈی پسلی دماغ اور جسم کے دوسرے حصے بُری طرح متاثر ہونے سے مر گئے تھے۔

بالآخر آگ کی پیاس بوگی کے آخری مسافر کو جلا کر بجھ گئی کیونکہ تمام کیمیکل جل گیا تھا۔ آگ بجھ گئی تھی۔ کیمیکل ختم ہو گیا تھا۔ ٹرین رک گئی تھی۔ مسافر بُری طرح جھلس کر اپنے چہروں اور جسموں کی پہچان کے ساتھ ساتھ اپنے ساز و سامان کی بھی پہچان کھو چکے تھے۔ جو زندہ بچ گئے تھے ان کیلئے مزید عذاب تیار تھا۔ وہ تمام عمر کیلئے کسی نہ کسی طرح اپاہج ہو گئے تھے۔ ان کے پیارے ناگہانی آگ میں جل گئے تھے۔

گاڑی کا ڈرائیور فرار ہو چکا تھا۔ لوگ زخمیوں کی امداد کرنے کیلئے دیوانہ وار لپکے تھے مگر کسی کا بھی سامان نہ نکالا جا سکا ٹوٹی ٹانگوں' جلے چہرے' زخمی ہاتھوں پاؤں والے چند مسافر بچائے گئے تھے مگر وہ بھی خوفناک اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ٹرین کے جلے ہوئے ڈبوں کو دیکھے جا رہے

تھے۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ آگ کیسے لگی۔ ہر کوئی محکمۂ ریلوے کو کوس رہا تھا۔ مگر پھر شیطان نے کام دکھایا کسی نے چلا کر کہا کہ آگ ہندوؤں نے لگائی ہے۔ مگر فوراً دوسری چیخ سنائی دی نہیں نہیں وہ مسلمان تھے میں نے ان کے ہاتھوں میں تسبیحاں دیکھی تھیں۔

ٹرین ایک چھوٹے سے سٹیشن پر کھڑی تھی۔ ہر طرف چیخ پکار تھی۔ بچ جانے والے مسافر ربِ واحد کی ثنا میں مصروف ہو گئے تھے مگر اشکبار آنکھیں اور دہل جانے والے دِلوں کو اطمینان نہ مل رہا تھا کیونکہ وہ ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔ تمام منظر ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ آنکھوں نے یہ دہشتناک اور دل لرزا دینے والا منظر دیکھ کر دِل کو خبردار کیا تھا کہ ''کوئی بھی منظر کائنات میں کربلا کے بعد اس سے زیادہ دہشتناک نہیں ہوگا۔'' دِل نے آنکھوں کی گواہی مان لی تھی اور اس منظر کو سہہ گیا تھا۔

مگر ہر مسافر زندہ دل نہ تھا کئی موقع پر ہی زندگی کا اس طرح بے وفائی کر جانا دیکھ کر زندگی ہار گئے تھے بہت سے مسافر بے ہوش گئے تھے۔ جل کر مرنے والے کوئلوں کی صورت میں اپنی اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے جبکہ زخمی ہونے والے آہ و زاریاں کر رہے تھے۔ اُنہیں اپنے زخموں کی پرواہ نہ تھی۔ بس پیاروں کو ترسی ہوئی نگاہیں تلاش کر رہی تھیں۔ کان اپنے معصوم بچوں کی آوازیں اور قلقاریاں سننے کو بے تاب تھے۔ دِل دھڑک دھڑک کر ساتھیوں کو تلاش کر رہے تھے مگر جب کچھ بھی نہ بن پڑا۔ کوئی میٹھی اور شیرینی گھولنے والی سماعتوں سے آواز نہ ٹکرائی۔ آنکھوں نے پیاروں کو نہ دیکھا۔ دل کی دھڑکنوں نے دوسری طرف سے دھڑکنوں کا کوئی رسپانس نہ پایا تو پھر ایسی چیخ و پکار شروع ہوئی کہ زمین لرزنے لگی۔ آسمان کانپنے لگا۔ شجر و حجر سوگ میں ڈوب گئے۔

ٹرین میں آگ لگنے کی اطلاع ہندوستانی گورنمنٹ اور پاکستانی گورنمنٹ کو کر دی گئی تھی۔ میڈیا کے لوگوں کو زمین نے اگلنا شروع کر دیا تھا۔ براہِ راست کوریج نے دونوں ملکوں کی حکومتوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مگر ابھی تک کسی بھی گورنمنٹ نے کوئی طبی امداد کا بندوبست نہ کیا تھا۔

کوئی دیوانی ماں اپنے بچے کا نام پکارتی ہوئی پلیٹ فارم پر ادھر سے اُدھر بھاگتی پھر رہی تھی۔ اس کے بین سن کر میڈیا کے لوگوں کی آنکھیں بھی برسنے لگی تھیں۔ وہ دیوانہ وار جلنے والی بوگیوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر تمام لوگوں اور پوری دنیا نے میڈیا کے ذریعے دیکھا وہ غش کھا کر گر پڑی اور کبھی نہ اُٹھ سکی۔

☆☆☆

آمنہ نے علی گارمنٹس کو جوائن کر لیا تھا۔ آج اس کی جاب کا تیسرا دن تھا وہ اپنے آفس میں جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ مینیجر احمد صاحب کی سیکرٹری نے اُسے بتا دیا تھا کہ بہت جلد اُسے کام سمجھا دیا جائے گا۔ بینکوں سے لین دین اور انٹرنیشنل لیول پر تمام پارٹیوں سے آمنہ نے ہی ڈیل کرنا تھی۔ مگر ابھی تک تو اُسے کوئی بھی کام نہ بتایا گیا تھا۔ اور پھر تین دن سے احمد صاحب بھی نظر نہ آئے تھے وہ اخبار پڑھتی رہتی یا پھر کمپیوٹر پر علی گارمنٹس کی کارکردگی کا جائزہ لیتی رہتی تھی۔ کم عرصہ میں ہی اس فرم نے دُنیا بھر میں اپنی پہچان بنائی تھی۔

آج تیسرا دن تھا احمد نے اُسے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ سیکرٹری نے جب آ کر کہا کہ اُسے سر بلا رہے ہیں تو وہ پہلے تو حیرانگی سے اس کا منہ دیکھتی رہی کیونکہ اُسے خبر ہی نہ ہوئی تھی کہ کب احمد اس کے آفس کے سامنے سے گزر کر اپنے آفس میں چلا گیا تھا۔ وہ کمپیوٹر پر فرم کی کارکردگی چیک کرنے میں اتنی محو تھی کہ اُسے خبر نہ ہوئی۔

''مے آئی کم ان سر!؟'' آمنہ کی آواز شائد احمد تک نہ پہنچی تھی کیونکہ وہ کرسی پر بیٹھا بیرونی دروازے کی طرف پشت کیئے ہوئے تھا۔ آمنہ اندر داخل ہو کر ٹیبل کے قریب پہنچ گئی تو اُس نے احمد کو ایک بار پھر پُکارا۔

''آپ نے مجھے بلایا سر!؟'' احمد کا چونک جانا لازمی امر تھا کیونکہ وہ نجانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا اُسے بھی آمنہ کے اندر آنے کی خبر نہ ہو سکی! آمنہ سے اس کے چہرے کی سوگواری چھپی نہ رہ سکی مگر وہ ''باس'' سے کچھ بھی نہ پوچھ سکتی تھی کیونکہ یہ اس کی جاب کا تیسرا دن اور باس سے پہلی ملاقات تھی جس میں وہ بطور ورکر شامل تھی۔ ''تشریف رکھیئے۔'' احمد کا لہجہ بھی اداسی کا پیرہن اوڑھے ہوئے تھا۔

''مس آمنہ!'' احمد نے کہنا شروع کیا تو آمنہ ہمہ تن گوش ہو کر احمد کی طرف دیکھنے لگی جو ٹیبل پر رکھے ہوئے پیپر ویٹ سے کھیلنے میں مصروف تھا۔ مگر آمنہ جان گئی تھی کہ اب اس سے با قاعدہ کام لیا جائے گا۔ اور وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ جو تنخواہ لینے جا رہی ہے اس کا کام بھی کرنا چاہیئے۔ احمد نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''جب سے آپ نے اس فیکٹری کو جوائن کیا ہے...... اتفاق ہے کہ میری آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔'' احمد اب کاروباری بن گیا تھا اس کے چہرے سے اداسی اور سوگواری کی چادر اتر گئی تھی۔ ''میں سسٹر کی شادی میں مصروف تھا۔ آئی ایم

سوری کہ آپ کو انوائٹ نہیں کر سکتا تھا۔''

''اٹز او کے سر!'' Its Ok Sir آمنہ اب کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔

''سستی اور کاہلی کے ساتھ مفلسی لازمی ہے کیونکہ مفلسی آزادی کی قاتل ہے۔ میں نے اس فرم میں جتنے بھی کاریگر یا عملہ کے لوگ رکھے ہیں وہ سب اپنا اپنا کام محنت اور دیانتداری کے ساتھ ساتھ چالاکی اور چُستی سے کرتے ہیں۔'' آمنہ احمد کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ مگر اس بات کی منتظر رہی کہ باس آگے کیا فرمانے والے ہیں۔

''میں جب آفس میں داخل ہوا تو سارا اسٹاف اپنے اپنے کاموں میں مگن تھا مگر احتراماً سبھی نے اُٹھ کر مجھے سلام کیا اور میں ان کے سلام کا جواب دیتا ہوا جب آپ کے کیبن تک پہنچا تو آپ کو کمپیوٹر میں محو پایا۔'' آمنہ نے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ فوراً بول پڑا۔

''میں نے آپ کو اتنے قریب سے دیکھا...... میرا مطلب ہے کہ میں نے پاس سے دیکھا تو آپ فرم کی کارکردگی رپورٹس ملاحظہ فرما رہی تھیں۔ آپ کو فرم کے کام میں اتنی محویت سے کھویا ہوا دیکھ کر مجھے اپنی پسند پر فخر ہوا۔''

آمنہ اس کے آخری الفاظ پر چونک کر رہ گئی اور احمد کو بھی احساس ہو گیا کہ کچھ غلط کہہ گیا ہے۔ وہ کھسیانا سا ہو کر دوبارہ بولا۔ ''یعنی کہ اپنی سلیکشن پر مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں نے علی گارمنٹس کیلئے آپ کو صحیح چنا ہے۔'' آمنہ کی بھی جان میں جان آئی۔ اس کی محویت نے باس کو متاثر کیا تھا اور وہ یہی چاہتی تھی کہ اس کی محنت اور کارکردگی سے علی گارمنٹس مزید ترقی کرے۔

''تھینکیو سر!'' وہ اتنا کہنے کے بعد خاموش ہوئی تو احمد اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا جس پر وہ ٹپٹائی۔ ''پاگل ہو گیا ہے۔'' یہ آمنہ کے دِل کی آواز تھی وہ لبوں سے باہر نہ آ سکی۔ اور جب احمد کی محویت نہ ٹوٹی تو وہ بے ساختہ کہہ اُٹھی:۔

''میرے لیئے کیا حکم ہے سر!؟'' احمد پھر چونک کر کھسیا گیا اور اپنی خفت مٹانے کیلئے مناسب الفاظ ڈھونڈنے لگا۔ ''کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جنہیں ایک نظر دیکھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ان سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔''

''میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی سر!'' اس نے ہمت کی اور کہہ ڈالا۔ ''یہ فریب نظر ہوتا ہے۔ جس طرح ایک ہی نام بہت سے انسانوں کا ہوتا ہے مگر اس نام کے ساتھ جُڑے ہوئے رشتے اور جذبات ہر انسان کے لیئے نہیں ہوتے بالکل اسی طرح چہرے بھی چہروں جیسے ہی ہوتے ہیں۔

دِل کی آواز پر ان سے فریب نہیں کھانا چاہیئے۔" آمنہ نے اپنے الفاظ اس انداز میں ادا کیئے تھے کہ اس کے اندر کے کتھارسس کو کچھ سکون ملا تھا۔ مگر اس کے شاندار جواب پر احمد اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"میں آپ کی قابلیت کا اعتراف کرتا ہوں مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ مصیبت کی جڑ انسان کی گفتگو ہے۔ کسی بھی موضوع پر دو انسان گفتگو کریں تو ایک دوسرے کی مخالفت ضرور کریں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں جس نظر سے اس دُنیا کو دیکھتا ہوں دوسرا نہ دیکھتا ہو۔" ایک بار پھر اس کے لہجہ میں اداسی عود آئی اس نے پہلی ہی بار آمنہ کی پہلی ہی بات پر ہار ماننے کا اعلان کر دیا تھا۔

"بہر حال: کل کچھ فارنرز آ رہے ہیں اُنہیں سیمپل وغیرہ چیک کروا کے ان کے ساتھ جو بھی ڈیل ہو وہ آپ کریں گی۔ میں بھی اس میٹنگ میں ہونگا مگر کسی بھی قسم کا ریسپانس نہ دے سکوں گا کیونکہ یہ آپکا ٹیسٹ بھی ہوگا اور آپ کیلئے مستقبل روشن کرنے کا امکان بھی۔" وہ اپنی کرسی سے اُٹھتا ہوا بولا۔

"اجازت سر!" آمنہ بھی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "میں فرم کے معیار پر پورا اترنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔" اُس کے اس فقرے نے احمد کو ہلا کر رکھ دیا تھا اس نے لفظ کوشش کی بجائے اپنا پر اعتماد فقرہ کہا تھا اُسے اپنے آپ پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ ہر قسم کی فارنرز پارٹی کو فرم کی کارکردگی اور پروڈکشن سے قائل کرنے کی خوب صلاحیت رکھتی ہے۔ "ویری گڈ" احمد کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔ وہ اس کے آفس سے باہر آ گئی تھی۔

☆☆☆

فریحہ کی شادی بڑے احسن طریقے سے انجام پائی تھی۔ دانیال فریحہ کا کلاس فیلو تھا اور یہ شادی فریحہ کی پسند سے ہوئی تھی۔ احتل اور اختر علی کو کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ دانیال والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اور باپ کے تعمیراتی کام میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ ان کی تعمیرات کی بہت بڑی کنسٹرکشن فرم تھی بہت سے انجینئر اور تعمیراتی ماہران کی فرم کے تحت کام کرتے تھے اور ملک میں ان کی فرم کا بہت نام تھا۔

دونوں گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ تھا اس لیئے ہر کام بخوبی خیر و عافیت انجام پایا تھا۔ احتل کے تو پاؤں ہی زمین پر نہ ٹک رہے تھے کیونکہ دانیال نے اُنہیں "ممی جی۔ ممی جی" کہہ کر سر پر بٹھا لیا تھا۔ جبکہ اختر علی آپا عائشہ اور بھائی ابراہیم کو مدعو نہ کرنے پر خود سے شرمسار تھا شادی کو ایک ماہ

گزر چکا تھا گھر میں ہر طرف خوشیاں رقصاں تھیں۔

عاصم اور احمد اپنے اپنے طور پر بزنس کو پروان چڑھانے میں مصروف تھے گھر میں دو ایک بار احمد کی شادی کا تذکرہ چھڑا مگر اس نے سخت الفاظ میں انکار کر دیا تھا۔ اختر علی نے اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

احمد کی دلچسپی آمنہ میں نامعلوم حد تک بڑھ گئی تھی وہ بہانے بہانے سے آمنہ کو اپنے آفس بلا لیتا تھا اور کبھی راؤنڈ لگانے کے بہانے سب کے آفسز کا دورہ کرتا تو کافی وقت آمنہ کے آفس میں صرف ہو جاتا بظاہر تو گفتگو کاروبار کے موضوع پر ہی ہوتی تھی مگر دل کی بھڑاس دونوں ہی الفاظ کا پیرہن اوڑھ کر نکال لیتے تھے اب بھی وہ دونوں احمد کے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے اور آمنہ فائل سے اُسے کچھ کاروباری پارٹیوں کے متعلق بتا رہی تھی۔ مگر احمد کی توجہ اس کے سراپا کی طرف مبذول تھی۔ اس کی نگاہیں آمنہ کے خوبصورت چہرے کا طواف کر کے اپنے دِل کو سکون اور فرحت کا سامان مہیا کر رہی تھیں۔

یہی بات آمنہ نے بھی محسوس کی تھی مگر وہ کسی بھی غلط فہمی کا شکار نہ ہونا چاہتی تھی اس نے ہمیشہ کی طرح احمد کی محبت بھری نظروں کو نظر انداز کیا اور احمد کو بریفنگ دینے میں مصروف ہوگئی۔

"اب میں جاؤں سر!؟" آمنہ کے پوچھنے پر احمد کو جیسے ہوش آ گیا تھا وہ گلا کھنکار کر اپنی خفت مٹاتے ہوئے بولا۔ "نہیں آپ پلیز تشریف رکھیئے۔" آمنہ اس کے سیدھے انکار پر استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے فون اُٹھا کر سیکریٹری کو دو کپ اچھی سی کافی بھیجنے کو کہا تو آمنہ سمجھ گئی کہ اب کافی وقت "ضائع" ہوگیا۔ "میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ نے بہت کم عرصہ میں ہی اپنی محنت اور لگن سے فرم کا بہت سا کام سنبھالا ہوا ہے۔" وہ پر سکون اور ٹھہرے ہوئے لہجہ میں گفتگو کر رہا تھا۔ "بس آمنہ! میں آپ کو اتنا ہی جانتا ہوں کہ آپ میری فرم کی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی جیسی حیثیت اختیار کر چکی ہیں...... مگر کبھی کبھار ایسا لگتا ہے کہ جو آپ کی ضرورت بن رہا ہے وہ آپ کی پہنچ سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ خوشحالی ایک غریب کے دروازے سے۔"

"میں اتنا جانتی ہوں سر!" آمنہ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "جو کسی کی بھلائی کرنے کا ارادہ کرتا ہے وہ اپنی بھلائی پہلے ہی کر چکا ہوتا ہے۔" فقرہ تو محض وقت گزاری تھا مگر آمنہ کا دیکھنا احمد کو دل تک لرزا گیا تھا۔ وہ آنکھوں کے کٹوروں کو نہیں بھلا سکے گا جو

اس جھیل کی مانند گہرے تھے جن میں چاندنی اپنی کرنوں سے دور تک جھانکنے کی کوشش میں تھک جاتی ہوگی۔ ہرنی نے وہ آنکھیں یقیناً نہیں دیکھی ہونگی ورنہ لوگ اس کی نہیں بلکہ آمنہ کی آنکھوں کی مثال دیا کرتے۔ یہی حال آمنہ کا بھی ہوا تھا۔ خنک موسم اور آفس کے صاف ستھرے ماحول میں بھی اُسے محسوس ہو گیا تھا کہ وہ پسینہ سے شرابور ہونے والی ہے احمد کی آنکھوں میں جھانکنے سے پہلے اس کے چٹانوں کی طرح مضبوط اعصاب اور فولاد جیسے مضبوط اور نا قابل تسخیر ارادے ریزہ ریزہ ہونے لگے تھے۔

وہ محسوس کر سکتی تھی کہ اس کے ارادوں کی کنکریاں پسینے کے قطروں کی شکل میں اس کی پیشانی پر نمودار ہو گئی تھیں۔

ملازم کافی رکھ کر جا چکا تھا ٹھنڈی کافی آمنہ کو پسند نہ تھی مگر اخلاقیات کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ اپنا مگ احمد سے پہلے پکڑ کر ہونٹوں کو نہ لگا سکتی تھی۔

''بیداری ضمیر کی آواز ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جو بیدار نہیں ہے اس سے ہر کوئی فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔'' احمد نے کافی کا مگ پکڑ کر آمنہ کو بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی مگ پکڑ لے۔ آمنہ نے دل میں ہی شکر کیا کیونکہ گرم کافی غذا اور ٹھنڈی کافی دوا بن جاتی ہے۔

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی سر!؟'' آمنہ نے گرم کافی کا سپ لیتے ہوئے کہا تو احمد کے لبوں پر مسکان پھیل گئی۔ ''مس آمنہ! میں جب آپ کا انٹرویو کر رہا تھا تو مجھے میرے ضمیر نے بیدار کیا کہ جاگ جاؤ یہی وہ امیدوار ہے جو تمہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے۔''

''جی؟'' حیرت زدہ انداز میں آمنہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''غلط نہ سمجھنا۔'' وہ دفاعی انداز میں مسکراتا ہوا بولا۔ ''میری مراد فرم سے تھی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میں کسی تجربہ کار کو یہ موقع دیتا اور وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر علی ٹیکسٹائل یا علی گارمنٹس کو نقصان پہنچا دیتا۔''

''آپ مجھ سے کیا امید کرتے ہیں؟'' مزے دار کافی اور مزیدار باتیں اچھا اور پرسکون ماحول دل کو فرحت بخش رہا تھا۔ ''سب سے بڑا بیوقوف وہ ہوتا ہے جو زندگی گزارنے کیلئے زندگی کے محرکات کو سمجھ نہ پائے۔''

''مگر زندگی تو ایک دھوکا ہے۔ بیوفائی اس کی ایک ایک نس میں بسی ہے۔ نجانے کب' کہاں اور کیوں روٹھ جائے۔'' احمد بات کی گہرائی کو سمجھ کر سر دھننے لگا۔ مگر بات جاری رکھنا ضروری امر تھا۔

''اگر کسی جذبے یا احساس کو زندگی مان لیا جائے تو پھر انسان اس کی حفاظت اور لمبی عمر کیلئے تقدیر سے بھی لڑ جاتا ہے۔''

احمد دِل کی بات کہتے کہتے رہ گیا تھا وہ اپنے الفاظ کو شروع میں ہی بدل گیا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ آمنہ نام نے میری نیندیں اڑا کر رکھ دی ہیں مگر ابھی دیر ہی کتنی ہوئی تھی کچھ ہی تو دن گزرے ہو نگے۔ دوسری طرف آمنہ بھی اس کے منہ سے اپنے لیئے کچھ نہ کچھ سننے کو بے تاب تھی۔ بچپن سے لیکر جوانی کی قیامت خیزی تک اس نے احمد نام کو دِل کی دھڑکنوں میں بسایا ہوا تھا۔ پوجا کی حد تک اس نام سے عقیدت کی تھی۔ اس کا بچپن تو احمد سے کھیلتے ہوئے نہ گزرا تھا مگر بچپن میں اس کی شرارتیں اور باتیں عائشہ بی بی سے سن سن کر محظوظ ہوا کرتی تھی۔

''تقدیر سے لڑنے سے پہلے انسان کو اس سماج کے قوانین سے لڑنے کی شناسائی ہونی چاہیئے۔'' آمنہ اپنی کافی ختم کر چکی تھی۔ ''احساسات اور جذبات کو دِلوں میں پالنا اچھی بات ہے مگر سر!'' احمد اس کی طرف بغور دیکھنے لگا۔

''مگر جب جذبات دِلوں میں پل کر جوان ہو جاتے ہیں تو ان کی حفاظت اور پرورش کے لیئے دِن کا چین اور راتوں کی نیندیں بھینٹ کرنی پڑتی ہیں۔'' احمد بہت گہری بات کی توقع نہ کر رہا تھا مگر آمنہ تو ہر بات دِل کی دھڑکنوں کو ڈسٹرب کرنے والی کر رہی تھی۔

''بہت کرب اور تکلیف دہ مراحل سے گزر کر جذبات کی قربانی کو سرخرو کیا جاتا ہے۔'' آمنہ اُٹھتی ہوئی بولی مگر احمد کو اس بات کے بھی خیال نہ رہا کہ وہ آفس سے باہر جا چکی تھی۔ وہ ایک ٹھنڈی آہ لے کر کافی کا آخری گھونٹ پینے لگا جو کہ دوا بن گیا تھا۔

ایک ہفتہ بعد ایک ملازم نے آمنہ کو آفس میں ایک پارسل تھماتے ہوئے کہا کہ ڈاکیا آپ کے نام پر دے گیا ہے۔ وہ حیرانگی سے پارسل کو دیکھتی رہی اس کے فیکٹری ایڈریس کا تو کسی کو بھی معلوم نہ تھا اور پھر اس کی کوئی دوست یا پھر کوئی کلاس فیلو بھی ایسی نہ تھی جو اُسے فیکٹری کے پتہ پر کوئی چیز بھیجتی۔

وہ پارسل کو کھولنا ہی چاہتی تھی کہ احمد فیکٹری میں داخل ہوا سبھی عملہ احتراماً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آمنہ بھی کھڑی ہو گئی وہ باوقار انداز میں چلتا ہوا سب کے سلام کا جواب دے رہا تھا اس نے چیک دار شرٹ کے ساتھ بلیو کلر کی ٹائی لگا کر قیمتی سوٹ پہنا ہوا تھا آمنہ تو پلکیں جھپکنا ہی بھول گئی تھی وہ آمنہ کے آفس کے باہر کھڑا تھا اور اندر سے شیشے کے پار آمنہ محویت سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ

چند سیکنڈ کھڑا ہونے کے بعد اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

سبھی لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ چکے تھے مگر آمنہ ابھی تک مجسمہ کی مانند کھڑی تھی۔ فون کی گھنٹی نے اُسے چونکا دیا تو وہ اردگرد دیکھ کر شرمندہ ہوگئی۔ مگر فون کی دوسری گھنٹی نہ بجی شائد اُسے چونکانا ہی مقصود تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے پارسل کو دیکھا اور کھولنا شروع کر دیا۔ گفٹ پیپر کے نیچے سے ایک بڑا سا ڈبہ برآمد ہوا اُس نے کھول کر دیکھا تو دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ کیونکہ اس میں ایک خوبصورت لیڈیز سوٹ' ایک جوتی اور ایک ڈبہ میں موبائل فون پیک تھا۔ اس نے جلدی سے ڈبہ بند کر دیا اور اپنی بے قابو دھڑکنوں پر قابو پانے لگی۔

سوٹ کا رنگ اس کی پسند کا تھا۔ جوتی بھی اسی کے ناپ کی تھی اور موبائل کی اس کو ضرورت بھی تھی۔ مگر یہ سب چیزیں بھیجنے والا کون تھا؟ یہ سب چیزیں قیمتی بھی تھیں اور ان میں سے خلوص بھی جھلک رہا تھا۔ اس نے ڈبہ دوبارہ کھول کر موبائل والا ڈبہ پکڑا تو اس کے نیچے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ تھا پہلے تو اس نے نظر انداز کیا مگر اُسے لگا کہ اس کاغذ میں یہ پارسل بھیجنے والے کی شناخت ہوگی۔

اس نے ڈرتے دل کے ساتھ کاغذ پکڑا اور یہ سوچنے لگی کہ اگر کسی کو یہ سب کچھ بھیجنا ہی تھا تو پھر آج کے ترقی یافتہ دور میں اس کاغذ اور قلم کا سہارا کیوں لیا۔ جس کو میری فیکٹری اور آفس کا ایڈریس معلوم ہے اُسے میرے استعمال میں فون کا نمبر بھی معلوم ہوگا۔ مگر یہ معمہ تھا۔ اس نے کاغذ کھول کر دیکھا تو جانی پہچانی تحریر دیکھ کر اس کا ہاتھ لرز کر رہ گیا۔ چہرے کی رنگت کبھی زرد اور کبھی سفید ہو رہی تھی اس نے تمام تحریر کو نظر انداز کر کے نیچے لکھنے والے کا نام پڑھا تو آنکھیں اپنے مکینوں کو قابو میں نہ رکھ سکیں۔ اس نے کاغذ کو چومنا شروع کر دیا اس کے آنسوؤں کے قطرے کاغذ پر گر رہے تھے تحریر خراب ہونے کا خدشہ نہ تھا کیونکہ تمام تحریر کو کمپیوٹر پر کمپوز کیا گیا تھا۔ لرزتے ہونٹوں اور کانپتے ہاتھوں سے اس نے خط کی تحریر کو خراج پیش کرنا شروع کر دیا۔

''پیاری آمنہ!

سدا خوش رہو! میں خیریت سے ہوں۔

تمہیں تمہاری مرضی کی جاب مل گئی مجھے خوشی ہوئی۔ میں تم تمام لوگوں سے دور رہ کر بھی دور نہیں ہوں۔ ہر وقت تم لوگ میرے دھیان میں رہتے ہو۔ کبھی تم نے مجھ سے ان چیزوں کی فرمائش کی تھی مگر میں تمہیں دلانے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ مگر اب میں جن خطرناک راہوں پر چل پڑا

ہوں ان راہوں پر کانٹے ضرور ہیں مگر دولت کی فراوانی بھی ہے۔ مگر رشتوں کی پہچان اور اپنا آپ کھونا پڑتا ہے۔ اس بات کا تاحیات افسوس رہے گا کہ آپ لوگوں کے پاس رہ کر بھی پاس نہیں رہنے دیا جاتا۔''

آمنہ کی آنکھیں برسنے لگیں وہ کچھ توقف کے بعد دوبارہ خط پڑھنے لگی۔

''تمہاری فیکٹری کے تمام لوگ بہت اچھے ہیں مگر میری نظر میں ہیں۔ اماں اور ابا جی کو بہت بہت سلام دینا۔ جگنو بھائی کو کہنا کہ میں ان سے بہت محبت کرتا ہوں۔ ماں جی سے کہنا کہ مجھے معاف کر دیں میں ان کے دودھ کا قرض نہیں اتار سکتا۔ اگر زندگی نے کبھی موقع دیا تو واپس ضرور آؤں گا..... مگر کچھ دیر کے لیئے آج تمہاری سالگرہ تھی تمہیں شائد یاد نہ ہو۔ مگر میں نہیں بھولا۔

تمہارا بھائی۔ عفی

آمنہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی تھی اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرانے لگا جب عفی نے کالج میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی تو آمنہ نے اس سے ان چیزوں کی فرمائش کی تھی۔ عفی نے وعدہ کیا تھا کہ نوکری پر لگتے ہی پہلی تنخواہ سے وہ اس کی فرمائش پوری کرے گا اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا مگر تنخواہ کس بات اور کس کام کی لیتا تھا۔ وہ اس کام کی تنخواہ لیتا تھا جس کام میں ہر روز موت کی مالا کو اپنی خوشی سے گلے میں پہننا پڑتا تھا۔

آمنہ نے انٹرکام کی گھنٹی کو دیکھا غالباً احمد صاحب نے اُسے اندر بلایا تھا۔ اس نے ٹشو سے اپنا منہ اور آنکھیں صاف کیں اور ضروری فائلیں لے کر احمد کے آفس میں دروازہ کھٹکھٹا کر داخل ہوگئی۔ کمرہ خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ یہ احمد کی پسند کی خوشبو تھی۔ آمنہ کو ڈر تھا کہ احمد اس کے رونے کی وجہ پوچھے گا تو وہ کیا جواب دے گی۔ اس نے کئی سو بہانے سوچ لیئے تھے۔

''جی سر!'' وہ احمد کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی جبکہ احمد ٹیبل کے دوسری طرف تھا۔

''مس آمنہ!'' اس نے مخصوص لہجے میں کہنا شروع کیا تو آمنہ متوجہ ہو کر سننے لگی۔

''پچھلے Monday منڈے کو جس پارٹی نے فون کیا تھا ان کے مال کا کیا بنا؟''

''سر!'' سوال چونکہ کاروبار سے متعلقہ تھا اس لیئے آمنہ نے اپنے ہوش و حواس قائم کر لیئے۔ ''اُن کے مال کی شپمنٹ تیار ہوگئی ہے اور ہم انشاء اللہ کل بھیج دیں گے۔''

''گڈ!'' اس کے اس لفظ میں خوشی جھلک رہی تھی۔ ''آپ کو پتہ ہے آمنہ! کہ آپ کے بروقت مال کی تیاری اور اچھی ڈیلنگ نے علی گارمنٹس کو کتنا پرافٹ دیا ہے؟'' آمنہ کو اس سے کیا لینا

دیتا تھا اُسے تو اپنی تنخواہ سے غرض تھی۔ وہ اچھا کام کرتی تھی اسی لیے اُسے اچھی تنخواہ بھی ملتی تھی۔

"مس آمنہ! اچھی پارٹی سے ڈیل ہونے پر فرم نے ایک چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔ سب لوگوں کی طرح آپ کو بھی دعوت دی جاتی ہے۔" آمنہ نے گزشتہ وقت میں دیکھا تھا کہ علی گارمنٹس کو فائدہ ہونے پر احمد صاحب چھوٹے موٹے فنکشنز کرتے رہتے تھے اس لیئے اُسے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ "آپ شام کو سات بجے شالیمار پہنچ جایئے گا۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔" آمنہ کو اس بات پر حیرت ضرور ہوئی کہ اس فنکشن کی دعوت دوسرے تمام فنکشنز کی طرح فیکٹری میں ہی کیوں نہیں؟ مگر وہ خاموش رہی۔

"میں پہنچ جاؤں گی سر!" وہ نم لہجے سے اتنا ہی کہہ پائی۔

"ہنستے ہوئے چہرے خوبصورت اور پیارے لگتے ہیں۔ اداسی بے آواز ضرور ہے مگر اسے بھگانے کیلئے قہقہوں کی گونج کی ضرورت ہوتی ہے۔" وہ آمنہ کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر بہت بڑی بات آسانی سے کہہ گیا تھا۔ آمنہ سمجھ گئی کہ احمد نے اس کی روئی ہوئی آنکھیں دیکھ لی میں مگر ان کی وجوہات اس لیئے معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ہوگی کہ یہ آمنہ کا ذاتی معاملہ ہے۔

"تھینکیو مس آمنہ!" اس کا مطلب تھا کہ احمد اب مصروف ہے آمنہ اپنے آفس جا سکتی ہے۔ اس نے آفس میں آ کر ایک بار پھر عفی کے بھیجے ہوئے گفٹ پارسل کی طرف دیکھا تو دِل پر بھائی کی جدائی کا گھاؤ اور بھی گہرا ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں وہ منظر گھومنے لگے جب وہ تینوں بہن بھائی اپنے آنگن میں اٹھکیلیاں کر رہے ہوتے تھے۔ کبھی آنکھ مچولی۔ کبھی ایک دوسرے کو پکڑنا۔ کبھی دوسرے کا کھلونا چھین کر چھپا دینا۔ جھوٹی قسمیں کھا کھا کر دوسرے کو یقین دلانا کہ اس کا کھلونا میرے پاس تو نہیں ہے۔ بابا کی ڈانٹ اور ماں کی پیار بھری گھر کی...... خوشیوں بھرا آنگن یکدم خزاں زدہ ہو گیا تھا۔ آمنہ کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگنے لگیں۔

ماں جی اور بابا خوش ہونگے یا ناراض؟ اس بات کا فیصلہ ابھی ہونا تھا وہ باعزت بری تھی کیونکہ اس نے عفی سے خود کچھ نہ مانگا تھا اس نے تو بہن کی سالگرہ کا دن یاد رکھنے والے بھائی کو دیکھا بھی نہ تھا۔ اس بار بھی عفی نے اس کی پیدائش کا دن تاریخ یاد رکھی تھی

ماں جی تو خوشی کے مارے رونے لگیں جبکہ ابراہیم نے بھی چمکتی آنکھوں سے اس بات کا شکر ادا کیا کہ عفی زندہ ہے۔ آمنہ نے کچھ دیر آرام کرنے کے بعد عفی کا بھیجا ہوا سوٹ پہنا اور جوتا پہن کر جب وہ اپنے کمرے میں باہر آئی تو عائشہ بی بی سو سو بلائیں لینے لگیں۔ اس نے عائشہ بی بی

کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ آج کمپنی کی طرف سے دعوت پر جا رہی ہے۔ اُنہوں نے بتھیرا کہا کہ جگنو کے ساتھ چلی جاؤ وہ تمہیں چھوڑ کر واپس آ جائیگا مگر آمنہ نے اپنی منوائی...... یا پھر وہ جگنو کو تمام فرم کے سامنے تماشہ نہ بننے دینا چاہتی تھی یا پھر وہ خود تماشہ نہ بننا چاہتی تھی۔

"شالیمار" ایک بہترین ریسٹورنٹ تھا جس میں شہر کی سلجھی اور باوقار شخصیات اور فیملیز کھانا کھانا پسند کرتی تھیں۔ احمد کا تعلق جس طرح ایک ملٹی انٹرنیشنل فرم اور اچھے گھرانے سے تھا۔ شہر میں ایک بھی اس سے اچھا اور مہنگا ریسٹورنٹ ہوتا تو وہ فرم کے تمام لوگوں کو وہاں دعوت دے دیتا۔ شالیمار میں کھانا آمنہ کے لیئے بھی اعزاز تھا۔ وہ شالیمار سے چند میٹر پہلے ہی رکشہ سے اتر گئی۔ وہ چلتی ہوئی شالیمار کے وسیع و عریض گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو دروازے پر کھڑے باوردی دربان نے دروازہ کھول کر اُسے ہوٹل کی خوبصورت عمارت میں داخل ہونے سے پہلے سلام کیا۔ ہال بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔ وہ ہونقوں کی طرح خالی ہال کو دیکھتی رہ گئی۔

ایک بار تو اُسے ایسا لگا کہ احمد اور پوری فرم نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہے مگر جلد ہی اس کی حیرانگی اور پریشانی دُور کرنے کیلئے ایک باوردی ویٹر نے اُسے دوسری طرف اشارہ کیا۔ وہ باوقار انداز میں چلتی ہوئی دوسرے ہال کی طرف بڑھ گئی یہ پہلے کی نسبت قدرے چھوٹا ہال تھا مگر اس کی تمام میزوں پر خوبصورت رنگوں میں کینڈلز جگمگا رہی تھیں۔ حیرت میں اضافہ کرنے والی بات ہنوز برقرار تھی کیونکہ یہ ہال بھی کسی قسم کے نفوس سے خالی تھا۔ اب وہ چلتی ہوئی ہال کے درمیان پہنچ گئی تو یکدم اس کی آنکھیں تیز اور دُودھیا روشنی سے چکا چوند ہو گئیں۔ وہ حیرانگی سے نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھنے لگی مگر اُسے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ یہ بات گھبرانے اور پریشان ہونے والی تھی۔ مگر آمنہ پر اعتماد وجود کے ساتھ خوشگوار حیرت کا مقابلہ کر رہی تھی۔

یکدم ہال کی دیواروں سے "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو...... ہیپی برتھ ڈے ٹو یُو" کا میٹھا سونگ چلنے لگا اس کی حیرت اور استعجاب کی علامت کو مزید گہرائی میں دھکیلنے کیلئے ایک طرف سے احمد تالی بجاتا ہوا مسکراتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس نے بہترین تراش خراش کا سوٹ پہنا ہوا تھا اس کے لبوں پر پھیلی ہوئی مسکان کسی بھی نوجوان لڑکی کو قتل کرنے کیلئے کافی تھی۔ آمنہ کو اس کی یہ شرارت اچھی لگی۔

دل کی دھڑکنوں کو احمد احمد کی صدائیں ملنے لگیں۔ آج آنکھیں بھی بے ایمان ہو گئیں تھیں۔ بار بار اُٹھنے کی بجائے محبت اور قربان ہو جانے والی ادا سے بغیر پلکیں جھپکے ہی احمد کے انداز

اور پروقار سراپا میں کھوگئی تھیں۔ وہ چلتا ہوا آمنہ کے قریب آ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ آمنہ کو محبت بھرے انداز سے دیکھنے لگا۔ چند لمحات نے ہی ان دونوں کی اندرونی کیفیت اتھل پتھل کر کے رکھ دی تھی۔ آمنہ کے لرزتے کانپتے ہونٹ کچھ کہنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ مگر زبان ساتھ نہ دے پا رہی تھی۔ وہ دھڑکنوں کو احمد نام کی صدائیں دینے سے روکنا چاہتی تھی مگر اس کا اِن شرارتی دھڑکنوں پر اختیار نہ تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کو دیدار یار سے منع کرنے کیلئے جھکانا چاہتی تھی مگر پلکوں نے اس کے ارادوں کے ساتھ بغاوت کر دی تھی۔

احمد نے نجانے کب سے آمنہ کو دِل میں بسا لیا تھا اُسے خود بھی خبر نہ ہوئی تھی کہ آمنہ کب چپکے سے اس کے دِل میں آ کر بیٹھ گئی تھی وہ سوتے جاگتے بھی اسی کے سپنے دیکھا کرتا تھا اس کی شادی جس طرح بُرے اور بھونڈے انداز میں ناکام ہوئی تھی وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا مگر اس کی زندگی میں خوشیوں نے چند دنوں بعد ہی آمنہ کی شکل میں قدم رکھ دیا تھا۔ اُسے پہلے ہی دِن آمنہ کی دل پر دی گئی دستک سن کر دِل کے کواڑ کھولنے پڑے تھے۔

اُس دِل کے مندر میں داسی بنا کر وہ چپکے چپکے اس کی پوجا کرتا رہا تھا۔ مگر اب زیادہ دِنوں اور مہینوں تک وہ اس کھیل کو جاری نہ رکھنا چاہتا تھا مبادا کہ اس کی چوری پکڑی جائے۔ وہ اب اپنے دِل کی آواز دل کی گہرائیوں سے نکال کر آمنہ کے دِل میں اتارنا چاہتا تھا اور اس سے اچھا موقع اُسے کبھی نہ مِل سکتا تھا۔ وہ ایک ٹیبل پر بیٹھ چکے تو آمنہ کو ایک بار پھر چونک جانا پڑا کیونکہ ہال کی تیز روشنی یکدم بند ہوگئی تھی۔ میزوں پر پڑی ہوئی مختلف رنگوں کی موم بتیاں ماحول کو خوبصورت بنا رہی تھیں۔

آمنہ اپنی حیثیت اور خاندان کو دیکھتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار نہ کر سکی تھی۔ اس نے بھی پہلے دِن سے ہی سوچ لیا تھا کہ احمد کو دِل ہی دِل میں چاہتی رہے گی مگر اس بات کا اظہار کبھی نہ کرے گی کیونکہ وہ اس فرم میں ملازمت کرتی تھی اور احمد صاحب اس کے باس تھے۔ بے شک وہ اچھی تنخواہ لیتی تھی۔ مگر باس کی برابری نہ کر سکتی تھی۔ وہ کیا سمجھے گا کہ ''آگ لینے آئی اور گھر والی بن کر بیٹھ گئی۔''

وہ راتوں کو جاگ جاگ کر پہروں احمد کی تشبیہہ سے باتیں کیا کرتی تھی۔ اس سے لڑائی جھگڑا اور چھوٹی چھوٹی شرارتیں کیا کرتی تھیں مگر دِل کی آواز کو احمد نہ سن لے وہ ہمیشہ دھڑکنوں کو احمد کے نام پر سجدہ ریز کیا کرتی اور اپنی جبیں کو احمد کی تشبیہہ پر جُھکا کر اُسے چوما کرتی تھی۔ مگر اظہار کی نوبت یا پھر جراٴت نہ تھی۔

''پیپی برتھ ڈے ٹو یو آمنہ۔'' احمد کی ٹھہری ہوئی آواز نے اس کے کانوں میں رس گھولا تو وہ نگاہیں اُٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔؟ ''سر!؟'' وہ اتنا ہی کہہ پائی مگر احمد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ''اُونہوں'' اُسے محبت سے ٹوکا ''احمد'' آمنہ کی دھڑکنوں نے ناچنا گانا شروع کر دیا۔ ان کی تان بندھ گئی تھی۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ جیسے بچپن میں لڑنے والے بچے ایک دوسرے کو اُلٹے نام سے کئی کئی بار پکار کر چھیڑا کرتے تھے۔ آمنہ کی دھڑکنوں کا بھی بالکل وہی انداز تھا مگر یہ لڑائی نہ تھی شرارت تھی۔ اُلٹا نام نہ تھا بلکہ سیدھا اور پیارا نام تھا انداز دِل کو موہ لینے والا تھا۔ اب بچپن نہ تھا وہ جوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھ کر جوانی کو بھرپور انداز میں خوش آمدید کہہ چکی تھی۔

''احمد۔ احمد۔ احمد۔ احمد'' وہ یہ نام کیسے لے سکتی ہے؟ اس نام کے شخص نے ایک بار تو اُسے ٹھکرایا تھا۔ وہ دوبارہ اسی نام سے دھوکا نہ کھانا چاہتی تھی۔ ایک جانا پہچانا خوف دِل میں آ کر بیٹھ گیا تھا لیکن وہ اس خوفناک خوف سے لڑنے کی کوشش کرنے لگی۔

''وہ منگنی تو ممانی احسن نے ختم کی تھی اس میں احمد نام کا کیا قصور؟''

''وہ منگنی ختم ہونے کی وجہ بھی تمہاری غربت تھی...... اب کون سا کوٹھی اور کاروں کی مالک بن گئی ہو کہ احمد نام سے پھر رشتہ جوڑنے چلی ہو۔'' جواب خاصا تلخ تھا۔

''میں نے بچپن سے اب تک جس نام کی پوجا کی ہے وہ یہی نام ہے۔''

''دھوکا بھی تو اسی نام نے دیا تھا۔ ممانی احسن کے منع کرنے پر احمد خود کیوں نہیں ایا تمہاری پرستش کا صلہ دینے کیلئے...... یا پھر تمہارے رستے زخموں پر مرہم رکھنے کیلئے۔'' خوف کی مدلل دلیل نے آمنہ کو لاجواب کر دیا۔ ''مگر مجھے اب اعتماد ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔'' اس نے خوف کے منہ پر طمانچہ مارنے کی کوشش کی تو اندر سے کوئی زور سے ہنسا۔ ''اعتماد جب ٹوٹتا ہے تو اس کی کرچیوں کی تعداد گننی مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ تمہارے پورے وجود کو اس طرح زخمی اور گھائل کر دیں گی کہ زخموں کی تعداد ٹوٹے ہوئے اعتماد کی کرچیوں کی تعداد سے زیادہ ہو جائے گی۔''

''میں تمہیں شکست دے کر دِکھاؤں گی۔ میں تمہیں یہ بتاؤں گی اور دِکھاؤں گی بھی کہ اعتماد چٹانوں میں دراڑیں ڈال سکتا ہے۔ جبکہ بے اعتمادی کنکروں سے بھی ڈرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔''

مگر خوف پھر ہنسا اس بار اس کی آواز میں زہریلا پن زیادہ تھا۔

چوٹیاں سر کرنے کا عزم لے کر نکلے لیکن
رستے میں ڈر گئے اک پتھر سے ہم

ھا۔ھا۔ھاھاھا.......... ''پھر قہقہہ دُور ہوتا گیا۔ آمنہ اپنے اندر کی جنگ سے نبرد آزما تھی کہ احمد اُسے اس انداز سے دیکھے جا رہا تھا کہ اگر اُسے چھوا بھی تو وہ ٹوٹ کر بکھر جائیگی! آمنہ اس کے اس طرح دیکھنے پر دوہری ہوگئی۔

''احمد'' وہ پھر بولا۔ آمنہ

''جی سر!'' اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا تو احمد مُسکرانے لگا۔

''تم نے پوچھا نہیں آمنہ کہ باقی لوگ کہاں ہیں؟'' احمد بے تکلفی کا آغاز کیا تو آمنہ کو اچھا محسوس ہونے لگا احمد نے پہلی بار اُسے آپ کی بجائے تم اور مس آمنہ کی بجائے آمنہ کہا تھا۔

''میں باقی سب لوگوں سے بھی پیار کرتا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں گفتگو کرنے لگا۔

''میں نے تمہارے برتھ ڈے کی خوشی میں کل فیکٹری میں ہی ایک چھوٹے سے فنکشن کا اہتمام کیا تھا۔ مگر میں محبت صرف تم سے کرتا ہوں...... صرف تُم سے۔'' آمنہ اس کی طرف سے محبت کا برملا اظہار سن کر اندر کے خوف کو طنز کرنے لگی۔

''اب کیا کہتے ہو؟''...... وہ دل میں چھپے خوف سے لڑتی ہوئی بولی۔ ''کیوں جیت گیا نا میرا اعتماد؟'' اس کا پُر اعتماد لہجہ سن کر خوف بھی خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا تھا۔

''آپ بہت بڑی بات کر رہے ہیں سر!''

''آمنہ! محبت کیا ہے؟'' اس کا مختصر سا سوال کئی جوابات سے بھی حل نہیں ہو سکتا تھا۔ آمنہ صرف اس کی گہری آنکھوں میں ہی دیکھ کر رہ گئی۔ ''میں نے تمہیں پوجا ہے۔ چاہا ہے۔ پرستش کی ہے۔ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ سے تمہارا ساتھ مانگا ہے۔ ہو سکتا ہے میرے اظہار کا طریقہ غلط ہو۔ موقع' مناسبت اور یا پھر الفاظ ہی غلط ہوں۔'' اس نے ہمت کر کے آمنہ کے ہاتھ پکڑ لیئے وہ سر تا پاؤں لرز گئی۔ ''تمہاری خوبصورتی اور پاکیزگی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس دِل نے تمہیں اتھاہ گہرائیوں سے چاہا ہے۔ میرے یہ کمتر اور حقیر الفاظ تمہارے خوبصورت پیرہن کی' دلآویز مسکان کی۔ گلابوں کی پنکھڑی جیسے ہونٹوں کی' جھیل سی گہری آنکھوں کی۔ خوبصورتی سے سجی ناک اور چاند کی چاندنی کو شرمانے والے چہرے کی تعریف سے قاصر ہیں۔''

آمنہ اس کے انداز گفتگو سے شرما رہی تھی وہ اس ملک کا کامیاب بزنس مین تھا مگر محبت نے اُسے شاعر اور آمنہ کے سراپا حسن نے اُسے دیوانہ بنا دیا تھا۔

''راہوں میں پڑے ہوئے سونے کے سکے کو ہر کوئی اُٹھانے کے لیئے جھک جاتا ہے۔''

آمنہ نے آہستگی سے اپنے ہاتھ چھڑانے چاہے مگر احمد کی محبت پر زور تھی۔ ''اپنے نام' مرتبے' حیثیت' ذات برادری کی پرواہ کیئے بغیر اس سکہ کو اُٹھانے والا اور بھی امیر بننا چاہتا ہے...... مگر میں سونے کا سکہ نہیں ہوں سر! میں تو وہ کھوٹا سکہ ہوں جس پر اس کی قیمت کی جگہ غربت کا جرم لکھا ہوا ہے۔''

''میں ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ میری اچھی تربیت اور پرورش میرے والدین کی مجھ سے محبت کا نتیجہ ہے۔'' وہی مخصوص انداز ٹھہرا ہوا لہجہ۔ محبت کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے الفاظ' عشق اور خلوص کا پیرہن اوڑھ کر احمد کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔ ''میں کوئی فلرٹ نہیں کر رہا...... مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے کہ تم میری فرم میں ورکر ہو۔ بلکہ میں تقدیر کی بھول پر خوش ہوں کہ اُس نے تمہیں ایک ایسے روپ میں میرے پاس بھیجا کہ میں اونچ نیچ اور ذات پات کی قید سے نکل کر محبت کی ذات کا قیدی بن گیا۔''

''میری اور آپ کی حیثیت میں بہت فرق ہے سر!'' خوف اور چور زبان سے الفاظ کے راستے باہر نکل آئے وہ مسکرا رہے تھے کہ ہم جیت گئے۔

وہ آمنہ کے ہاتھ چھوڑتا ہوا بولا۔ ''اب جو بھی بات ہوگی تمہاری طرف سے شروع ہوگی اور اس میں...... میں احمد اور تم آمنہ ہوگی۔ دیٹس آل۔'' وہ ٹیبل پر ہاتھ مارتا ہوا بولا تو آمنہ اس کے پیار بھرے انداز پر دِل و جان سے قربان ہوگئی۔ مگر زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی وہ اتنے امیر آدمی کا نام کیسے لے سکتی ہے؟...... مگر امیر آدمی تو اس کی محبت کا دیوانہ ہے۔ اور دیوانے کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اس کی کوئی ذات نہیں ہوتی۔ اس کا کوئی نام نہیں ہوتا بس اس کا مقام ہوتا ہے جس پر وہ فائز ہو کر دوسرے لوگوں سے افضل ترین ہو جاتا ہے اس مقام کا نام دیوانگی ہے۔

''احمد!'' آمنہ کی لرزتی آواز نے احمد کے چہرے پر اطمینان اور خوشیاں بکھیر دی تھیں۔

''احمد صاحب آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں۔'' وہ کرب سے دیکھنے لگا۔ آمنہ کو خود پر غصہ آنے لگا۔ اس نے ایسا کیوں کہہ دیا۔ محبت میں ہر فیصلہ اٹل ہوتا ہے ان فیصلوں پر غور و خوض یا نظر ثانی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

تمہیں اپنا برتھ ڈے یاد تھا؟ اس سوال پر وہ احمد کی طرف دیکھنے لگی۔ اُسے واقعی یاد نہ تھا کیونکہ وہ گھر کی تقدیر بدلنے نکلی تھی باپ سے ریڑھی کا کام چھڑوا کر آرام اور سکون کی باقی زندگی گزارنے کیلئے تحفہ دینا چاہتی تھی۔ جگنو کو اچھے اچھے کپڑے اور اچھا کھانا کھلانا چاہتی تھی۔ بوڑھی ماں کے سپنوں کو تعبیر دینا چاہتی تھی۔ اتنی ساری ذمہ داریوں میں اُسے اپنا آپ کہاں یاد تھا۔ آج

صبح ہی عقی نے اُسے یاد دلایا تھا کہ اس کا برتھ ڈے ہے۔ مگر عقی تو اس کا بھائی تھا اس کا ماں جایا تھا۔ اسکا اپنا خون تھا۔ اس کے ساتھ پلا بڑھا تھا۔ اُسے آمنہ ہی کیا گھر کے سبھی افراد کے بارے میں ٹھیک ٹھیک معلومات تھیں۔ مگر احمد صاحب کو اس کا برتھ ڈے کیسے یاد تھا؟ وہ تو اس کا کوئی نہیں لگتا تھا۔ نہ ہی کوئی خونی رشتہ نہ تعلق داری...... پھر......؟

اس سوال نے اُسے احمد کی طرف استفہامیہ انداز سے دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''میں سمجھ گیا ہوں آمنہ!'' وہ محبت سے بولا۔ ''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ مجھے تمہارا برتھ ڈے کیسے یاد رہا تو میرا آسان سا جواب ہے۔'' اس کے لبوں پر شریر مسکان رینگنے لگی۔ اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ کھول کر آمنہ کے سامنے رکھ دیا۔ آمنہ اس کاغذ کو دیکھ کر مسکرانے لگی اور سمجھ گئی کہ احمد ایک اچھا بزنس مین ہی نہیں بلکہ ذہین اور سمجھدار ساتھی بھی ثابت ہوگا۔ وہ کاغذ آمنہ کا سی وی تھا جس پر اس کا مکمل بائیو ڈیٹا بمعہ تاریخ پیدائش کے درج تھا۔ اسی کاغذ کی بنیاد پر احمد نے پورا ہوٹل آج کے دن کیلئے اس کی برتھ ڈے کو وش کرنے کیلئے بک کرالیا تھا۔

''تھینکیو! اح م د'' آمنہ کے لہجے میں ابھی تک جھجک تھی۔

''میں بہت شرارتی ہوں...... آم ن ہ'' دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''خوبصورت عورت کو دیکھنے سے آنکھ جبکہ نیک دِل عورت کو دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔''

احمد کی زیادہ تر عمر یورپ وغیرہ میں گزری تھی مگر وہ پاکستانی ثقافت اور یہاں کی تعلیم کا دِلدادہ بھی تھا۔ اس کی گفتگو میں بلا کا قرینہ تھا۔ لگتا ہی نہیں کہ اس نے یورپ میں زندگی گزاری ہے۔ ''میں نے جب تمہیں پہلی نظر دیکھا تو دِل کی دھڑکنوں نے گواہی دے دی تھی کہ تم ہی وہ لڑکی ہو جسے میں زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا تھا۔''

اتنا کھلا اظہار۔ اتنی محبت کہ شریک زندگی کا فیصلہ بھی کر لیا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' آمنہ نے گھڑی دیکھی تو پریشان ہو گئی۔

''تم میرے ساتھ ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ فکر اور ڈر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی تو کیک کاٹنا ہے۔'' احمد نے نامحسوس اشارہ کیا تو ایک ٹیبل سنہری روشنی سے چمکنے لگی اس پر ایک موم بتی اور خوبصورت کیک رکھا ہوا تھا۔ احمد نے حیران ہوتی ہوئی آمنہ کا ہاتھ پکڑا اور کارنش بجانے والے انداز میں اُسے لیکر اس ٹیبل پر پہنچ گیا۔ اس نے چھری آمنہ کو پکڑا دی۔ آمنہ نے چھری پکڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو آ م ن ہ'' احمد کے خوبصورت انداز میں شرارت تھی۔ کیک پر چھری چلتے ہی احمد کی آواز اور تالی نے آمنہ کو چھوئی موئی کر دیا۔ کیک کے دو پیس جو کہ چھوٹے چھوٹے تھے آمنہ نے الگ الگ پلیٹ میں ڈالتے ہوئے ایک پلیٹ احمد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تھینکیو احمد!'' وہ خوش ہو کر بولا۔ ''تمہارا شکریہ آمنہ کہ مجھے اپنی محبت کی پرستش کو سندِ قبولیت بخشی!'' الفاظ اس کی زبان کے مرہونِ منت رہتے تھے۔ ''میرا پورا نام تمہاری زبان کے رستے تمہارے دِل سے نکل کر میرے دِل میں اُتر گیا ہے۔''

''میں تمہارے امی ابو سے ملنا چاہتا ہوں آمنہ!'' احمد نے کیا کہا تھا کہ دھڑکنیں پھر سے بے ترتیب ہو گئیں تھیں اس کے گھر میں تو احمد کے شایانِ شان بیٹھنے کی کوئی جگہ بھی نہ تھی وہ اُسے کیسے انوائٹ کرے۔ اور پھر احمد کیوں ملنا چاہتا ہے۔

''احمد!'' وہ بڑی محبت سے متوجہ ہو گیا تھا۔ ''میری امی اور بابا میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟'' اس کی فکرمندی دیکھ کر وہ مسکرانے لگا۔ ''محبت کا الزام میں اپنے سر لوں گا۔ زندگی میں شریک سفر بننے کیلئے ان کی محبت اور پرخلوص ساتھ کی ضرورت ہے جبکہ تمہاری پیار بھری ماں کی ضرورت ہے۔ میں ان کی رضامندی کے بغیر تم سے شادی کیلئے تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔'' وہ اس کی اعلیٰ ظرفی پر قائل ہو گئی۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں آمنہ!'' آمنہ کی نظریں اُٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ ''تو پھر کب ملوا رہی ہو۔ امی۔ ابو سے''؟ اس کے دِل کی بات زبان پر آ گئی۔

''گھر سے باہر کہیں بھی کبھی بھی ملوا دوں گی۔ آفس میں......؟'' احمد سمجھ گیا کہ اس کا گھر محل کی طرح نہ ہوگا اسی لیئے وہ ہچکچا رہی ہے۔ ''میں ان بزرگوں کی عزت کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی کاروباری ڈیل نہیں ہے کہ میں اُنہیں اپنے آفس بلواؤں۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟ میں ان کا بیٹا بننا چاہتا ہوں۔ ان کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' احمد ٹلنے والا نہ تھا۔ ''اچھا ہمارے گھر میں زمین تو ہے نا۔ میں اس پر ہی بیٹھ جاؤں گا۔'' اس کے اس انداز پر آمنہ ہنسنے لگی۔

''گڈ! تو میں اگلے سنڈے کو تمہارے گھر آ رہا ہوں۔ مجھے تمہارا ایڈریس معلوم ہے۔''

☆☆☆

بابا نور شاہ ولی کے مزار پر سینکڑوں مریدین کا ہجوم تھا۔ عقیدت مند ملک کے کونے کونے سے عرس کی تقریب پر شرکت کیلئے آئے ہوئے تھے۔ لنگر اور تبرکات کی تقسیم ہو رہی تھی۔ دربار کو محلہ داروں، جگنو اور حافظ جی نے مل کر عرقِ گلاب سے غسل دیا تھا۔ جگنو بہت سے عقیدت مندوں کی آنکھ کا تارا بن گیا تھا۔ وہ ڈھول کی تھاپ پر پاؤں میں گھنگرو باندھے دیوانہ وار ناچ رہا تھا۔ اس کی عقیدت کی راہ میں اس کا معذور پن حائل نہ ہو رہا تھا۔ وہ نور شاہ ولی سرکارؒ کا مرید تھا ابراہیم اور عائشہ بھی اپنی بساط کے مطابق تبرک تقسیم کر کے وہیں احاطہ دربار میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

انہوں نے جگنو کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ متعدد بار اُسے روکنے کی کوشش ناکام ہو چکی تھیں۔ حافظ جی اپنے حجرے کے باہر عقیدت مندوں میں گھرے ہوئے تھے۔ لوگ قبر شریف پر چادریں چڑھا کر اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کر رہے تھے۔ نمازِ عصر کے بعد حافظ جی نے دِل لرزا دینے والی دُعا فرمائی۔ اُمتِ مسلمہ اور اُمتِ محمدیؐ کیلئے دِل کی گہرائیوں سے دُعائیہ کلمات نے لوگوں کو رُلا دیا تھا۔ اپنے ملک کی بہتری اور سلامتی کے لیئے بھی دُعا میں حافظ جی کے الفاظ خیر و عافیت کا پیغام بن کر رب کی بارگاہ میں عاجزی سے پیش ہوئے تھے۔

لوگ واپس اپنے شہروں، قصبوں کو لوٹنا شروع ہو گئے تھے۔ اس ایک دن کے عرس پر سجائی گئی عارضی دکانوں والے سال بھر کی کمائی کر لیتے تھے۔ شہر کے بڑے بڑے معززین اور سرکاری افسران بھی سلام کیلئے حاضر ہوتے تھے۔ جگنو تھک کر مزار شریف کے اندر ہی سرکار کے قدموں کی جانب سو گیا تھا کسی کی بھی جرات نہ تھی کہ اُسے جگاتا یا پھر وہاں سے اُٹھنے کیلئے کہتا۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ حافظ جی کا خاص مرید اور چہیتا ہے۔ جگنو عشق کی انتہا تک پہنچ کر حافظ جی کا احترام کرتا تھا۔ بس ہر بات پر سر جھکا کر ادب و احترام کی منازل طے کرتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

ٹرین میں آگ لگنے واقعہ نے گویا ہر اس جگہ آگ لگا دی تھی جہاں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ہندوؤں نے لوٹ مار کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے گھروں کو بھی جلانا شروع کر دیا تھا۔ مسلمانوں کی دکانیں لوٹ کر ان کو نذرِ آتش کر دیا جانے لگا۔ مساجد میں نمازیوں کا داخلہ بند ہو گیا۔ اذانوں کی آوازیں مساجد کے صحنوں تک ہی محدود رہنے لگیں۔ ہر کام کی ایک حد اور ضبط و برداشت کی بھی حد تک مسلمانوں نے برداشت کیا۔ پھر ان کے بھی صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا جب سکول و کالج جاتی ہوئی مسلمان بچیوں کی عصمت دری ہونے لگی تو آگ نے پورے ہندوستان کو

اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میڈیا اور اخبارات کے نمائندے بریکنگ اور الرٹ نیوز کے طور پر آگ کے شعلوں کے ساتھ ساتھ لڑائی جھگڑوں کے مناظر کی بھی کوریج کر رہے تھے۔

کندن اس ساری صورتِ حال سے دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ پریشانی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے خلیل احمد سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ وہ بھی مہارانی اور بڑے بھائی موہن کے روکنے کے باوجود گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ قتل و غارت اور لوٹ مار کرنے والے مختلف گروہ گلیوں، بازاروں میں کتوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ غیر مسلموں نے تلواریں، بندوقیں اور ڈنڈے پکڑ رکھے تھے وہ ہر گلی میں شور مچاتے ہوئے گھس جاتے اور اگر کوئی ٹوپی پہنے یا تسبیح پکڑے نظر آ جاتا اس پر پل پڑتے اور تشدد کی اخیر کر دیتے۔

مسلمان بھی اپنی املاک اور عزتوں کو بچانے کی خاطر ان گروہوں کا پیچھا کرتے اور اپنی آبادی سے ان کو دور رکھنے کیلئے اسلحہ اور ڈنڈوں کا استعمال کر رہے تھے۔ وہ بھی ہندو املاک کو نذرِ آتش کر دیتے مگر وہ جس مذہب اور تربیت سے تعلق رکھتے تھے وہ قوانین اُنہیں بُرے فعل سے روک دیتے۔

کندن بچتا ہوا خلیل احمد کی بستی تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ہر طرف آگ اور دھوئیں نے اُسے خون رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہر طرف سے آہوں اور چیخوں نے اس کے کانوں میں زہر گھول دیا تھا۔ وہ تمام آبادی جل کر راکھ ہو رہی تھی۔ یہ تمام آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ خلیل احمد کا گھر بھی جل چکا تھا وہ نجانے کہاں تھا۔ زندہ بھی تھا یا نہیں اس بات کی کندن کو کوئی خبر نہ تھی۔ کئی گھر جلنے سے رہ گئے تھے۔ عورتوں اور بچوں کا رونا رونگٹے کھڑے کر رہا تھا۔ اتنی پر تشدد اور ظلم بھری واردات اس نے زندگی میں آنکھوں سے پہلی بار دیکھی تھی۔ اچانک ایک طرف سے شور بلند ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ بہت سے افراد بھاگے آ رہے ہیں۔

کندن حالات کو بھانپتا ہوا ایک جلی ہوئی ریڑھی کے نیچے چھپ گیا۔ وہ ہندوؤں کا جتھا تھا جن کے ہاتھوں میں بالے، تلواریں، ڈنڈے، اسلحہ اور جلتی ہوئی مشعلیں تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے تھے۔ کوئی بولا۔ ''وہ دیکھو...... وہ گھر ابھی تک محفوظ ہے۔'' اس کی آواز نے باقی سب کی توجہ بھی اسی طرف مبذول کروائی۔ ''مگر وہ تو خالی ہے۔ مکین بھاگ گئے ہونگے۔'' دوسری آواز آئی۔

''ہمیں کیا لینا دینا اپنا جو کام ہے وہ کرو۔ سامان تو موجود ہے...... بس آگ لگا دو۔ اس

سے پہلے کہ سالے مسلے آ جائیں۔" وہ کوئی گروپ لیڈر تھا اس کی آواز پر ساتھیوں نے "جے بھگوان" کا نعرہ لگایا اور اس گھر کی طرف بھاگ نکلے جو کچھ بچ گیا تھا مگر ان ظالموں کو سامان نظر آ رہا تھا۔

دراصل دونوں طرف کی حکومتوں نے ٹرین کو آگ لگنے کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالنے کی پالیسی پر عمل کیا۔ جس سے دونوں مذاہب کے جذبات بھڑک گئے۔ ایک انڈین وزیر نے تو یہ تک کہہ دیا کہ میں بھی اس ٹرین میں سوار تھا اور آگ لگانے والوں کو میں نے خود دیکھا ہے وہ مسلمان تھے اور آگ لگانے کے بعد نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے بھاگ گئے۔

دونوں اطراف کے میڈیا نے بھی اپنا اپنا کردار نبھایا اور جلتی پر تیل چھڑکنے کیلئے بے بنیاد خبروں کو بھی فرنٹ پیج کی زینت بنا دیا۔ ہندوستان میں چونکہ مسلمان اقلیتی اقوام میں شمار ہوتے ہیں اسی لیئے ظلم کا نشانہ بھی وہی لوگ بنے۔ ان کی املاک جلا دی گئیں۔ سینکڑوں مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا۔ گاڑیوں اور کاروباروں کو آگ لگا دی گئی۔

عزتوں سے کھیلا گیا۔ ہندوؤں کا اتنا نقصان نہ ہوا تھا کیونکہ پولیس کے محکمہ سے لیکر سب سے اوپر والی کرسی تک ہر محکمہ میں ہندو تعینات تھے۔ اس لیئے جو نقصان ہو چکا تھا یا ہو رہا تھا اس کا خمیازہ آنے والی دونوں مذاہب کی نسلوں کو بھگتنا تھا۔

کندن نے جلتے ہوئے گھر کے سامان کو دیکھا۔ کام کرنے والے آگ لگا کر جا چکے تھے۔ لوگ ادھر اُدھر بھاگ کر اپنی جانیں بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس گھر کی اوپر والی منزل پوری طرح جل چکی تھی کہ کندن کی آنکھوں نے ایک دِل سوز منظر دیکھا آگ گھر کے باقی سامان کو جلانے کیلئے بے تابی اور بے قراری سے آگے ہی آگے بڑھ رہی تھی ایک الماری جس میں برتن وغیرہ رکھے ہوئے تھے اس کے دروازوں پر شیشے لگے ہوئے تھے آگ کی لپٹیں اس الماری کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ دل ہلا دینے والا منظر یہ تھا کہ کندن کی نگاہ الماری کے اندر رکھے ہوئے قرآن کریم پر گئی۔ وہ تڑپ اُٹھا۔ اس کے دل نے دھڑ دھڑ کنا شروع کر دیا۔

گزشتہ پندرہ دِنوں سے وہ اسلام کے بہت قریب ہو گیا تھا بس کل ہی وہ سرفائز کے ہاتھوں مسلمان ہونے کا شرف حاصل کرنے والا تھا مگر ان نگاہوں نے اُسے یہ سعادت حاصل نہ کرنے دی تھی۔ اس نے قرآن اور اسلام کو بہت قریب سے جان لیا تھا۔ اب اس کی جان بھی چلی جائے تو قرآن کریم جل جائے گا۔ اس نے بھاگ کر جلتے ہوئے مکان میں داخل ہونے کی کوشش کی

تو آگ کے شعلوں نے اس کا استقبال کیا۔

اُس نے ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز ہو کر بھڑکتی ہوئی آگ کے سمندر میں چھلانگ لگا دی دھوئیں کے مرغولے اور آگ کی تپش اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو پارہ بنا رہی تھیں۔ اس کی پھرتی قابل دید تھی وہ اس کمرے میں پہنچا تو چھت کا جلا ہوا شہتیر آگ سے جل کر اس کے کندھے پر ٹوٹ کر گرا تو وہ دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ اس کے کندھے پر شدید چوٹ آئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھا کہ اس کے کانوں میں قرآن کریم کی تلاوت کی پُر نور صدائیں گونجنے لگیں۔

"تم خدا سے کیونکر انکار کر سکتے ہو؟ تم بے جان تھے اس نے ہی تم میں جان ڈالی۔ اور پھر وہی تمہیں مارتا ہے اور وہی تمہیں جلائے گا۔" کندن کے جسم میں برق دوڑنے لگی۔ اس نے اُٹھ کر زخمی کندھے کی پرواہ کیئے بغیر الماری کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اتنی دیر میں آگ مزید بھڑک چکی تھی۔ انداز سے وہ الماری تک پہنچا تو اس کے سر کے بال جل گئے تھے کپڑوں نے بھی آگ پکڑ لی تھی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری الماری کھول کر قرآن کریم کو با حفاظت اپنی دس انگلیوں میں تھام لیا اس کی آنکھوں سے خوشی اور عقیدت کے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ وہ چند ساعتیں قرآن کریم کو اپنے سینے سے لگائے کھڑا رہا۔ اتنی دیر میں گھر کے باہر مسلمانوں کا گروہ اکٹھا ہو گیا تھا۔

کسی نے کندن کو اندر دیکھ کر آواز لگائی۔ "آگ لگانے والا اندر ہی ہے بچ کر نہ جانے پائے۔" بس پھر کیا تھا اُنہوں نے اپنی ہاکیاں اور ڈنڈے تیار کر لیئے۔ کندن کو باہر نکلنے کا راستہ دِکھائی نہ دیتا تھا اس نے قرآن کریم کو اپنے سینے سے چمٹائے ہی "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا اس کی آواز باہر کے شور میں دب گئی مگر اس نے ایک بار پھر آگ میں کود کر باہر کی طرف نکلنا چاہا۔ وہ کھڑکی توڑتا ہوا باہر گروپ کے قدموں میں آ گرا۔ ابھی وہ اُٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ آواز آئی "بھاگنے نہ پائے۔"

وہ اس انداز میں گرا تھا کہ اس کا منہ زمین سے ٹکرا گیا اور قرآن کریم اس کے سینے سے لگا ہوا تھا اس کے دونوں ہاتھ قرآن کو تھامے ہوئے تھے۔ سر کے بال اور کپڑے جگہ جگہ سے جل چکے تھے۔ مسلمانوں کا گروپ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر اس پر پل پڑا۔ مگر مار کھانے کے بعد جب وہ سیدھا ہوا تو اس کے سینے سے قرآن کو چمٹا ہوا دیکھ کر مسلمان لرز کر رہ گئے۔ "عقل کے اندھو! دیکھو یہ کون ہے۔ کس پر لاٹھیاں برسا رہے ہو۔" یہ وہی تھا جس نے کہا تھا کہ "بھاگنے نہ پائے۔"

ایسے ہی دو غلے لوگوں نے مذہبوں کی تقسیم اور تفرقوں کو تقویت دی تھی۔

"یہ اگر ہندو ہوتا تو کیا قرآن کو اپنے سینے سے چمٹا رہنے دیتا۔ جانے دو اسے" یہ آواز سن کر وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کی روشنی چمک رہی تھی۔ اُسے مسلمان مان لیا گیا تھا قرآنِ کریم کی بدولت اس کی زندگی بچ گئی تھی۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس سے قرآن پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ نکلا۔ وہ بھی حیرت واستعجاب میں جتلا کھڑے ہی رہ گئے۔ کندن کا انوکھا حال ہو گیا تھا۔

سر کے بال مختلف جگہوں سے جل گئے تھے۔ کپڑے بھی جگہ جگہ سے جل کر اس کے جسم کو برہنہ کر رہے تھے۔ مگر وہ اپنے چہرے پر لگی ہوئی کالک اور زخمی کندھے کی پرواہ کیئے بغیر انجانی سمت بھاگتا جا رہا تھا۔ راستے میں اُسے مسلمانوں کے گروپ ملے مگر قرآن کی بدولت اس کی زندگی بچ گئی...... مگر ایک جگہ ہندوؤں کے جتھے نے اُسے روک لیا۔ اس کے ہاتھ میں قرآن تھا مگر ابھی وہ مسلمان نہ تھا۔

وہ موت کی صورت میں اس کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ ڈری اور سہمی نظروں سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک چیخ کر بولا۔ "کون ہو تم؟ ہندو...... کہ مسلمان؟" دوسری آواز اور بھی گونجدار تھی۔

"ابے سالو!...... اگر ہندو ہوتا تو کیا ہاتھ میں قرآن ہوتا...... یہ مسلمان ہے۔ کاٹ ڈالو۔ سالے کو......"

کندن اپنی پہچان ہندو کے طور پر نہ کروانا چاہتا تھا۔ جس قرآن نے اس کی زندگی بچائی تھی وہ اُسی قرآن کی حرمت پر قربان ہونے کو تیار ہو گیا تھا۔ ایک زوردار ڈنڈا اس کی کمر پر پڑا تو اس کے ہوش کوچ کر گئے۔ مگر وہ دوسرے ہی لمحے "نعرہ تکبیر۔ اللہ اکبر" کی صدا بلند کرتا ہوا ایک طرف بھاگ نکلا۔

پورے کا پورا جتھا اس کے پیچھے لپکا۔ وہ کندن کو بہت جلد ہی پکڑنے والے تھے مگر اللہ نے اس کی مدد کی اور گلی کے دوسرے کونے سے مسلمانوں کا گروپ "اللہ اکبر" کی للکاریں مارتا ہوا ہندو گروپ پر لپکا تو بزدل اسلحہ ہونے کے باوجود بھی دُم دبا کر بھاگ نکلے۔

کندن آبادی سے دُور نکل گیا تھا اب اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ پولیس کی گاڑیاں گشت کر رہی تھیں۔ ایمبولینس سروس بھی اپنے جہاد میں مصروف تھی۔ وہ بھاگتا ہوا ایک مسجد کی

طرف بڑھ گیا۔ ابھی مسجد چند میٹر دور ہی تھی کہ وہ رہی سہی سکت کھو بیٹھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ حلق میں کانٹے دوڑنے لگے۔ وہ بے ہوش ہونے سے پہلے مسجد تک پہنچنا چاہتا تھا مگر تیورا کر گر پڑا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "میری طرف ایک قدم بڑھاؤ میں دس رحمتوں کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔" اس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا تھا کیونکہ وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ ایک غیر مسلم کے دِل میں دین اسلام کی شمع روشن کر کے ربِ واحد نے یہ وعدہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ اسلام زبردستی کا درس نہیں دیتا۔ بس ایک بار دل کی گہرائی سے مذہب اسلام کا مطالعہ کر لینے والا اس کا شیدا بن جاتا ہے۔

کندن کو بھی اسلام قبول کرنے سے پہلے اس مذہب کے مطالعہ کا اچھا خاصا وقت ملا تھا۔ اس پر کسی قسم کی زبردستی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس مذہب کے لٹریچر سے متاثر ہوا تھا۔ اب عملی طور پر اُسے یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ اس انعام کا حق دار تھا۔ اور اللہ کی پاک ذات کے قربان جاؤں اس نے کندن کو قرآن کریم کی حفاظت پر مامور کر کے اُسے بہت کڑے امتحان سے اس طرح کامیابی بخشی تھی کہ تقدیر اُس پر رشک کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

آمنہ کے ساتھ ساتھ عائشہ بی بی ابراہیم اور جگنو بھی گھر کو دھونے میں مصروف تھے۔ آمنہ نے گھر بھر میں کہرام مچا دیا تھا کہ اس کے باس آنے والے ہیں۔ ہفتہ پہلے ہی گھر میں سفیدی وغیرہ ہو گئی تھی۔ ہاتھ منہ دھونے والے حمام کی جگہ تین بار ابراہیم بدل چکا تھا۔ وہ ہر نئی جگہ پر رکھنے سے پہلے جگنو سے پوچھتا کہ "یہاں ٹھیک رہے گا"؟ اور جگنو اپنی عقل کے مطابق فرمانبرداری اور تابعداری میں ہر بار ہی سرخرو ہوتا۔

ٹوٹی ہوئی چارپائی سامنے کسی کے گھر رکھوا دی تھی۔ ریڑھی بھی دروازے کے آگے سے ہٹا کر چوک میں ایک بند دکان کے سامنے کھڑی کر دی گئی تھی۔ آمنہ نے عائشہ بی بی کو احمد کے ساتھ ہونے والی تمام بات بتا دی تھی۔ احمد اور آمنہ کی شادی کے مسئلہ پر پورے سات دِن گھر میں بحث ہوتی رہی تھی۔ مگر فیصلہ یہ کیا گیا کہ ابراہیم اور عائشہ لڑکے کو اچھی طرح پرکھیں گے۔ اگر وہ گارنٹی کے طور پر آمنہ کے نام کوئی جائیداد لگائے گا تو تب وہ شادی کرے گی۔ ورنہ ان امیر لوگوں کا کیا اعتبار کہ چار دِن عیش کی۔ کھایا پیا۔ نہایا دھویا اور چلتے بنے۔

آمنہ کو احمد پر اعتبار تھا مگر ابراہیم زمانہ شناس تھا۔ علی گارمنٹس کا مالک آمنہ کو شادی کی پیشکش کر رہا تھا تو ابراہیم اپنی عزت کی خاطر فی الحال تو خاموش ہو گیا تھا اس نے سوچ لیا تھا کہ یہ بڑے لوگ اپنا مطلب نکل جانے کے بعد غریب کی عزت کا مول چند روپے یا پھر قانون کا خوف ڈال کر غربت کی زبان پر اپنی دولت اور اپروچ کی مہر لگا کر اُسے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاموش کرا دیتے ہیں۔ اس نے سوچ لیا کہ آمنہ کی خوشی کی خاطر ہر کام خوش اسلوبی سے طے ہو جانے کے بعد وہ اس شادی سے انکار کر دے گا اور آمنہ کو یہ نوکری چھوڑنے کا حکم دے گا۔

آمنہ اور عائشہ بی بی نے ہر چیز کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور کچن میں گھس کر پک جانے والی ہنڈیا کی خوشبو بھی سونگھ کر تسلی کر لی۔ سبھی اپنی اپنی جگہ پر تھک کر بیٹھ چکے تھے مگر آمنہ کپڑے تبدیل کر کے ہلکا ہلکا میک اپ کرنے چلی گئی۔ ''کیا کہتی ہو عائشہ؟'' ابراہیم کی پیشانی پر فکر مندی کی لکیروں نے اپنا جال بُننا شروع کر دیا۔

''انسان کے مقدر اللہ تعالیٰ لکھتا ہے۔ وہ میرے کہنے یا تمہارے پوچھنے سے بدل نہیں جائیں گے۔'' بیوی کے اس جواب پر وہ اس کی طرف گہری نظر سے دیکھنے لگا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم بھی راضی ہو؟''

''دیکھو جگنو کے ابا!'' وہ ابراہیم کو سمجھانے والے انداز میں بولیں۔ ''آج کا دور بچوں کی پسند اور مرضی کا ہے۔ ہم نے پہلے ہی عفی کو کھو دیا ہے۔ غربت اور مفلسی کی گود میں پل کر جوان ہونے والے یہ بچے اگر ہماری عزت کرتے ہیں تو ہمیں عزت کروانی چاہیئے۔''

''اِن کی ہر بات مان کر؟'' لہجہ تلخ تھا مگر انداز دھیما ہی تھا۔

''ہاں!'' ابراہیم عائشہ بی بی کی طرف دیکھتا رہا۔ ''ان کی ہر جائز بات مان کر ہم ان کی اس محبت کا جواب بھی محبت سے دے سکتے ہیں جو یہ ہمیں عزت کی صورت میں دے رہے ہیں۔'' ابراہیم ایک لمبی سانس بھرتا ہوا بولا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایک آمنہ ہی تو ہے جو ہمارے ساتھ ضد کر سکتی ہے۔ عفی تو ویسے ہی چلا گیا۔'' ابراہیم دُور کہیں خلاؤں میں گھورتا ہوا بول رہا تھا۔ ''جگنو...... بے چارہ جھلّا کملّا جہاں بٹھا دو۔ کبھی اف نہیں کرے گا۔'' جگنو جو کہ دور کھڑا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ابراہیم اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''آج دربار پر گئے تھے؟'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ابا جی! ایک بات سناؤں؟'' جگنو کا انداز پیار بھرا تھا۔ ابراہیم اور عائشہ اس پر قربان ہو رہے تھے۔ ''جو بھی بات سنانی ہے مختصر سنانا۔ کیونکہ آمنہ کے افسر آنے والے ہیں۔'' اتنی دیر میں آمنہ بھی تیار ہو کر آ گئی تھی۔ جگنو اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''آمنہ باجی! پیاری لگتی ہو۔ نظر لگ جائے گی۔'' وہ یہ کہہ کر آمنہ کو شرمانے پر مجبور کر کے دوبارہ ابراہیم کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ابا جی! یہ حج کیا ہوتا ہے؟'' یہ سوال اس نے ایک بار پہلے بھی عائشہ بی بی سے پوچھا تھا۔ ابراہیم کو اس جھلّے سے اس سوال کی توقع نہ تھی۔ مگر اس کے ذہن میں اگر بات آ گئی تھی تو وہ بار بار تب تک پوچھتا رہے گا جب تک اس کو مطمئن نہ کر دیا جائے۔

''ہم مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے۔'' وہ ابراہیم کی بات غور سے سننے لگا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا انداز بالکل مجسمہ کی طرح تھا۔ ''ہمارے مذہب کے بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن حج بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر صاحب حیثیت ہو تو حج ضرور کرو۔ اللہ تعالیٰ کے گھر جا کر اس کے اردگرد طواف کرتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ سعی کرتے ہیں۔ زم زم پینا۔ ادب و احترام سے اس جگہ پر پھرنا۔ میدان عرفات جس میں قیامت کے دن تمام دُنیاؤں کے لوگ جمع ہونگے۔ اس میدان میں دو نفل ادا کرتے ہیں۔ خطبہ سننے کو حج کہتے ہیں۔ قربانی دی جاتی ہے۔ پھر مدینے شریف جا کر چالیس نمازیں بھی عبادت کا حصہ ہیں......'' ابراہیم ابھی بتا رہا تھا کہ جگنو بیچ میں ہی بول پڑا۔

''اچھا...... اتنا کچھ کرنا پڑتا ہے...... میں سمجھا تھا کہ ایک ہی دن سَو (۱۰۰) نمازیں ہوں تو حج ہوتا ہے۔'' اس کی بات سن کر سبھی ہنسنے لگے۔ ''پر میں تو اتنا کچھ نہیں کر سکتا۔''

''جب اللہ اپنے گھر بلاتا ہے تو سب کچھ کرنے کی توفیق بھی دیتا ہے۔'' ابراہیم نے کہا تو وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ ''حافظ جی کہتے ہیں ماں باپ کو پیار سے ایک بار دیکھو حج ہوتا ہے۔ میں آپ کو پیار سے دیکھتا ہوں نا''؟ اس سوالیہ انداز عائشہ بی بی کو بھا گیا اُنہوں نے جگنو کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''میرے پُتر سدا جیتا رہ ہمیں تم سے کوئی شکائیت نہیں ہے۔'' وہ اُٹھ کر ناچنے لگا۔ ''آ ہا۔ آ ہا جی میرا حج ہو گیا۔ آ ہا جی میں حاجی بن گیا۔'' وہ ناچتا ہوا باہر نکل گیا۔ ابراہیم اور عائشہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

دوسرے ہی لمحے جگنو ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ''آمنہ باجی۔ آمنہ باجی۔'' اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ سبھی اُسے حیرانگی سے دیکھنے لگے۔ ''آمنہ باجی! گلی میں ایک بڑی سی کار آ گئی ہے

اُس میں تمہارے افسر لگتے ہیں۔" آمنہ نے آخری بات سُنے بغیر ہی باہر والے دروازے کی طرف دوڑ لگادی۔

احمد ابھی دروازہ کھٹکھٹانے کیلئے ہاتھ ہی بڑھا رہا تھا کہ آمنہ نے دروازہ کھول دیا۔

"آیئے سر!" وہ شرمندہ سا ہو گیا مگر انتہائی خوشی بھی ہوئی کہ آمنہ دروازے پر اس کی منتظر تھی۔

"اسلام علیکم!" احمد نے اپنے خلوص انداز میں سلام کیا تو آمنہ نے منہ ہی منہ میں جواب دیا۔ وہ احمد کو لے کر صحن کی طرف بڑھی تو ابراہیم اور عائشہ بی بی حیرت سے احمد کو دیکھنے لگے اور یہی حالت احمد کی بھی تھی۔ وہ کبھی آمنہ کی طرف اور کبھی پھوپھا پھوپھی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جبکہ آمنہ ان تینوں کی کیفیت سے حیران ہو رہی تھی۔ وہ مزید حیران ہوئی جب احمد نے آگے بڑھ کر ابراہیم سے ہاتھ ملایا اور عائشہ بی بی نے اس کے سر پر پیار دیا۔

"یہ تمہارے افسر ہیں؟" ابراہیم نے آمنہ سے پوچھا تو وہ سر ہلا کر بولی۔ "جی ابو۔" "مگر یہ تو......؟" عائشہ بی بی کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ احمد خود بھی حیران تھا اور ان لوگوں کی حیرت سے بھی محظوظ ہو رہا تھا۔ تقدیر اُسے صحیح جگہ لے آئی تھی۔ وقت کے جس بے رحم لمحے نے اُسے ٹھوکر مار کر دُھتکار دیا تھا آج وقت اس بات کا ازالہ کرنے والا تھا۔

"یہ تو تمہارا ماموں زاد احمد ہے۔" عائشہ بی بی نے کہا تو آمنہ کے اندر چھناکے سے کوئی چیز ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گئی۔ اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ اس کی آرزوئیں اُمید اور آسیں سب خاک میں ملنے لگیں۔ اتنا بڑا اتفاق کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ احمد نے اُسے ٹھکرایا تھا۔ امیر زادی سے شادی کی خاطر! احمد نے بچپن کی منگنی کو اسی لیئے توڑا تھا کہ وہ غریب ہے۔ اس نے آمنہ کی صورت بھی دیکھنی گوارا نہ کی تھی۔ اس کے دل کے رسنے والے زخم پر مرہم رکھنے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔ رسمِ دُنیا کی خاطر بھی اس نے آمنہ سے مل کر ہمدردی نہ کی تھی۔

آج ایک بار پھر تقدیر آمنہ کو اسی احمد سے ملانے پر اصرار کر رہی تھی۔ جو شادی کر چکا تھا۔ کیا احمد آمنہ سے دھوکا کرنا چاہتا تھا؟ دوسری شادی کا جھانسہ دے کر اس کی عزت سے کھیلنا چاہتا تھا؟ اُسے کیا پتہ تھا کہ اس نے جو شکار پھانسا ہے وہ اس کا اپنا خون ہے۔ اپنی کزن سابقہ منگیتر ہے۔ اللہ نے تجھے بُرے وقت سے بچالیا ہے۔ آمنہ! سبھی باس۔ سبھی افسر سبھی امیر زادے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

آمنہ کے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا وہ روتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔

"آمنہ باجی! آمنہ باجی۔" جگنو اُسے پکارتا ہوا اس کے پیچھے ہی چلا گیا۔ احمد حیرانگی سے ان لوگوں کو دیکھنے لگا اُس کی سمجھ میں خود نہ آ رہا تھا کہ تقدیر نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہے یا اس کا ساتھ دیا ہے۔ وہ حیرانگی سے ان لوگوں کے کرب زدہ چہرے دیکھتا رہا۔

اور کتنے مذاق باقی ہیں تیرے ہم پر اے تقدیر
ہم کو بھی کبھی سوگ بطور عید منانے دو!!

☆☆☆

چھبیس اور ستائیس اکتوبر کے اخبارات میں جو شہ سُرخیاں تھیں دونوں حکومتوں کیلئے باعثِ شرم اور عوام کیلئے باعثِ تکلیف تھیں۔ کیونکہ تقریباً دو ہزار کے قریب مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر شہید کر دیا گیا تھا۔ کسی بھی گھرانے کے افراد کی تعداد پوری نہ رہ گئی تھی کسی کا بیٹا۔ بھائی۔ بہن۔ ماں۔ باپ یا پھر کوئی نہ کوئی رشتہ ایسا ضرور تھا جن کے بغیر زندگی گزارنا انتہائی کرب اور دُکھ کی بات تھی۔ ہر گھرانے سے کسی نہ کسی رشتے کو خون کی ندی میں غسل کرنا پڑا تھا۔

مگر خلیل احمد اس بستی کا واحد نوجوان تھا جس کے گھر میں ایسی عبرت ناک موت نے ڈیرہ ڈالا تھا کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھا ہر گھر سے کوئی نہ کوئی ایک دو فرد اس سانحے کی بھینٹ چڑھے تھے مگر خلیل احمد کے گھرانے کے کل گیارہ افراد میں سے صرف خلیل احمد ہی بچ پایا تھا۔ دس افراد کو اس منحوس آگ نے اپنی لپیٹ میں لے کر اپنا لبادہ بنایا تھا۔ وہ سٹیشن پر باری باری جلی ہوئی لاشوں میں سے نشانیوں کے باعث اپنے پیاروں کی لاشیں شناخت کرتا رہا اور آخری لاش اپنی ماں کی شناخت کرنے کے بعد وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ وہ اپنی سُدھ بدھ میں نہ تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح ہنستا ہوا سڑک کے بیچوں بیچ بھاگتا جا رہا تھا۔ اس کا گریبان چاک ہو گیا تھا۔ سر کے بال اس طرح بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے کہ کوئی سؤر فصل اجاڑ کر گیا ہو۔ آنکھوں میں وحشت اور ویرانی تھی۔ منہ سے رالیں ٹپکنے سے اس کا گریبان تر ہو گیا تھا۔ چہرے پر سوگ اور کرب کی دبیز چادر چڑھ گئی تھی۔ وہ بھاگتا بھاگتا یکدم رک جاتا ادھر اُدھر دیکھتا اور پھر اونچی اونچی آواز میں "امی جی......ابو جی...... امی......امی...... پکارتا ہوا رونے لگتا۔ اس کے آس پاس سے گزرنے والے بھی گو کہ تکلیف اور کرب میں مبتلا تھے مگر اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر پتھر بھی پگھلنے لگے تھے۔ وہ جن بازاروں اور گلیوں میں بھاگتا ہوا اپنے پیاروں کو آوازیں دیتا تھا ان گلیوں بازاروں کے خس و خاشاک بھی اس

کے دُکھ اور غم میں برابر کے شریک ہو کر آہ وزاریاں کرنے لگتے تھے۔

وہ بھاگتا ہوا کبھی تھانے میں گھس جاتا اور کبھی مندر میں گھس جاتا اور کبھی مسجد کے باہر کھڑے ہو کر اُس کے واحد مینار کو اس انداز میں تکتا رہتا کہ گویا رب واحد کی وحدانیت بیان کرنے والے اکلوتے مینار کو جو بالکل الف کی مانند کھڑا تھا کو دیکھ کر اپنے اوپر ظلم کی داستان سنانے لگتا۔ پھر نجانے اس کے من میں کیا سماتی کہ وہ دیوانہ وار بھاگنے لگتا ٹریفک کے اژدھام اور شور کی پرواہ کیئے بغیر اس بات سے بھی بے نیاز کہ اس کی جان کو کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ مگر جو حادثہ اس کی آنکھوں نے دیکھ لیا تھا۔ دماغ نے بسا لیا تھا۔ دل نے قبول کر لیا تھا اس حادثے نے اس کی جان کی قدر و قیمت اور اہمیت ختم کر دی تھی۔

پولیس کا محکمہ اپنے اعلیٰ افسران کے حکم کے مطابق مسلمانوں کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے میں مصروف تھا اُسے اس ملک کی اکثریت کا ظلم اور تشدد نہ نظر آ رہا تھا جو اُنہوں نے اقلیتوں پر کیا تھا۔ اکثریت اور انتہا پسندوں کے خلاف سب سے بڑا اور چلتا پھرتا ثبوت خلیل احمد تھا مگر اس زندہ اور حقیقی ثبوت سے بھی نے آنکھیں موند رکھیں تھیں اور مُردوں کی خاک چھان چھان کر مسلمانوں کو گنہگار اور ظالم ثابت کرنے کے ثبوت حاصل کیئے جا رہے تھے۔

اپنی ہی دُھن اور روش میں مگن خلیل احمد دیوانہ وار امی امی پکارتا ہوا ایک تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا کر گر گیا۔ اتنا بھلا ہوا کہ گاڑی سے خلیل احمد ٹکرایا تھا اگر گاڑی اس سے ٹکرا جاتی تو پھر اس کی جاگتی آنکھیں بھی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سو چکی ہوتیں۔ گاڑی والا جلدی سے باہر نکلا اور خلیل احمد کو سڑک سے اُٹھا کر اس کی حالت دیکھ کر لرز گیا۔ وہ ٹک ٹک اُسے دیکھے جا رہا تھا مگر خلیل احمد گاڑی والے کی طرف نہ دیکھ پا رہا تھا۔

"خلیل احمد" ڈرائیور نے اُسے پہچان لیا تھا۔ مگر اس کے پکارنے پر بھی خلیل احمد اپنی آواز میں امی امی پکار رہا تھا۔ "میری طرف دیکھو...... میری طرف دیکھو خلیل احمد...... مجھے پہچانو...... مجھے پہچانو خلیل احمد......"

گاڑی ڈرائیور کے آنسوؤں کی جھڑی لگنے لگی۔ مگر خلیل احمد نے غور اور توجہ کرنے پر بھی احمد کو پہچانا تو اس نے خلیل احمد کو اپنے سینے سے لگا کر زور سے بھینچتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا استاد ہوں خلیل احمد [illegible] تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ مجھے پہچانو میں پروفیسر فائز ہوں...... میری طرف [illegible] ہوں" مگر خلیل احمد ان کی بانہوں میں ہی جھول گیا۔ اُنہوں نے موقع پر اکٹھے

ہونے والے "تماشائیوں" کی مدد سے خلیل احمد کو اپنی گاڑی میں ڈالا اور نامعلوم منزل کی جانب لے گئے۔ جمع ہو جانے والا مجمع چھٹنے لگا کیونکہ جگہ جگہ تماشا لگا ہوا تھا۔ اور یہ وہ تماشائی تھے جو صرف تماشہ بننے والے کو دیکھ کر تالیاں بجانا اپنا فرض سمجھتے تھے اُنہیں اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ وہ جس کا تماشہ دیکھ رہے ہیں اس کے چہرے پر دُکھ اور آنکھوں میں نظر آنے والا کرب کیا کہانی بیان کر رہا ہے؟......!!!

کُندن کو جب ہوش آیا تو اس کے ہوش کوچ ہوتے ہوتے رہ گئے کیونکہ اُسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ قرآن کریم کو اپنے سینے سے چمٹائے مسجد کی جانب بھاگ رہا تھا تو بیچ سڑک کے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ مگر اب اس کی آنکھ کھلی تو ارد گرد جلتی ہوئی مساجد یا مسلمانوں کے گھر نہ تھے بلکہ ایک پُر سکون آرام دہ کمرہ تھا جس بیڈ پر وہ لیٹا ہوا تھا اس کا گداز گدا اس کے وجود کو سکون پہنچا رہا تھا۔ اُس نے اپنے حواس کو مجتمع کر کے غور کیا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ہی گھر میں اپنے کمرے میں اپنے ہی بیڈ پر پڑا ہے۔

اُسے اپنے بازو میں چبھن کا احساس ہوا تو اُسے ڈرپ سٹینڈ کے ساتھ لگی ہوئی گلوکوز کی بوتل نظر آ گئی۔ پھر اُس نے اپنے بازو کو تکلیف دہ انداز میں حرکت دے کر سر پر بندھی ہوئی پٹی کو بھی محسوس کر لیا۔ اس کے پورے وجود میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ وجود کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی نے اس کی نسیں کھینچ دی ہوں۔ اس کی ہڈیوں کو کسی حمام دستے کی مدد سے کوٹ کر ملیدہ بنا دیا ہو۔

"مگر میں یہاں کیسے پہنچا؟" یہ سوال وہ اپنے آپ سے کر کے رہ گیا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے دماغ میں وہ تمام مناظر فلم کی مانند چلنے لگے تھے۔ اس نے قرآن کریم کو جلنے سے کیوں بچایا تھا۔ وہ تو مسلمان نہ تھا اُسے کیا۔ جہاں اور بھی قران اور اسلامی کتب گھروں اور انسانوں کے ساتھ ساتھ شہید ہو گئیں تھیں وہ اس قرآن کو بھی جلنے دیتا اور خاموشی سے کھڑا دوسرے ہندوؤں کی طرح تماشہ دیکھتا رہتا۔ مگر نہیں......

اس کے ضمیر نے اُسے جھنجوڑ دیا۔ اس کی رُوح تڑپ کر رہ گئی۔ اس کی حمیت نے گوارا نہ کیا کہ وہ قرآن کو جلنے دے۔ وہ دیوانہ وار بھاگا تھا۔ اُس نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا تھا اُس نے دِل کی سچی گواہی کو اہمیت دی تھی کہ صرف اسلام ہی سچا مذہب ہے۔ اور اس کی سچی کتاب بھی قرآن کریم ہے۔ اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ کُندن بھاگو اور قرآن کو جلنے سے بچاؤ تا کہ آخرت اور

ڈُنیا میں تم جلنے سے بچ سکو۔

بس کندن کو جوت لگ گئی تھی اس نے قرآن کریم کی حُرمت اور پاکیزگی پر کوئی حرف نہ آنے دیا تھا۔اس نے اپنے آپ کو آگ میں جھونک کر قرآن کی اس طرح حفاظت کی تھی کہ اس کے ورق تو کیا کسی بھی لفظ تک آگ کے بدتمیز شعلوں کو پہنچنے نہ دیا تھا۔

اُسے کندھے میں شدید تکلیف کا احساس جاگا تو اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔اس کی کھلی ہوئی آنکھوں نے جو پہلے چہرہ دیکھا وہ اس کی ماں مہارانی کا تھا جس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں وہ بڑے افسوس اور دُکھ سے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔کندن ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا اُسے اپنی تکلیف بھول گئی وہ اُٹھنا چاہتا تھا مگر "لیٹے رہو کندن!" کی آواز سن کر نظریں آواز کی سمت دوڑائیں تو پاپا پرساد چوپڑہ اور خاندان کے دوسرے تمام افراد کے ساتھ ساتھ پوجا بھابی کی بہن کاجل کو بھی چہرے پر دُکھ سجائے کھڑے پایا۔

یہ سب لوگ اس کے بیڈ کے گرد اس طرح کھڑے تھے گویا کہ اُسے آگ لگا کر اس کی چتا بنانے والے ہوں اور پھر اس کی راکھ اکٹھی کر کے کسی مقدس دریا میں بہانے کیلئے بے چین ہوں۔

مگر کندن نے اس دُنیاوی آگ میں جل کر مرنے کی بجائے باعزت طور پر اسلامی اصولوں اور شریعت کے قوانین کے مطابق مرنے کے بعد دفن ہونے کو ترجیح دینے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ اس کے ضمیر کی آواز تھی اور جس کا ضمیر زندہ ہو وہ شخص کبھی بھی جلنے کا سودا کسی بھی قیمت پر نہیں کر سکتا۔

"کیسے ہو کندن بیٹے!" چوپڑہ صاحب کی آواز میں چھپی ہوئی تلخی کندن نے محسوس کر لی تھی۔اس نے آنکھوں کے اشارے سے اپنے ٹھیک ہونے کی اطلاع دی تھی۔"گڈ! مجھے تم پر اعتبار اور اعتماد ہے کہ تم اپنی تکالیف کو جلد ہی کور کر لو گے۔" یہ کہہ کر چوپڑہ صاحب باہر نکل گئے۔

موہن چند اور پوجا بھابی بھی چلے گئے۔کنگنا' کاجل اور مہارانی اس کے بیڈ کے گرد کرسیاں بچھا کر بیٹھ گئیں۔

"کندن!" مہارانی نے اُسے پکارا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔"بیٹا!......جتنی تکلیف تم نے سہہ لی ہے......کوشش کرنا کہ مزید کوئی بھی عذاب تم پر نہ آئے۔" مہارانی کی آواز میں نمی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔وہ کرسی سے اُٹھتی ہوئی بولی۔"میں نے گھر میں پوجا کا بندوبست کیا ہوا ہے۔تمہارے صحت یاب ہونے کی خوشی میں۔میں چلتی ہوں۔بھگوان سے پرارتھنا کروں گی کہ تم جلد صحت یاب ہو جاؤ۔" وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

"تم اس طرح تو بالکل ہی اچھے نہیں لگتے ہو۔" یہ کنگنا تھی جو بھائی پر جان وارنے کیلئے ہر وقت تیار رہتی تھی۔"بس اس سڑے ہوئے منہ کو مزید مت پھلاؤ اور مسکرا دو۔کیونکہ مسکان ہی تمہارا سمبل ہے......او کے......" کندن مسکرانے لگا۔"گڈ! یہ ہوئی ناشیروں والی بات۔" کنگنا کے چہرے پر بھی مسکان پھیل گئی۔"کندن بھیا! جلدی سے اچھے ہو جاؤ......دیوالی آ رہی ہے۔میں تمہیں راکھی باندھنے کو بے چین ہوں۔" وہ کاجل کو کہنی مارتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

"تم بھی کوئی نصیحت کرو۔" وہ کاجل کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"یہ سب کیوں کر رہے ہو کندن؟" کاجل تاسف سے بولی۔اُسے پوجا بھابی نے بلایا تھا۔وہ چاہتی تھی کہ اس پریشانی میں کندن کو کاجل کا ساتھ حاصل رہے۔

"کیا کر رہا ہوں میں؟" کندن کو اس بات کا شک تھا کہ پوری فیملی کو پتہ چل گیا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی خاطر ہندو جتھے سے ٹکر لی ہے۔اور قرآن کی حفاظت کیلئے اپنی جان بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کیا۔وہ اس شک کو کاجل سے کنفرم کرنا چاہتا تھا۔

"اپنی جان پر ظلم کیوں کر رہے ہو؟"

"پگلی! میں کوئی جان بوجھ کر زخمی ہوا ہوں؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟ تم نے کوئی بڑا معرکہ سر کیا ہے؟" وہ جل کر بولی تو کندن ہنسنے لگا۔

"اگر اللہ کو میری یہ چھوٹی سی کوشش پسند آ گئی تو معرکہ ہی ہوگا۔" یہ بات کاجل نہ سن سکی کیونکہ کندن کا انداز خود کلامی کا تھا۔"دیکھو کندن" وہ اُٹھ کر اس کے بیڈ کے پاس آ گئی اس نے کندن کا ہاتھ پکڑ کر چوما اور بولی۔"کوئی بھی کام کرنے سے پہلے یہ ضرور یاد رکھنا......کوئی تمہیں بہت چاہتا ہے۔" وہ کندن کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔"کتنا چاہتی ہو مجھے؟" عام سا سوال تھا۔

"بھگوان سے بھی زیادہ۔" وہ ابھی تک کھوئی کھوئی سی بول رہی تھی۔

"مگر میں تو بھگوان کو چاہتا ہوں۔" کندن کا یہ تیر سیدھا ٹھیک نشانے پر لگا اس نے تڑپ کر کندن کا ہاتھ چھوڑ دیا۔اس کے لب پھڑپھڑانے لگے۔آنکھوں سے خوشی چھلکنے لگی۔

"سچ کہہ رہے ہو کندن؟" کاجل کو اپنی سماعت پر یقین ہی نہ ہو رہا تھا۔وہ اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتا ہوا بولا۔"ہاں......کاجل! جس طرح کوئی پیار کرنے والا اپنے محبوب کو محبت سے جس نام سے بھی پکارے اس کا اصل نام ہی اس کی پہچان ہوتا ہے۔بالکل میں بھی اُس ہستی کو

مختلف ناموں سے جانتا ہوں جس کا نام ہر مذہب' ہر ملک' ہر زبان ہر قوم اور ہر ایک کیلئے ہے تو ایک مگر اُسے یاد اپنی اپنی زبان۔ مذہب اور ملک کی ثقافت کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ اس ان دیکھی ہستی کو کائنات کے تمام لوگ پیار کرتے ہیں مگر اعتقاد اور اعتماد اپنے اپنے ملکوں اور مذہب کے حساب سے کرتے ہیں۔" وہ خاموش ہوا تو کاجل کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"ایسا مت کرو کندن...... میں تمہارے ہجر کی آگ میں جل جاؤں گی۔"

"تو پھر اس آگ کے سمندر کو پار کرنے کیلئے مجھے تنہا ہی چھوڑ دو۔ میں دُنیا اور آخرت کی آگ سے بچنا چاہتا ہوں۔" "تمہیں کسی نے بہکا دیا ہے کندن! جو بھگوان نظر ہی نہ آئے اس کی پوجا کیسے کی جا سکتی ہے؟" کاجل نے اپنے مذہب کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔ کندن کے ہونٹوں پر مُسکان پھیل گئی۔

"جو نظر نہ آئے وہ اللہ ہے۔ اور جو نظر آ جائے وہ بھگوان ہے۔" کاجل نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ دھیرے سے چھڑا کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ "کاجل! بھگوان اپنے ہاتھوں سے بنایا جا سکتا ہے۔ اُسے سجایا اور سنوارا جا سکتا ہے۔ اُسے ٹھیک نہ بننے پر پھر توڑا جا سکتا ہے پھر بنایا جا سکتا ہے...... مگر اللہ......" کاجل نے اس کی طرف پُشت کر لی تھی مگر کندن جانتا تھا کہ وہ اس کی باتیں غور سے سن بھی رہی ہے اور سمجھ بھی رہی ہے۔ وہ پھر بولا۔ "اللہ ایک ہے۔ وہ بڑا بے نیاز ہے۔ وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اس کا کوئی ہمسر اور ثانی نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں تنہا ہے اُسے کسی نے نہیں بنایا مگر یہ سب کچھ اس کے ایک لفظ کہنے سے ہی بن گیا تھا۔ جانتی ہو۔ وہ لفظ کون سا ہے؟" "کُن فَیَکُون ہو جا! اس نے فرمایا اور یہ سب کچھ ہو گیا۔" کاجل اس کی طرف غصے سے مُڑی۔ "یہ سارا فتور تمہارے ذہن میں مسلمانوں کی مقدس کتاب نے بھرا ہے...... میرا بس چلے تو ساری دنیا میں ایسی تمام کتابوں کو......" کاجل کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کندن زوردار آواز کے ساتھ دھاڑا۔

"کاجل!" اُسے محسوس ہونے لگا کہ سر کا درد یکدم اونچا بولنے سے بڑھ گیا ہے۔ اس نے اپنے لہجے کو دھیما کرنے کی کوشش کی! "اگر قرآن کے بارے میں ایک بھی غلط لفظ اپنے منہ سے [illegible] خدا کی قسم زبان کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گا۔" گو اس کا لہجہ دھیما تھا مگر الفاظ کی سختی اور اس [illegible] نے کاجل کو بھی سیخ پا کر دیا تھا۔

[illegible] نے والے مسلمان کو یہ مذہب کے جاگیردار اپنی حویلیوں میں

کتوں کے ساتھ باندھتے ہیں۔ اور تم جس قرآن کی باتیں کر رہے ہو نا...... وہ انکل نے تمہارے کمرے سے اُٹھوا دیا ہے۔ دیکھ لو!" وہ الماری کی طرف اشارہ کرتی ہوئی پیر پٹخ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

کندن نے بڑے کرب سے الماری کی طرف دیکھا۔ اس کی کراہ نکل گئی۔ کیونکہ پرساد چوپڑہ نے لاک کی چابی نہ ملنے پر الماری کا تختہ ہی اُکھڑوا دیا تھا۔ وہ دُکھ اور تاسف سے الماری کو دیکھتا رہا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر گالوں پر لکیریں بنانے لگے۔ یکدم وہ جوش میں آ گیا۔ اس نے ڈرپ کی سوئی نکال کر اپنے ہاتھ کو گلوکوز کی بوتل سے آزاد کیا۔ پھر وہ چیختا ہوا ڈرپ اسٹینڈ اُٹھا کر دیوار سے مارنے لگا۔

"مجھے بچانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو......؟" اس کی آواز نیچے لان میں پوجا کرنے والے تمام افراد کو لرزانے لگی۔ "مجھے مر جانے دو! مجھے زندہ نہیں رہنا...... مجھے مر جانے دو...... اگر میری زندگی چاہتے ہو تو میرا قرآن مجھے واپس کر دو...... میں زندہ رہنا چاہتا ہوں...... مجھے مت مارو۔ مجھے قتل نہ کرو۔" آنسوؤں کی جھڑی کے ساتھ ہی اس کے حواس اُس کا ساتھ چھوڑنے لگے وہ سر کو پکڑتا ہوا دھڑام سے زمین پر بچھے ہوئے قالین پر گر پڑا۔ وہ دُنیا و مافیا سے بے خبر ہو گیا تھا۔

☆☆☆

آمنہ اپنا استعفیٰ لے کر احمد کے آفس پہنچی تھی مگر احمد نے اس کا استعفیٰ پھاڑ دیا تھا۔ وہ کافی دیر سے خاموش ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ احمد نے کافی منگوائی مگر وہ بھی پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی تھی حالانکہ آمنہ کو گرم کافی پسند تھی۔ احمد اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ دو دِنوں میں آمنہ کا چہرہ اُتر گیا تھا اور ایسی ہی کیفیت احمد کی بھی تھی وہ بھی دو دِن اور دو راتوں سے مسلسل جاگ رہا تھا۔

"آمنہ!" مگر وہ کوئی بھی تاثیر نہ دے سکی۔ احمد جانتا تھا کہ وہ اس کی بات توجہ سے سن رہی ہے۔ "میں نہیں جانتا تھا کہ تم میری کزن ہو...... مگر محبت رشتوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ تو ذات پات۔ رنگ نسل اور مذہب کی تفریق سے پاک اور بالاتر ہوتی ہے...... میرا جرم یہ ہے کہ میں نے تم سے ایک نظر دیکھتے ہی محبت کی ہے۔" وہ پیپر ویٹ کو میز پر گھمانے لگا۔ "میں آج شام کو گھر آ رہا ہوں۔" اس فقرے پر وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ "پھوپھا جی اور پھوپھو سے بات کرنے۔"

"کیسی بات؟" وہ ٹھٹک کر بولی۔ "کیا اب بھی آپ کے پاس کہنے کو کچھ ہے؟"

''مگر میں نے کونسا ایسا جرم کیا ہے کہ تم مجھے اور میری محبت کو ٹھکرا رہی ہو۔'' وہ تاسف سے بولا۔ ''آپ مجھ سے دوسری شادی کرنا چاہتے تھے؟''

''کم آن یار!'' وہ جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''میں نے اُسے چھوا تک نہیں۔ تو پھر پہلی اور دوسری شادی کیسے ہوگئی؟''

''میں نہیں جانتی کہ ایک دُلہن اور دُلہا حجلہ عروسی میں جائیں اور..........'' اس سے آگے اُسے شرم آ گئی اور وہ خاموش ہوگئی۔ وہ لجاجت سے بولا۔ ''میں ساری بات پھوپھا جی اور پھوپھو کو بتا چکا ہوں۔''

''اگر وہ حجلۂ عروسی سے نہ بھاگتی......'' وہ طنزیہ انداز میں بولی تو احمد نے انگلی کھڑی کر کے اس کی بات کاٹ دی۔

''ایک منٹ...... ایک منٹ وہ بھاگی نہیں بلکہ اس کا باپ آ کر اُسے لے کر گیا ہے کئی مہمانوں اور شُرفاء کے سامنے۔''

''مجھے اسے غرض نہیں کہ وہ گئی ہے یا بھاگی ہے...... اگر وہ آج بھی آپ کی بیوی ہوتی تو کیا پھر بھی آپ مجھ سے محبت کرتے اور اتنی ہی محبت کرتے......؟'' اس کے سوال میں الفاظ وزنی تھے مگر لہجہ بم سے بھی زیادہ طاقتور تھا۔ احمد سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ اس لڑکی کو کیسے قائل کرے اور اپنی محبت اور بے گناہی کا ثبوت کیسے دے۔

''دیکھو آمنہ!'' وہ ٹھنڈی سانس بھرتا ہوا بولا۔ ''نصیبوں اور تقدیر سے شکوے فضول ہیں۔ اگر وہ میری بیوی ہوتی تو میں پھر بھی تُم سے ہی محبت کرتا۔'' وہ آنکھیں اُٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی جہاں معصومیت اور محبت پھیلی ہوئی تھی۔ ''میری اس بات کا یقین کرو اور پھر میں اس بات سے بھی قطعی لاعلم ہوں کہ مما نے مجھے بالکل ہی نہیں بتایا کہ تم بچپن سے میرے نام کے ساتھ منسوب ہو اور پھر میں اس بات سے بھی قطعی لاعلم ہوں کہ مما نے تمہاری اور میری منگنی یہ کہہ کر توڑ دی کہ تم لوگ غریب ہو...... مجھے اس بات کا تاحیات دُکھ اور افسوس رہے گا۔'' اس کی آواز بھیگنے لگی۔ ''میں پھوپھا جی اور پھوپھو کی عظمت کو سلام کرتا ہوں کہ وہ اپنی بیٹی کی خوشیوں کو پسِ پشت ڈال کر میری خوشی میں شریک ہوئے...... میری آنکھوں میں دیکھو آمنہ!'' اس نے کرسی سے آگے بڑھ کر آمنہ کے ہاتھ پکڑ لیئے آمنہ نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ ''میں نے دِل کی گہرائی سے تمہیں چاہا ہے وہ میری ماں ہے...... مگر اُنہوں نے مجھے جن حقیقتوں سے بے خبر رکھا اس پر میں

تم سے شرمندہ ہوں اور تقدیر کی بازی دیکھو...... کہ جس عورت نے تمہیں غریب کہہ کر ٹھکرایا تھا آج اس کے گھر کو تمہاری ہی ضرورت پڑ گئی ہے...... اگر تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی...... تو مجھے انتہائی دُکھ ہوگا۔ تمہیں بھی کوئی اچھا رشتہ مل جائے گا اور مجھے بھی...... مگر ذرا یہ تو سوچو کہ میری شادی چند منٹ بعد ہی کیوں ناکام ہوگئی؟ تم میرے آفس کیوں آئی۔ مجھے ایک ہی نظر میں تم سے محبت کیوں ہوئی۔ مجھے تمہارے گھر جا کر معلوم ہوا تھا کہ تم میری کزن ہو۔ مگر تقدیر ہم دونوں کو ملانے پر بضد ہے...... اگر اس بار ہم نے تقدیر کی بات نہ مانی تو یاد رکھو آمنہ!'' وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''قدرت کے دیئے گئے انعام کو ٹھکرانے والے ساری زندگی خوشیاں تلاش کرتے رہتے ہیں...... مگر تقدیر کسی بھی تاوان سے راضی نہیں ہوتی۔'' وہ یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا لیکن آمنہ کو دِل و جان سے لرزا گیا تھا۔

وہ گہری سوچوں میں گُم ہوگئی تھی۔ احمد کے الفاظ اور تقدیر کی ہیرا پھیری نے اُسے ایک بار پھر اسی نام اور اسی شخص سے منسوب ہونے کا عندیہ دینا شروع کر دیا تھا۔ بچپن سے لیکر جوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھنے تک جس کے خواب دیکھے تھے۔ کچھ بھی نہیں بگڑا تھا۔ احمد انجانے اور بھولپن میں شادی کر گیا تھا۔ مگر وہ سدا سے اس کیلئے بنا تھا اور اسی کا تھا۔ اس کے لہجے اور باتوں کی سچائی اور پھر اس نے اماں اور ابا جی کو جھوٹ تو نہیں بتایا ہوگا۔

ان ساری باتوں کو ایک طرف رکھ دو آمنہ! اس نے خود ہی سوچا۔ دل پر ہاتھ رکھ کر کہو کیا تم بھی احمد سے پیار نہیں کرتی؟ اس کی محبت کو پانے کیلئے اپنے اندر کے انسان سے لڑتی نہیں رہی؟ احمد کی قربت پانے کیلئے تم نے ہر قسم کا تاوان ادا کرنے کا تہیہ نہیں کر رکھا؟ کیا تم اور تمہارا اعتماد جھوٹا ہے؟ کیا تمہاری محبت اس کیلئے فریب تھا؟ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر تم نے اُسے چاند کی شبیہہ میں نہیں دیکھا؟ کیا اس کی محبت اور اس کی باتوں کو تاروں کی تعداد کے مطابق نہیں گنا۔ کیا تم نے یہ نہیں سوچ لیا تھا کہ اگر احمد تمہیں نہ ملا تو تم ساری زندگی اُسے دِل سے نہ نکال سکو گی؟ ''نہیں...... نہیں'' اگر یہ سب سچ ہے آمنہ تو پھر تقدیر کے فیصلے اور احمد کی محبت کو ٹھکرا کر کیوں کفرانِ نعمت کر رہی ہو؟ اللہ کے فیصلوں پر آمین کہتے ہیں۔ اس کے فیصلوں کی نفی اس کی ذات کی نفی ہے۔ اور اس کی ذات کی نفی کرنے والا اس کے عذاب کو کسی بھی تاوان سے سرخرو ہو کر ٹال نہیں سکتا۔ کہیں ایسا نہ ہو آمنہ بی بی کہ تم آج احمد کی محبت ٹھکرا دو اور پھر تقدیر تمہیں محبت اور پیار کیلئے در بدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دے۔ قدرت کا فیصلہ مان لو تا کہ تمہاری جھولی محبت کی سوغات سے بھر دی جائے۔

یہ اس کی سوچوں اور اندر کے انسان کی راہنمائی تھی۔ اُنہوں نے تو اُسے سیدھے راستے پر ڈال دیا تھا اب فیصلہ اُسے خود کرنا تھا۔ احمد...... یا پھر سدا کیلئے اپنی جھوٹی انا کی قید؟

☆☆☆

''اُس نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے......'' ابراہیم اور عائشہ بی بی آمنہ کو سمجھا رہے تھے۔

'' کتنے ارمان اور چاؤ سے اس نے گھر بسانے کی آرزو میں دل میں بسائی ہونگی۔''

''یہ تو سچ ہے عائشہ بیگم!'' ابراہیم آمنہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''کسی کے ارمانوں کا خون کر کے خوشیاں منانے والے خوشیوں کو ترسنے لگتے ہیں...... میری بیٹی کی ذات کو غربت اور افلاس کا طعنہ دے کر احسن نے نفی کر دی تھی۔ تقدیر کا انصاف دیکھو......'' وہ خاموش ہوا تو عائشہ بی بی بولیں۔

''بعض اوقات انسان کے غلط فیصلوں پر تقدیر کو پردہ ڈالنا پڑتا ہے۔ اور بعض اوقات انسان کے صحیح فیصلے تقدیر کو چیلنج لگتے ہیں تو پھر مقابلہ میں ہمیشہ جیت انسان کی ہوتی ہے کیونکہ وہ صحیح ہوتا ہے۔'' وہ آمنہ کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتی ہوئی بولیں۔ ''آمنہ! احمد آتا ہے تو بات کرتے ہیں...... میری بچی تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟'' آمنہ باری باری ان دونوں کے منہ دیکھ کر رہ گئی۔

''میں احمد سے شادی پر راضی ہوں مگر......؟'' وہ خاموش ہوگئی تو ابراہیم بول پڑا۔ ''مگر کیا بیٹی......؟''

''میں احمد سے شادی اس شرط پر کروں گی کہ میں اس گھر میں نہیں جاؤں گی بلکہ احمد کے ساتھ علیحدہ گھر میں رہوں گی۔'' دونوں میاں بیوی کو چپ لگ گئی تو آمنہ ٹھہرے ہوئے لہجہ میں پھر بولی۔ ''ممانی احسن مجھے کبھی بھی بہو کے روپ میں قبول نہیں کریں گی اور میں نہیں چاہتی کہ احمد کی یہ شادی بھی ناکام اور خراب ہو۔'' وہ یہ کہہ کر اُٹھی اور والدین کو حیرت واستعجاب میں مبتلا چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''اگر احمد سے محبت کرتی ہو تو پھر یہ سارا ناٹک کیوں کر رہی ہو؟'' اندر سے ایک اور آمنہ بولی جو اس باہر والی آمنہ کی ہمیشہ رہنمائی کرتی تھی۔ جواب بہت ضروری تھا۔ ''میں احمد سے محبت کرتی ہوں انٹرویو والے دن سے آج تک اور آج کے بعد سے قبر کی دیواروں تک احمد کو چاہتی رہی ہوں اور چاہتی رہوں گی۔''

''تو پھر اس کی ماں کے ساتھ اس گھر میں رہنے پر تمہیں کیا اعتراض ہے؟''

''ہم غریبوں کے پاس بھی عزت وناموس ہوتی ہے جو ہمیں جان سے پیاری ہے۔ ممانی احسن اگر پیسے والی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ میرے والدین کی انسلٹ کرے اور انہیں گھر سے دھتکار کر نکال دے۔ اُنہیں چور کہہ کر ان کی تلاشی لے۔ میں ایسی عورت کے ساتھ ایک چھت تلے ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔''

''تو یوں کہو نا کہ تم نے اس عورت سے ہار مان لی ہے۔''

''نہیں!...... میں نے اس عورت کو جیتا ہے۔ اپنی انا اور احمد کی محبت کے بل بوتے پر...... میں کامیابی کی طرف بڑھ رہی ہوں۔''

''اگر احمد نے تمہاری یہ شرط نہ مانی تو......؟''

''تم دیکھنا...... جیت ہمیشہ کی طرح میرے اعتماد کی ہوگی۔'' آمنہ نے اندر کی آمنہ کا منہ بند کرا دیا تھا۔ جگنو کے اس طرح اچانک اندر آ جانے پر وہ چونک گئی۔ ''آمنہ باجی وہ تمہارے افسر آئے ہیں...... ماموں بھی ساتھ ہی آیا ہے۔'' اختر علی کا سن کر آمنہ حیران رہ گئی۔ اُسے یہ توقع نہ تھی کہ احمد اتنا بڑا قدم اُٹھالے گا۔ وہ جگنو کے ساتھ ہی باہر چلی آئی ابھی احمد اور اختر علی ٹھیک طرح بیٹھ بھی نہ پائے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ جگنو نے اُنہیں گھر کے دروازے پر ہی دیکھ کر آمنہ کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔

''اسلام علیکم! ماموں جی۔'' اختر علی نے مسکرا کر آمنہ کی طرف دیکھا اور شرمندگی سے آنکھیں جھکائے ہوئے آمنہ کو پیار دیا۔ احمد اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا یا الگ بات تھی کہ اس کی آنکھیں مسلسل جاگنے سے گلابی ڈوروں کی وجہ سے شرابی لگنے لگی تھیں۔ آمنہ نے اس کی طرف مصنوعی غصے سے دیکھا تو اس نے اختر علی کی طرف اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ وہ تگڑی سفارش لے کر آیا ہے۔ وہ آمنہ کو دل وجان سے چاہتا ہے اور حاصل بھی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے نہ جانے ماموں کو کس طرح راضی کیا ہوگا؟

صحن میں بچھی ہوئی پلاسٹک کی دو کرسیوں پر احمد اور اختر علی بیٹھ گئے تھے اور عائشہ بی بی اور ابراہیم چارپائی پر جبکہ آمنہ موڑھے پر بیٹھ گئی۔ جگنو کھڑا تھا وہ سب کے چہروں کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو کہ کیا بات ہونے والی ہے؟

چند لمحات گزر گئے تو آمنہ اُٹھ کر کولڈ ڈرنکس گلاسوں میں ڈال کر لے آئی۔ احمد نے گلاس

پکڑتے ہوئے آمنہ کو چھیڑا۔ ”میں نے پیالی میں چائے پینا تھی۔“ اس کے اس فقرے پر سبھی ہنس پڑے۔ آمنہ کولڈ ڈرنک دے کر اندر جا کر دروازے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

”تمام آفات سرمایہ دارانہ نظام کا نتیجہ ہیں۔“ اختر علی نے اپنی بات شروع کی وہ جانتا تھا کہ بھائی ابراہیم الفاظ کی لغات ہیں ان کے سامنے اچھے اور معتبر الفاظ استعمال کرنا اختر علی کی مجبوری تھی۔ ”مگر میں نے جس حد تک سمجھا اور سنا ہے قانون شریعت میں امیر اور غریب کا امتیاز نہیں۔“ احمد باپ کی طرف دیکھ کر رہ گیا کیونکہ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ اختر علی دولت اور امارت کی باتیں کر کے کیا ثابت کرنا چاہتا ہے۔ ”روپیہ اور اچھا کاروبار اس دور میں انسان کی مجبوری بن گیا ہے۔ لیکن اتنا روپیہ اور اچھا کاروبار ہونے کے باوجود بھی میں ایک بار پھر اعتراف کرتا ہوں کہ میں آپ لوگوں سے بھی غریب ہوں۔“ ابراہیم اور عائشہ بی بی کی نظریں اختر علی کے چہرے پر گڑھ گئیں۔

”مجھے کوئی ایسا بچہ جس کے کپڑے میلے کچیلے ہوں۔ ناک بہہ رہی ہو...... پاؤں سے ننگا ہو...... مجھے۔ مجھے آ کر کہے۔ چاچا جی یا پھر ماما جی مجھے آپ کے گھر چھٹیاں گزارنے جانا ہے کوئی نہیں کہتا۔“ اختر علی کی آواز بھرا گئی۔ وہ ایک بار پھر وہی اختر علی بن گیا جو اس گھر کی چوکھٹ کو چھوڑ کر گیا تھا۔ ”کوئی بہن اپنے شرارتی بچوں کے ساتھ میرے گھر میں رہنے نہیں آتی۔ میرے بیٹے میرے بازو اور میرا غرور ہیں مگر ہم لوگ کبھی بھی دوستانہ ماحول میں نہیں بیٹھ سکتے۔“ اختر علی کے خاموش آنسو آنکھوں کے حلقے توڑ کر اس کی گالوں پر بہنے لگے تو عائشہ بی بی تڑپ گئیں۔ اُنہوں نے اختر علی کو پالا پوسا تھا۔ وہ اس کے آنسوؤں کو اپنے آنچل سے صاف کرنے لگیں تو اختر علی پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ احمد کی بھی آنکھیں بھر آئیں اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ دونوں بہن بھائیوں کا آپس میں اتنا پیار ہے؟

”میں رشتوں کی محبت کا فقیر ہوں آپا!“ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پاتا ہوا بولا۔ ”میں اپنی جھولی کا کشکول رشتوں کے خلوص سے بھرنے آیا ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ کیسے کہوں......؟ مگر اتنا جانتا ہوں کہ یہ در میرے لیئے ہمیشہ اپنی محبت کے پٹ وا کیئے رکھتا ہے۔ میں کبھی بھی خالی نہیں گیا اور آج بھی رشتوں کی مہک میرے دِل کو مہکا رہی ہے۔“ وہ ایک بار پھر مغموم ہو گیا تھا۔ احمد باپ کی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا باپ وہ کامیاب بزنس مین ہے جس

سے بات کرنے کیلئے فارن کنٹری کی پارٹیاں کئی کئی منٹ فون ہولڈ رکھ کر اپنی باری کا انتظار کرتی ہیں۔ لیکن احمد کو اختر علی نے یہ سب بھی بتایا ہوا تھا کہ وہ اسی چوکھٹ سے کامیابی کا سہرا باندھ کر نکلا تھا۔

”میں یقینی طور پر دُنیا کا مفلس اور قلاش آدمی ہوں جس کے پاس صرف دولت ہے۔ رشتوں کے خزانے نہیں ہیں۔ میری جھولی ایک بار پھر ان خزانوں سے بھر دو آپا!“ وہ عائشہ بی بی کے قدموں میں بیٹھ گیا تو ابراہیم اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اختر علی کو اُٹھا کر سینے سے لگایا۔ اور اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

”اس نیلی چھت والے کے سامنے ہمیں کیوں شرمندہ کر رہے ہو اختر علی! بے شک میں بچی کا باپ ہوں بیٹی والا ہوں مگر اتنا کم ظرف نہیں کہ تمہاری جھولی خلوص اور رشتوں کی مہک سے نہ بھر سکوں۔“ ابراہیم ڈبڈبائی آنکھوں سے احمد کی طرف دیکھنے لگے۔ ”مجھے دِلی طور پر دُکھ ہوا ہے کہ احمد کی شادی ناکام ہو گئی ہے۔ کیونکہ تمہارے گھر میں تمہارے بعد یہ واحد شخص ہے جس نے ہمیں ہماری مفلسی سمیت قبول کیا تھا اور عزت دی تھی۔“ احمد اُس کی طرف دیکھتا ہوا شرمندگی محسوس کرنے لگا۔

”آپ کیسی باتیں کرتے ہیں پھوپھا جی؟ آپ لوگ تو ہمارے بزرگ ہیں۔ ہمارا سرمایہ ہیں۔ آپ کے ہونٹوں کے بوسے لینے کو ہماری پیشانیاں ترستی رہتی ہیں۔“ احمد نے ان دونوں کا ہی نہیں آمنہ کا بھی مان رکھ لیا تھا۔ اور اختر علی بیٹے کے الفاظ سن کر فخر سے احمد کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں انتہائی شرمندگی سے عرض کروں گا کہ آمنہ بیٹی کو میری بیٹی بنا دو۔“ اختر علی بیٹے کا باپ تھا مگر وہ جس جگہ کھڑا تھا وہ جگہ اس کیلئے کسی دربار سے کم نہ تھی کیونکہ وہ ابراہیم اور عائشہ کو اپنا ماں باپ سمجھتا تھا اور ماں باپ سے کوئی بھی چیز مانگی جائے وہ التجا اور گزارش سے ہی مانگی جاتی ہے۔

”اختر علی! مجھے مزید شرمندہ مت کرو۔“ ابراہیم نے اس کو گلے سے لگا رکھا تھا۔ ”تم نے جھولی اُٹھا کر مجھ سے میری بیٹی مانگی ہے۔“ اس نے اختر علی کو خود سے جُدا کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس قابل نہیں ہوں کہ بیٹی کا رشتہ شرائط پر طے کروں۔ مگر ہر باپ کی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ میری بیٹی خوش رہے۔ سُکھی رہے سدا سہاگن رہے۔“ ابراہیم کے آنسو اس کے چہرے کی جھریوں میں اٹھکیلیاں کرنے لگے اس نے لرزتے اور کانپتے ہونٹوں سے بیٹی کی خوشیاں مانگنا شروع کر دیں۔

"اختر علی! میرا یہ کچا مکان تمہارے بیٹے کے شایانِ شان تو نہیں ہے۔...... مگر میں تمہیں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے بیٹے کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔"

"پھوپھا جی!" احمد نے آگے بڑھ کر ابراہیم کو گلے لگا لیا۔ "آپ کیسی غیروں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اس گھر کی ایک ایک اینٹ سے مجھے محبت کی مہک آ رہی ہے۔ اس کچی دیوار کی اینٹوں سے نکلنے والی مٹی اپنی دولت سے بھی زیادہ عزیز ہے کیونکہ ہمارے پاس دھن دولت اور بنگلے تو ہیں مگر ہمارے دلوں میں اور ہماری سانسوں کو مہکانے والی یہ مٹی کہیں بھی نہیں ہے۔" ابراہیم احمد کی دانائی سے بڑا متاثر ہوا تھا۔

"جیتے رہو!" وہ اختر علی کی طرف بڑھا۔ "اختر علی! میری بیٹی کی جھولی میں خوشیاں ہی خوشیاں ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ یہ خوشیاں تمہارے اور احمد کی محبت سے دوگنا ہو جائیں اس کی جھولی بھر جائے اور وہ لوگوں میں اپنی محبتیں بانٹتے بانٹتے عمر تمام کرے۔"

"آپ کیوں فکر کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے مجھے احمد کے سبب ایک بار پھر اپنی آپا کے سامنے سرخرو ہونے کا موقع دیا ہے۔ آپ کے دل میں جو بھی بات ہے مجھے اپنا چھوٹا سمجھ کر کہہ دیجئے۔ مجھے اپنے بچوں کی قسم میں برا نہیں مناؤں گا۔" اختر علی انجانے خوف سے لرز گیا تھا۔

"رشتے کچے دھاگوں کی ڈور سے بندھے ہوتے ہیں اختر علی!" اس بار عائشہ بی بی بولیں۔ "میری بیٹی کے دل پر جو زخم امتل نے اُسے ٹھکرا کر لگایا تھا وہ تمہاری منت اور احمد کی محبت نے قدرے مندمل کر دیا ہے اور اس نے احمد کی محبت کے سہارے پر جینا سیکھ لیا ہے......" اگلی بات گو کہ مشکل تھی مگر سوال آمنہ کی خوشیوں اور زندگی بھر کا تھا۔ "ہم نہیں چاہتے کہ تمہارے گھر کا کوئی فرد زہر اور طنز کے بھرے نشتروں سے اس زخم کو پھر کرید دے اور میری بیٹی جیتے جی زندہ لاش بن جائے۔" عائشہ بی بی نے آنسوؤں کی زبانی تمام بات اچھے اور اخلاق الفاظ کا جامہ پہنا کر ادا کر دی تھی۔

"میں آپ کی مجبوری اور دلی جذبات کو سمجھتا ہوں...... اور یہ بھی جانتا ہوں کہ امتل اس شادی کو کبھی بھی قبول نہ کرے گی۔" اختر علی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا کیونکہ ابراہیم اس سے پہلے چارپائی پر بیٹھ چکا تھا۔ ان ساری باتوں کے درمیان جگنو ہمیشہ کی طرح خاموش رہا مگر وہ باتوں کو بڑی توجہ اور دھیان سے سنتا رہا۔ جبکہ آمنہ اندر کمرے میں بے دلی اور بے قراری سے پہلو بدل بدل کر ٹہل رہی تھی۔

"احمد میرا بڑا بیٹا ہے۔ خود مختار ہے اس کی اپنی فیکٹری ہے اور اپنی مرضی کے فیصلے کرنے میں آزاد ہے۔ مجھے اس کی ذات پر اعتماد ہے کہ یہ کوئی بھی کام ایسا نہیں کرے گا جو مجھے آمنہ کے حوالے سے براہِ راست تکلیف اور دُکھ پہنچانے کا باعث بنے۔" اختر علی نے احمد کی طرف غرور سے دیکھا اور فخر سے سر بلند کر لیا کیونکہ احمد کی آنکھیں بھی باپ کی بات سُن کر مسکرانے لگی تھیں۔ وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"اس شادی سے آمنہ کو کوئی بھی دُکھ اور تکلیف کا احساس کبھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ شادی امتل اور دوسرے تمام رشتہ داروں سے خفیہ رکھی جائے گی۔" اختر علی کی بات سن کر ابراہیم اور عائشہ اس کا منہ دیکھنے لگے۔

"ہاں! ابراہیم بھائی! میں نے اور احمد نے پروگرام بنا لیا ہے احمد ایک علیحدہ گھر خریدے گا جو آمنہ کے نام ہوگا اس گھر میں آمنہ اور احمد کے علاوہ کوئی تیسرا رشتہ نہیں ہوگا۔ امتل کو اس بات سے سدا لاعلم رکھا جائے گا۔"

"مگر علم ہونے کی صورت میں......؟" ابراہیم کے اندر کا ڈر باہر نکل آیا۔

"میں عرض کر چکا ہوں کہ احمد اپنے ہر فیصلے میں خود مختار ہے۔ علم ہونے کی صورت میں امتل رو پیٹ کر خاموش ہو جائے گی وہ آمنہ کے گھر سے بے دخل کرنے یا پھر اپنے ہتھکنڈوں سے تنگ نہیں کر سکے گی کیونکہ وہ گھر آمنہ کا ہوگا۔"

"اگر امتل نے احمد کو مجبور کیا کہ وہ دوسری شادی کر لے اور آمنہ کو چھوڑ دے تو......؟" اب بات شرائط پر آ گئی تھی۔ اس لیئے عائشہ بی بی نے بھی اپنا خوف ظاہر کیا۔

"پھوپھو جان! میں آمنہ سے محبت کرتا ہوں۔" احمد کافی دیر سے خاموش تھا اب سوال اس کی ذات کا تھا اس لیئے اُس نے ہی جواب دینا مناسب سمجھا! "میں اگر مُما کی باتوں میں آتا تو اپنی ضمانت ابو کو بنا کر نہ لاتا۔ آپ نے ابو کو بچوں کی طرح پالا پوسا ہے۔ اسی لیئے میں نے خود کوئی بھی بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جس دن آمنہ کو مجھ سے جدا کرنے کی کوشش کی گئی تو جانئے احمد زندہ نہیں رہے گا۔" آمنہ اس کی بات سن کر لرز گئی اور بے اختیار ہو کر کمرے کے دروازے سے باہر آ گئی۔ احمد اور آمنہ کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور دھڑکنوں نے گیت گانے شروع کر دیئے۔ مگر آمنہ کی آنکھوں اور چہرے سے لگتا تھا کہ اُسے احمد کی بات ناگوار گزری ہے۔ اس نے مرنے کی بات کیوں کی؟

"ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ اللہ تم دونوں کو جوڑی سلامت رکھے۔ مجھے یہ رشتہ دِل سے قبول ہے۔" ابراہیم کی بات سن کر احمد سرتاپا خوشی میں نہا گیا۔ آمنہ کے دِل کی خواہش بھی پوری ہوگئی تھی۔ اُسے الگ گھر اور احمد کا ساتھ مل گیا تھا۔

محبت نے بازی جیت لی تھی۔ پروگرام طے ہوگیا تھا ایک ماہ بعد آمنہ کی رخصتی ہونا تھی۔ اس دوران احمد نے ایک گھر خریدنا تھا جس میں ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز کا موجود ہونا کہ آمنہ کو کوئی تکلیف یا دقت نہ ہو۔

☆☆☆

کندن کسی طرح کوشش کر کے گھر سے بھاگ نکلا تھا اس کی نگرانی پر مامور سیکیورٹی گارڈز کی شامت آئی ہوئی تھی۔ پرساد چوپڑہ اپنا سر پیٹ کر رہ گیا تھا گھر بھر میں پریشانی کی کیفیت تھی۔ اگر برادری میں پتہ چل جائے کہ کندن مسلمانوں کی حمایت میں ان کے قرآن کی حفاظت کر رہا تھا تو پرساد چوپڑہ کی تو ناک ہی کٹ جائے گی۔

گھر کے بھی افراد پریشانی کی حالت میں ایک بڑے ہال میں جمع تھے جہاں قیمتی صوفے رکھے گئے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر میرون رنگ کے پردے لٹک رہے تھے۔ قیمتی قالین پاؤں تلے کچلا جا رہا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں گنپتی بھگوان کی مورتی سجائی گئی تھی اس مورتی کو چھوٹا سا مندر بنا کر پوجا کیلئے رکھا گیا تھا۔ چوپڑہ بے چینی اور بے قراری کی کیفیت میں ادھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا وہ غصے اور اضطراب کی حالت میں ہاتھوں کی مٹھیوں کو کبھی کھولتا اور کبھی بھینچ لیتا۔ مہارانی اُٹھ کر اس کے پاس گئی اور چند لمحوں بعد آہستگی سے ڈرتی ہوئی بولی۔

"آپ پریشان مت ہوں وہ گھر آ جائے گا۔" چوپڑہ چونک کر اس کی طرف دیکھا جیسے کہ اس کی موجودگی کا اُسے اس احساس اب ہوا ہو۔

"وہ گھر نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔" چوپڑہ پھاڑ کھانے والے لہجہ میں بولا تھا دوسرے تمام افراد سہم کر رہ گئے۔ "جانتی ہو۔۔۔۔۔ وہ کہاں گیا ہے؟" اس کا یہ سوال مہارانی کیلئے پریشان کن تھا وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی تو چوپڑہ غصے میں تلملاتا ہوا موہن سے مخاطب ہوا۔

"بتاؤ۔۔۔۔۔ بتاؤ اس اندھی۔ بہری اور بیٹے کی پیاری ماں کو۔۔۔۔۔ بتاؤ موہن کہ اس کا بیٹا کتنا بڑا معرکہ سر کرنے گیا ہے۔۔۔۔۔ مجھ سے مت پوچھو۔" وہ جھنجلاتا ہوا بولا۔ موہن اُٹھ کر مہارانی کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ "ممتا۔۔۔۔۔ کندن کو اکثر مسلمانوں کے کسی پروفیسر کے پاس دیکھا گیا

ہے۔" مہارانی سکتے کی کیفیت میں مبتلا ہو کر موہن کا منہ دیکھنے لگی۔ کاجل، کنگنا اور پوجا بھابی نے شرمندگی سے سر جھکا لیئے تھے۔ مگر چوپڑہ کے دل میں لگی آگ ٹھنڈی نہ ہو پا رہی تھی۔ موبائل فون کی گھنٹی نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ چوپڑہ نے سکرین پر نمبر دیکھتے ہوئے کال اٹینڈ کی۔

"کیا خبر ہے رام؟" دوسری طرف سے رام نے جو خبر سنائی وہ چوپڑہ اور تمام خاندان کے لیئے خوش خبری تھی۔ "ہم کندن جی کو گھر لے کر آ رہے ہیں چوپڑہ صاحب!" اس خبر نے چوپڑہ کے جسم میں پارہ بھر دیا تھا۔ وہ پرجوش آواز میں بولا۔ "فوراً گھر پہنچو۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ کتنا ایمان والا ہے؟" موبائل بند کرنے کے بعد وہ موہن چند سے مخاطب ہوا۔ "موہن! اس کے پاؤں میں سنگل ڈال کر اُسے گن پتی بھگوان کی مورتی کے سامنے باندھ دو۔" اس کا حکم سن کر بھی افراد لرز گئے۔ مہارانی نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا ہی تھا کہ پرساد چوپڑہ تلخی سے بول پڑا۔ "گھر بھر سے کوئی بھی اس کی وکالت نہیں کرے گا۔۔۔۔۔ نہیں کرے گا مطلب۔۔۔۔۔ نہیں کرے گا۔" اس نے بائیں ہاتھ کی انگلی کھڑی کر کے گھر کے تمام افراد کو تنبیہہ کر دی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

کندن گرتا پڑتا پروفیسر فائز کے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ فائز احمد اس کی حالت دیکھ کر حیران اور پریشان ہوگئے تھے۔ اُنہوں نے کندن کو آرام سے بٹھایا اور پرسکون ہونے کی تاکید کی۔ کندن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے تھے وہ بہت بڑا کام سرانجام دینے والا تھا پروفیسر فائز احمد اس کی اندرونی کیفیت سے باخبر تھے وہ سخت جذباتی ہو رہا تھا۔

"کندن!" سر فائز نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ "ملک میں ہندو مسلم فسادات نے جو حالات پیدا کر دیئے ہیں ان حالات میں تم جو بھی فیصلہ کرو گے وہ تمہارے لیئے تو بہتر ہوگا۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ شائد اس فیصلے سے تمہارے امیر اور کامیاب بزنس مین باپ کو نقصان ہو؟" کندن ان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"میرے اسلام قبول کرنے سے میرے پتاجی کو کیا نقصان ہو سکتا ہے سر!؟" وہ کندن کی بات سن کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "تم نے جو کام اسلام کی سربلندی کیلئے کیا ہے اس پر یقیناً اہل ایمان تمہارے قرض دار ہیں۔ مگر تم نہیں جانتے کہ ہندو برادری اور خاندانوں میں فکر و تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے۔ کیونکہ تمہارا باپ اس ملک کا بہت نامور شخص ہے۔ ذرا خود سوچو۔۔۔۔۔ ایسے شخص کا بیٹا اگر اپنا دین دھرم چھوڑ کر مسلمان ہو جائے تو اس کامیاب شخص کی کاروباری ساکھ اور عزت کے نام پر بھی بٹا لگے گا۔"

''آپ مجھے ان راہوں سے واپس لوٹ جانے پر آمادہ کر رہے ہیں سر!؟'' اس کے لہجے میں دُکھ اور کرب کی آمیزش کے ساتھ ساتھ مایوسی بھی عود آئی تھی۔ ''میں خلیل احمد کی وساطت سے آپ کے پاس آیا تھا ورنہ میں کسی بھی مسجد میں جا کر امام صاحب کے ہاتھوں پر شرف قبولیت اسلام حاصل کر سکتا ہوں۔'' وہ اُٹھتا ہوا بولا۔ ''آئی ایم سوری سر! مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ میرے باپ کی اپروچ اور دولت سے خوفزدہ ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر باہر نکل آیا۔ پروفیسر فائز احمد اس کے آخری فقرے پر دل ہی دل میں مسکرانے لگے اور خودکلامی کے انداز میں بڑبڑائے۔

''اسلام میں داخل ہونے کیلئے یہ تمہاری آخری اور مشکل ترین آزمائش ہے کندن...... اس پر پورا اتر جاؤ...... میں تمہیں خود ہی اپنے پاس لے آؤں گا۔''

کندن انتہائی مایوس تھا اُسے سر فائز سے اس جواب اور حوصلہ شکنی کی قطعی امید نہ تھی وہ بڑی آس اور امید کے ساتھ گھر سے نکلا تھا اُسے پکا یقین تھا کہ جب وہ مسلمان بن جائے گا تو مسلم برادری فخر کرے گی اُسے اپنے مذہب میں خوش آمدید کہے گی۔ مگر اس کا دل پروفیسر فائز احمد نے توڑ دیا تھا وہ شکستہ دل کے ساتھ خلیل احمد کو یاد کرنے لگا۔ جس نے اُسے ان راہوں کا مسافر بنایا تھا اور خود نجانے کہاں کھو گیا تھا۔؟ وہ انہی خیالوں میں پنہاں مسلمانوں کی جلی ہوئی بستی سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک قیمتی گاڑی اس کے پاس آ کر رُکی اس میں سے سوٹڈ بوٹڈ آدمی کے ساتھ اترنے والے دو غنڈہ نما آدمیوں کو دیکھ کر اُس کی طویل سانس نکل گئی۔

وہ اپنے پتا کے خاص ملازم رام کو پہچان گیا تھا وہ یقیناً اسی کی تلاش میں نکلا ہوگا اور نا معلوم کتنے لوگوں کو پرساد چوپڑہ نے اُسے ڈھونڈنے کا کام سونپا ہوگا۔ وہ رام کی مجبوری سمجھتا ہوا اس کے ساتھ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے ہونگے کہ رام نے پرساد چوپڑہ کو موبائل پر کندن کے مل جانے کی خوش خبری سنائی تھی۔

پورے خاندان پر موت کا سکوت طاری تھا پرساد چوپڑہ غصے اور نفرت کی ملی جلی کیفیت سے کندن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کسی کی بھی جرأت نہ تھی کہ کندن کی وکالت کرتا یا پھر چوپڑہ کو سمجھا سکتا۔ چوپڑہ نے نفرین آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے زبان کھولی۔

''اربوں کھربوں روپے کی جائیداد' اربوں روپے کا بزنس' ہندوستان میں اعلیٰ مقام اور اعلیٰ نام۔'' کندن باپ کی باتیں غور سے سننے لگا۔ ''جانتے ہو یہ پہچان یہ نام عزت' دولت اور شہرت کیوں ہے؟...... یہ سب اس لیئے ہے کہ تم ہندوستان کے مشہور بزنس مین پرساد چوپڑہ کے بیٹے

ہو۔ جو کہ خاندانی ہندو ہے۔ اور اُسے اپنے ہندو ہونے پر گرّو ہے...... آج اگر تم سے اس نام اور خاندان کی پہچان چھن جائے تو جانتے ہو کیا ہوگا......؟ ہندوستان کی گلیوں میں تمہیں کتوں کی طرح گھسیٹا جائے گا۔ دو ٹکے کے مسلمان کی طرح ذلیل کیا جائے گا جگہ جگہ بنی ہوئی مسجدوں میں جا کر اللہ کے نام پر بھیجا جانیوالا خیراتی لنگر کھانا پڑے گا'' پرسا چوپڑہ کندن کو سمجھانے کے بہانے مسلمانوں کے خلاف اپنا زہر اگلنے لگا تھا۔ کندن خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ ابھی جواب نہ دینا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کا باپ اپنے اندر کا غبار اور دل کا زہر الفاظ کی صورت میں باہر نکال لے۔

''کچھ نہیں ملے گا تمہیں کندن۔ مسلمان ہو کر میری ناک بھی کٹواؤ گے اور خود دردر کی ٹھوکریں کھا کھا کر ذلیل و رسوا بھی ہو گے۔ کل تک تمہارے پاس وقت ہے۔'' پرساد چوپڑہ بھگ... کی مورتی کے سامنے کھڑا ہو کر اشارہ کرتا ہوا بولا۔ ''بھگوان! اپنی کرپا کرو اس کندن کے سر سے ظلمت اور جہالت کا بھوت اتار دو......'' کندن کے جاندار قہقہے نے محل کی دیواروں کو لرزا دیا۔ پاس کھڑے تمام افراد اور ملازموں کے دل دہل گئے۔ چوپڑہ اس کی طرف حیران کن نظروں سے دیکھنے لگا۔ اُسے شک گزرا کہ کندن کی ذہنی رو بہک گئی ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے کندن کی زبان سے ردا ہونے والے الفاظ نے چوپڑہ کا دماغ ہلا کر رکھ دیا۔

''اگر اس بھگوان سے میرا علاج نہ ہو سکا تو کل بازار سے نیا لے آنا۔ کیونکہ ایسے خدا جگہ جگہ بکتے ہوئے ملتے ہیں...... اللہ کبھی نہیں بکتا...... وہ بس خریدتا...... محبت اور اس کی پرستش کرنے والوں کو۔'' ایک زوردار تھپڑ کندن کے گال کو سرخ کر گیا وہ لڑکھڑا کر گن پتی بھگوان کے آگے گر گیا۔ گھر کے تمام افراد سہم گئے چوپڑہ نے آگے بڑھ کر کندن کو بالوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور مورتی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

''یہی تمہارا اصل ہے...... چپ چاپ لوٹ آؤ...... ورنہ تم پرساد چوپڑہ کی طاقت کو نہیں جانتے۔'' کندن نے جھٹکا دے کر اپنا بال چھڑائے تو درد کی تیز لہر اس کے دماغ میں دوڑ گئی۔

''اپنی طاقت' دولت اور نام کا سہارا لیکر جو بھی کرنا ہے کر لیجئے مگر...... کندن کو متاثر نہیں کر سکتے اور نہ ہی کسی ظلم اور رعب سے مرعوب کر سکتے ہو۔'' رام اور موہن آگے بڑھے مگر چوپڑہ نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں روک دیا۔ مہارانی پوجا کا جل اور گنگنا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

''تمہارے منہ میں جو زبان ہے اس گھر اور خاندان کی بدولت ہے۔ ورنہ تمہاری اپنی شناخت کیا ہے؟''

''میں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا۔'' سب کی حیرانگی قابل دید تھی۔ کندن کی بات سن کر مہارانی کے لبوں پر مسکان پھیل گئی۔ کاجل بھی مسکائی تھی مگر اگلا لمحہ اور اگلا فقرہ ان کے ارمانوں پر اوس پھیر گیا۔ ''میں نہتا' کمزور اور غریب مسلمان بنوں گا مگر اتنا جانتا ہوں کہ ہندوستان میں سب سے مشکل اور قریبی حریف آپ ہونگے اور آپ کیلئے میں ہوں گا۔'' چوپڑہ کا سٹیٹس لرزنے لگا تھا۔ ''دولت اور حیثیت سے بھگوان تو خریدے جاسکتے ہیں مگر ایک مسلمان کا ایمان نہیں خریدا جا سکتا۔ آپ کی تمام دولت' طاقت اور حیثیت کا غرور اگر مجھے میرے ارادوں سے باز رکھ گیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ خدا کو چھوڑ دوں گا اور بقول آپ کے کہ یہ پتھر کی مورتی جیسے مجھ جیسے ہی ہاتھوں نے بنایا ہے میرا دل ایمان اور اللہ کی طرف سے موڑ دے تو میں بھی آپ کی طرح اس مٹی اور گارے کی مورتی کی پوجا کرتا رہوں گا۔''

''رام!'' پرساد چوپڑہ کی غصے اور نفرت سے گردن کی رگیں تن گئی تھیں۔ رام پاس پہنچا تو وہ کندن کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ ''اسے زنجیروں سے اس طرح باندھو کہ اس کا سر بھگوان کے آگے جھکا ہوا ہو۔ اور جسم کا کوئی بھی حصہ حرکت کرنے سے معذور ہو۔'' پھر وہ گھر والوں سے مخاطب ہوا۔ ''اگر کسی نے بھی اس کے ساتھ ہمدردی یا رعائیت برتنے کی کوشش کی وہ میرا دشمن ہوگا اور پرساد چوپڑہ اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتا۔'' اس کی بات سن کر تمام خاندان سوگواری کی حالت میں گنگ کھڑا کندن کے ساتھ ہونے والا سلوک دیکھ رہا تھا۔ گنگنا آگے بڑھی اور پرساد چوپڑہ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوئی بولی۔

''پتا جی! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں...... یہ تشدد یہ ظلم ختم کریں...... جو بھی معاملہ ہے اچھے طریقے سے اُسے ہینڈل کریں۔'' مہارانی کی آنکھوں نے آنسو برسانا شروع کر دیئے۔ ''میں کندن کو سمجھاتی ہو۔ میں بات کرتی ہوں۔ آپ لوگ پلیز یہ سب ختم کریں۔'' وہ روئے جا رہی تھی اور پرساد چوپڑہ اس کی طرف تاسف سے دیکھتا ہوا بولا۔

''گنگنا! میں بھی چاہتا ہوں کہ کوئی اس اُلو کے پٹھے کو سمجھائے۔ میری بیٹوں کی جوڑی قائم رہے...... مگر یہ......'' اس کے نشتروں کا رُخ ایک بار پھر کندن کی طرف ہو گیا تھا۔ ''یہ بیوقوف ایک ان دیکھے بھگوان کی پوجا کرنا چاہتا ہے۔ اپنے خاندان' دھرم اور پرکھوں کی پرم پرا کا مذاق اڑانا چاہتا ہے۔'' پرساد چوپڑہ کا لہجہ دبنگ تھا آواز میں گھن گرج اس کے رعب کو ظاہری کر رہی تھی۔ ''یہ...... چاہتا ہے کہ بھائی کا ساتھ چھوڑ دے۔ باپ کا بازو کاٹ کر مسلمانوں کی طاقت میں

اضافہ کر دے...... مگر یہ نہیں جانتا کہ پرساد چوپڑہ کس شخص کا نام ہے۔ اس نے صرف اس پرساد چوپڑہ کو دیکھا ہے جو اس کا باپ ہے...... اسے سمجھاؤ گنگنا سیدھی طرح راہِ راست پر آ جائے ورنہ...... میں اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ تیزاب میں ڈال کر جلا دوں گا۔'' اس کی آنکھوں سے انگارے اور زبان سے شعلے نکل رہے تھے۔

پرساد چوپڑہ اور گھر کے دوسرے افراد وہاں سے جا چکے تھے۔ کندن وہاں اکیلا رہ گیا تھا وہ بھگوان کی مورتی کے پاس بیٹھا اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ بے جان مورتی اس کے دیکھنے کا کوئی اچھا یا بُرا رسپانس نہ دے سکتی تھی۔ اُسے اسلامی کتب میں پڑھا ہوا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ یاد آنے لگا وہ مورتی کی طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بڑبڑایا۔

''واہ!...... کس موج سے بیٹھے ہو۔ ہزاروں لاکھوں روپے سے تم کو سجایا اور سنوارا گیا ہے مگر یہ نہیں جانتے کہ تم ان کی تقدیر سنوارنے یا بگاڑنے کی شکتی نہیں رکھتے ہو...... اگر کچھ کر سکتے ہو تو کر کے دِکھاؤ...... مجھے دین اسلام کی راہ سے واپس موڑ کر دِکھاؤ...... میرا نام ہی کندن نہیں ہے میرا حوصلہ عزم ارادہ اور اعتماد بھی کندن ہے۔ اس اعتماد کو توڑ کر دِکھاؤ......'' وہ قہقہے لگانے لگا...... اس کے آس پاس کوئی نہ تھا مگر اس کے قہقہے پرساد چوپڑہ کے کانوں میں زہر گھول رہے تھے۔ کاجل اور پوجا بھابی اپنی اپنی جگہ پر پیچ و تاب کھا رہی تھیں جبکہ گنگنا اور مہارانی الگ بیٹھیں آنسو بہا رہی تھیں۔

''ممّا! میں کندن سے بات کرتی ہوں۔'' گنگنا کی بات سن کر مہارانی بھی اس کے ساتھ چلتی ہوئی کندن کے پاس پہنچیں وہ ہونٹوں پر مسکان سجائے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

''مجھ سے سودا کرنی آئی ہو!؟'' وہ بہن سے مخاطب ہوا تو اس کے آنسو بہنے لگی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''کندن! یہ سب کیوں کر رہے ہو...... کس لیئے اور کس کے کہنے پر......؟''

''گنگنا! میری تم لوگوں کے ساتھ کوئی لڑائی نہیں ہے۔'' وہ تاسف سے بولا تھا۔ ''اسلام میں ہی نہیں بلکہ ہر مذہب میں یہ بات واضح ہے کہ انسان چند دن جس کسی کے ساتھ رہ لے یا گزار لے وہ اس کے ساتھ مانوس ہو جاتا ہے۔ اُسے اس چیز سے اس انسان سے اس ہستی سے انس ہو جاتا ہے۔'' وہ آنکھوں میں آنسو بھرتا ہوا بولا۔ ''مگر ممّا...... نجانے کیوں...... کیوں مجھے احساس ہوتا رہا کہ میں اس مورتی کے ساتھ اپنی زندگی کی پچیس بہاریں گزارنے کے ساتھ بھی مانوس نہیں

ہوسکا۔ بس میرا اس مورتی کے ساتھ مانوس اجنبی جیسا تعلق ہے...... مگر زندگی کے صرف پچیس دن میں نے قرآن کریم کے ساتھ ایک کمرے میں گزارے تھے تو مجھے احساس ہونے لگا کہ اب میں اس چیز کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا...... کیونکہ قرآن محض ایک چیز ہی نہیں بلکہ کل کائنات ہے اور میں کائنات کے بغیر زندگی گزارنے کو گناہ تصور کرتا ہوں۔''

وہ خاموش ہوا تو مہارانی کی ہچکی بندھ گئی۔ کنگنا اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے دلاسہ دینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ خود بھی افسردہ تھی مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ بھائی کو کچھ بھی سمجھانے کی جرات یا ہمت نہ کر رہی تھی کیونکہ اس نے اور تمام خاندان نے دیکھ لیا تھا کہ کندن کے ارادے اٹل اور اعتماد پختہ ہے۔

''تو پھر یہ گھر چھوڑ جاؤ کندن!'' مہارانی کی سسکیوں میں بھری ہوئی آواز نے ان دونوں کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔

''میرے بیٹے! میں نے زندگی کی چالیس قیمتی سال تمہارے پتا کے ساتھ گزارے ہیں۔ میں ان کی نس نس سے واقف ہوں وہ اس گھر میں تم پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیں گے مگر اپنی اناء اور حیثیت کو تمہاری ضد پر قربان نہیں کریں گے۔'' مہارانی کو چوپڑہ کا بھی خوف تھا وہ بار بار گھر کے تمام حصوں پر نگاہ بھی ڈال رہی تھی۔ اس کی آواز گو کہ سرگوشی میں ابھر رہی تھی مگر آنسوؤں کی آمیزش آواز میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

''میں ماں ہوں کندن! میں تم پر تشدد سہن نہیں کر سکوں گی۔ تم سے پہلے مر جاؤں گی۔ جاؤ بیٹا اپنی مرضی اور پسند سے اپنی زندگی جی لو...... بس مجھے اتنا تو سکون ہوگا کہ تم دُنیا میں کہیں بھی ہو...... زندہ ہو......'' مہارانی کی آواز اس کے ساتھ چھوڑ گئی تھی وہ کندن کو ممتا کی پیاسی نظروں سے دیکھتی ہوئی واپس مڑ گئی...... کنگنا بھی جلتی ہوئی آنکھوں سے بھائی کو دیکھتی رہی اور پھر واپس ماں کے پیچھے چل پڑی۔

کندن اس صحن کو اچھی طرح دیکھنے لگا جو کہ بہت بڑے رقبہ پر محیط تھا۔ خوبصورت ریشمی گھاس نے لان کو مزید نکھار دیا تھا۔ محل نما عمارت میں کندن کے لیئے بہت جگہ تھی...... اگر وہ اپنی ہٹ دھرمی چھوڑ دے تو...... مگر اس کے مضبوط ارادوں کو دیکھتے ہوئے اس کی ماں نے اُسے ان تمام چیزوں اور تمام رشتوں سے بے نیاز ہو کر اپنی جنم بھومی چھوڑنے کا مژدہ سنا دیا تھا اور اب کندن کو فیصلہ کرنا تھا کہ اسے اسلام کو چننا ہے یا ان قیمتی چیزوں کو......؟

☆☆☆

ہر کام اچھے طریقے سے پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا تھا اختر علی نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا کہ وہ احمد اور آمنہ کی شادی کرا کے اپنی بہن کے سامنے سرخرو ہو گیا تھا۔ آمنہ کی رخصتی پر جگنو بہت رویا تھا۔ وہ آمنہ باجی کو اپنی دوست سمجھتا تھا اور دِن بھر کی باتیں اس سے کر لیتا تھا اب وہ اس گھر میں اکیلا ہو گیا تھا۔

آمنہ نئے گھر میں حُجلہ عروسی میں بیٹھی ہوئی تھی احمد بھی اس کے پاس ہی تھا کیونکہ اس گھر میں ان دونوں کے علاوہ ملازمہ حاجن بی بی اور ایک ملازم محمود تھا۔ کسی نے بھی ان کے شگن پورے نہ کیئے تھے مگر آمنہ اور احمد ذہنی طور پر اس سلوک کے لیئے تیار تھے کیونکہ اس شادی کا اصل اور دوسرے لوگوں کو بالکل بھی علم نہ تھا۔

''بندہ جناب کی خدمت میں سلام بجا لاتا ہے۔'' احمد کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ تھی۔ آمنہ شرما کر لجا کر رہ گئی۔ وہ شرم سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ ''میری پہلے بھی شادی ہو چکی ہے مجھے ہاتھ مت لگانا۔'' احمد کے منہ سے یہ الفاظ سن کر آمنہ کی رنگت زرد ہو گئی وہ ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگی مگر احمد کے چہرے پر سکون تھا۔ وہ شرارت سے مسکراتا ہوا بولا۔ ''پریشان ہو گئی میڈم!؟ یہ الفاظ مجھے اس دُلہن نے کہے تھے جو میرے مقدر میں نہ تھی۔'' آمنہ کی جان میں جان آئی۔ اس نے احمد کی طرف غصے سے دیکھا تو وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس نے اپنا سر آمنہ کی گود میں رکھ لیا تو وہ شرم وحیا سے سمٹ گئی۔

''اگر جذبے سچے ہوں تو محبت اس طرح بھی جھولی بھر دیتی ہے۔'' وہ کہنے لگا۔ ''میں نے تم سے تمہارے اچھے ذہن سے پہلے ہی دن سے محبت کی ہے...... دیکھو آمنہ...... میری محبت سچی تھی تم مجھے مل گئی۔ بچپن سے لیکر آج تک ہم نے جو بھی خواب اپنی آنکھوں میں سجائے تھے ان کی تعبیر ہمیں کس طرح ملی ہے...... یہ ہمارے تصور میں بھی نہ تھا کیا تمہارے گمان میں تھا کہ تمہیں تمہارا ہی احمد مل جائے گا!''؟ اس نے آمنہ کے سُرخ ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا تو شرم وحیا کے بوجھ سے جھکی ہوئی پلکیں اُٹھیں اور نظریں احمد کے دِل کے تاروں کو چھیڑ گئیں۔

''مجھے گمان بھی تھا اور یقین بھی...... کیونکہ میں نے بچپن سے لیکر آج تک بس ایک ہی نام کے سپنے دیکھے تھے۔'' آمنہ کی دھیمے لہجہ میں بات سن کر وہ اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''میرا دل گواہی دیتا تھا کہ جو کچھ بھی میرے ساتھ ہوا ہے یہ مجھے تو اچھا نہیں لگا مگر تقدیر

کو بھی اچھا نہیں لگا ہوگا......اور اللہ بندے کے گمان کے ساتھ ہے۔" آمنہ کی بات سن کر وہ متاثر ہوا۔

"اگر میں تمہیں جاب نہ دیتا تو پھر کیا کرتی؟"

"اگر میں لیٹر ملنے پر بھی آپ کو اٹینڈ نہ کرتی تو آپ کیا کرتے؟"

"میں......میں" وہ سوچنے لگا تو آمنہ کی مسکراہٹ نے اس کی سوچ کا منتشر کر دیا۔ وہ اُسے بانہوں میں بھرتا ہوا بولا۔ "میں تقدیر کی مہربانی پر اس کا ممنون نہیں ہونگا...... کیونکہ مجھے قبول تو تم نے کیا ہے۔"

"میں محبت کی احسان مند ہوں...... کیونکہ اس بار بھی بازی محبت نے ہی جیتی ہے۔" احمد نے آگے بڑھ کر اس کے گال پر محبت کی مہر ثبت کی تو وہ دوہری ہوگئی۔ "آنکھیں بند کرو۔" احمد کے کہنے پر وہ اس کی طرف پوری آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی اس کا انداز حیرت واستعجاب کے ساتھ استفہامیہ بھی تھا احمد کھلکھلا کر ہنس پڑا تو آمنہ شرم سے پانی پانی ہونے لگی۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

"جناب! آپ کی محبت کو خراج عقیدت جو پیش کرنا ہے۔" وہ لجاتی ہوئی بولی۔ "مگر مجھے نہیں کرنی آنکھیں بند۔"

"مجھ پر اعتماد کرو۔" وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔ "اچھا تو پھر میں ایسا کرتا ہوں کہ آپ کے سامنے ہی محبتوں کی معراج کو بلند رکھتے پر آپ کو عملی طور پر اپنی گہری محبت کا ثبوت دیتا ہوں۔"

اُس نے قیمتی سوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بند مٹھی باہر نکالی تو آمنہ تجسس سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ "اس مٹھی میں میری طرف سے تمہاری محبت کو دیا جانے والا حقیر سا تحفہ بند ہے......اب آنکھیں بند کرو۔" آمنہ کو اس سے احمد پر بہت پیار آیا وہ آگے بڑھ کر اُسے چومنا چاہتی تھی مگر شرم وحیا مانع آ گئی۔ اس نے شرم سے لرزتی ہوئی پلکیں آہستہ آہستہ جھکا کر آنکھوں کے کٹوروں کو بند کر لیا۔ احمد اس کے چاند سے چہرے کا پیار بھری نظروں سے طواف کرنے لگا۔ آمنہ کے سُرخ ہونٹ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ چہرے پر حیا کی سُرخی پھیلی ہوئی تھی۔ ناک، ہونٹ، کانوں کی سُرخ لوئیں۔ گالوں سے غروب آفتاب کی سرخی چھلک رہی تھی۔ سراپا ایسا تھا کہ اگر شاعر کچھ لکھنے بیٹھتا تو الفاظ آمنہ کی سادگی پر قربان ہونے کیلئے مچلنے لگتے۔

احمد کا جی نہ بھر رہا تھا اس نے آمنہ کے خوبصورت گالوں پر محبتوں کی ایک اور مہر ثبت کی تو وہ

خماری اور سرشاری کے نشے میں کسمانے لگی۔ "اب مجھ سے ڈر نہیں لگتا؟" احمد کے الفاظ پر آمنہ کے سر ہولے سے نفی انداز میں ہل گیا۔

"آمنہ!" وہ ہولے سے پکارا تو جواب بھی ہولے سے ہی آیا۔ "ہوں"

"ان جھیل جیسی آنکھوں کو محبت اور خلوص کے ڈوروں سے ہمیشہ تر رکھنا کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ ہرنی کی مثال لوگ بھول جائیں۔ ان ہونٹوں کو یونہی مہکتے گلابوں کی طرح رکھنا تا کہ کوئی مصور کسی بھی شاہکار کو تخلیق کرنے سے پہلے کسی گلاب سے نہیں بلکہ تمہارے ہونٹوں سے تشبیہ دے۔ ان گالوں کی شفق کو یونہی پھوٹنے دینا کیونکہ میں غروب ہوتے ہوئے سورج کو بھی شرمندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس چہرے پر شرم وحیا کی چاندنی یونہی بکھری رہنا دینا۔ جانتی ہو کیوں؟" پھر ہولے سے نفی میں سر ہلا مگر انداز خماری اور سرشاری سے بھرپور تھا۔

"کیونکہ چودھویں کا چاند آج تک اپنی چاندنی پر مغرور تھا۔ میں اس کا غرور توڑنا چاہتا ہوں——" وہ آمنہ کا کومل سا وجود اپنی بانہوں کے حصار میں بھرتا ہوا بولا۔ "کسی سنگتراش کے سامنے مت جانا وہ دیوانہ ہو جائے گا وہ جس محنت اور محبت سے اپنے مجسموں کو شاہکار بناتا ہے تمہیں دیکھ کر وہ اپنے اوزاروں کو کوسنے لگے گا۔ ان پاؤں کی گوری گوری رنگت سے پائل کو کھیلنے دینا—— کیونکہ میں چاہتا ہوں جھرنوں کا پانی اپنی جھنکار بھول جائے۔ نازک سے ہونٹوں سے محبت کی باتیں خوشبو پھیلاتی رہیں تا کہ مجھے کبھی بھی گلشن میں جانے کی ضرورت نہ پڑے۔"

احمد شاعر تو نہ تھا مگر آمنہ کا سراپا حسن ہی ایسا شاہکار تھا کہ شاعری خود بخود ہی شروع ہو جاتی تھی۔ آمنہ کی تعریف میں احمد نے جو الفاظ استعمال کیے تھے وہ یقیناً محبت کے اس تاج محل کو خراج تھا۔ وہ انگلی کی مدد سے آمنہ کے حسین چہرے کو اوپر اٹھایا ہوا بولا۔

"اب آنکھیں کھول لو!" آمنہ نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں تو حیرت کی انتہا نہ رہی احمد کی مٹھی جو کہ بند تھی اب کھل گئی تھی اس ہاتھ میں ہیروں کا خوبصورت ہار جگمگا رہا تھا۔ وہ اتنا قیمتی اور خوبصورت ہار دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ اُسے چھوتی ہوئی بولی۔ "یہ—— یہ کافی قیمتی لگتا ہے......" احمد مسکرانے لگا۔ اس نے ہار آمنہ کے گلے میں پہنانا شروع کر دیا۔ وہ ہار کی ڈوری باندھتا ہوا بولا۔ "اس دُنیا میں بہت سے لوگ چاند اور چاندنی کو خریدنے کے دعویدار ہیں مگر ان کی بے بہا دولت اور مقدر ان کا ساتھ نہیں دیتے—— اگر ایسا ہوتا تو ہر شخص—— جو کہ دولت مند ہے اپنی بغل میں چاند کو دبائے چاندنی کا حسین پیرہن اوڑھے ہم جیسے غریبوں کو جلاتا رہتا—— مگر میں

اس معاملے میں ان لوگوں سے خوش قسمت واقع ہوا ہوں کیونکہ انتہائی کم پیسوں میں میں نے اپنی محبت، چاہت اور خلوص کا گھیرا چاند کے گرد باندھ لیا ہے۔ یہ ہار میری محبت کا ثبوت تو ہے ہی مگر اس چاند پر میری ملکیت کا دعویدار بھی ہے۔" احمد نے آمنہ کی آنکھوں پر بوسہ دیا تو وہ خود سپردگی کے عالم میں احمد کی بانہوں میں جھول گئی۔

وہ احمد کی محبت بھری باتوں کو اپنے لیے تحفہ سمجھتی تھی۔ احمد نے اس کے حسن کی تعریف بھی ان الفاظ میں کی تھی کہ ہیروں کے قیمتی ہار کی مالیت الفاظ کی نذر ہو گئی تھی۔

"احمد!" وہ خماری سے بولی۔

"جانِ احمد!" وہ محبت سے بولا۔

"کیا میرا سراپا ان قیمتی چیزوں کا محتاج ہے؟"

"پگلی ہو گئی ہو۔" وہ تڑپ کر بولا۔ "میں ان چیزوں کو تمہارے حُسن کی زکوٰۃ سے چمکانا چاہتا ہوں۔ تمہارے حُسن کی بدولت تو ان چیزوں کی طلب میں اضافہ ہوگا...... ان حسین اور کالی زلفوں کو چاند جیسے چہرے پر مت آنے دینا ورنہ مجھے ان سے حسد ہوگا۔ یوں لگے کہ کوئی ناگن چاند پر قابض ہو گئی ہے۔ یا پھر گھنگھور گھٹائیں مزید سیاہ ہونے کیلئے تمہاری زلفوں کی سیاہی خیرات میں مانگنے لگیں گی...... مجھے یہ سب اچھا نہیں لگے گا...... کیونکہ اس مجسمہ حُسن پر صرف میرا حق ہے بس میرا......"

محبت کے پیاسے دونوں دِل برسوں کی تشنگی بجھانے کیلئے جامِ محبت نوش کرنے لگے تھے۔ بادلوں کی گھن گرج ان کو مبارک دے رہے تھی۔ نئے گھر کے خوبصورت لان میں کھلے ہوئے تازہ پھول اپنی مہک سے ان کی محبتوں کو سدا مہکنے کی دُعائیں دینے لگے تھے۔ تاروں نے بادلوں کی اوٹ میں چھپ کر سردیوں کے چاند کو بالکل تنہا کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھی کب تک برداشت کرتا۔ وہ بھی زمین پر آمنہ کا حسن دیکھ کر اپنا منہ چھپانے کیلئے بادلوں کی سیاہ چادر اوڑھ چکا تھا۔ دِلوں کی دھڑکنیں ایک دوسرے کی محبت کی گہرائی ماپنے کی کوشش میں کھسیانی ہو کر رہ گئیں۔

☆☆☆

"آدمی کو جب تکلیف پہنچتی ہے تو دِل شکستہ اور نا امید ہو جاتا ہے اور پھر ناشکری عذاب کی خوش خبری ہے۔" پروفیسر فائز احمد اس وقت چہرے پر نورانیت بکھیرے کندن کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے یا پھر یوں کہہ لیں کہ کندن ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ پروفیسر فائز احمد نے کندن کو

دائرہ اسلام میں داخل کر دیا تھا اب وہ پوری طرح مسلمان ہو گیا تھا۔ فائز احمد نے اُسے اپنے سابقہ رویہ کی بابت بتا دیا تھا اور کندن کو خوشی ہوئی تھی کہ وہ اس تکلیف دہ آزمائش میں پورا اترا تھا۔

وہ گھر سے نکل کر چھپتا چھپاتا پروفیسر فائز احمد کے پاس پہنچا تھا اُنہوں نے کندن کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اب وہ اپنے دھرم اور خاندان سے بغاوت کر کے آیا ہے کندن کی زبانی تمام حالت سننے کے بعد اُنہوں نے اُسے مسلمان کیا تھا اس کی آنکھوں کی روشنی یکدم بڑھ گئی تھی۔ دِل نورانی صداؤں سے دھڑکنے لگا تھا۔ چہرہ پر نور ہونا شروع ہو گیا تھا قلبی سکون نے چہرے پر نمودار ہو کر کندن کو اور بھی حسین کر دیا تھا۔

اب اس کا نام کندن سے "کلیم اللہ" ہو گیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اُسے بتایا تھا کہ کلیم اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے اللہ سے کلام کرنے والے کو کلیم اللہ کہا جاتا ہے۔ وہ اس نام سے بہت خوش تھا وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ اس نے ان آنسوؤں کو ربِ واحد کے نام پر بہنے دیا۔ وہ مذہب اسلام کو اپنے حقیر سے آنسوؤں کے خراج پیش کر رہا تھا۔

پروفیسر فائز احمد اُسے گذشتہ دو گھنٹوں سے اسلام کے متعلق اہم اور بنیادی باتیں بتا رہے تھے وہ تحمل اور غور سے سن رہا تھا ہر ایک لفظ کو ذہن اور دِل کے نہاں خانوں میں محفوظ کر رہا تھا۔

"اگر خداوند کریم تم کو کسی قسم کی تکلیف پہنچانا چاہے تو اس کے سوا کوئی نہیں ہے جو اس تکلیف کو دور کر سکے۔

اور اللہ زیادہ تکلیف اُسے ہی دیتا ہے جسے اپنا دوست رکھتا ہے اور اللہ کے پیارے محبوب حضرت محمد ﷺ کا فرمان مبارک ہے کہ ہماری تکالیف ہمارے گناہوں کا کفارہ ہیں۔ جس طرح بھی اللہ تعالیٰ رکھے اُسی طرح اور اسی حال میں رہ کر اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔" پروفیسر فائز احمد خاموش ہوئے تو کلیم اللہ کے ہونٹ پھڑپھڑائے "سر؟" وہ نہایت عاجزی سے بولا تھا۔ "میں اپنے محسن سے ملنا چاہتا ہوں جس نے مجھے دِل کے اندھے کو دینِ اسلام کی شمع بخشی...... میرے دل کی گمراہی دور کرنے والا اس کائنات میں میرا سب سے بڑا محسن ہے۔ میں کئی زندگیاں بھی اس پر قربان کر کے اس کا قرض نہیں اتار سکتا...... سر!...... میں خلیل احمد سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس کی بات اور دل کی تڑپ فریاد بن گئی تھی مگر فائز احمد لرز گئے تھے۔ وہ اُسے خلیل احمد کے المناک حادثے کے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تھے مگر یکدم ایک کمرے سے دیوانگی کی حدوں کو چھونے والی چیخیں

سن کر کلیم اللہ چونک گیا۔ فائز احمد کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"سر!۔۔۔ یہ آوازیں کیسی ہیں؟" کلیم اللہ کا سوال فطری تھا۔ پروفیسر صاحب اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ایک راہداری میں لے گئے آوازیں ایک کمرے سے آ رہی تھیں الفاظ میں رشتوں کی تڑپ اور کرب کے احساس نے کلیم اللہ کو لرزا دیا وہ فائز احمد کا منہ دیکھ کر رہ گیا اس کیلئے ایک اور حیرانگی بھی منتظر تھی کہ اس کمرے کے دروازے کو باہر سے بھی کنڈی نہ لگائی گئی تھی جس کمرے سے اذیت ناک اور دل کو تڑپا دینے والی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

"میں نے کہا تھا نا کہ اللہ تعالیٰ جسے اپنا محبوب رکھتا ہے اُسے تکالیف بھی زیادہ دیتا ہے اسلام کی راہوں پر چلنے کیلئے جن پاؤں کی ضرورت ہوتی ہے وہ انتہائی مضبوط ہونے چاہئیں۔۔۔ تم اپنے محسن خلیل احمد سے ملنا چاہ رہے تھے۔۔۔ لو مل لو" اُنہوں نے دروازے کو ایک ہاتھ سے دھکیلا تو دروازہ اندر کمرے کی جانب کھل گیا۔

اندر کا ماحول دِل کو تڑپا گیا تھا روح کو گھائل کر گیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو ختم ہو کر وحشت چھا گئی تھی۔ سر اور جسم کے بال کنڈوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے۔ چہرے پر نورانیت کی جگہ کرب کی زردی چھا گئی تھی۔ لرزتے ہونٹ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھے۔ کانپتی ٹانگیں وجود کا بوجھ سہارنے سے انکاری ہو رہی تھیں۔ پاؤں کے ساتھ لاکھوں من وزنی پتھر بندھ گئے تھے۔ دل کی چیخیں سسکیوں میں دبنے لگیں دماغ نے کام چھوڑ دیا تھا۔

کلیم اللہ اپنے محسن خلیل احمد کی حالتِ زار پر زار و زار رونے لگا۔ اس نے خلیل احمد کو دیکھا جو ایک کھونٹے کے ساتھ کسی جانور کی طرح موٹے سنگل سے بندھا ہوا تھا کمرے میں کسی بھی فرنیچر نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ خلیل احمد ہاتھوں سے سنگل پکڑ کر اُسے توڑنے کی ناکام کوشش میں اپنے آپ کو زخمی کر چکا تھا فائز احمد کی آنکھیں بھی موتی برسانے لگیں تھیں۔ خلیل احمد کی دِل کو چیرنے والی کربناک آوازیں "امی جی۔۔۔ ابو جی۔۔۔ امی جی۔۔۔ میری امی کو بلاؤ۔۔۔ میری امی کو بلاؤ۔۔۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔۔۔ مجھے خوف آتا ہے۔۔۔ امی جی۔۔۔ کہاں ہو۔۔۔ کہاں ہو ابو جی۔۔۔ باجی۔۔۔ مجھے بھوک لگی ہے۔۔۔ مجھے پیاس لگی ہے۔۔۔ مجھے اپنے پاس بلاؤ۔۔۔ میرے پاس آ جاؤ۔۔۔ میرے پاس آ جاؤ۔۔۔ خدا کا واسطہ!۔۔۔ تم لوگوں کو اللہ کا واسطہ۔۔۔ مجھے کہاں چھوڑ گئے ہو۔۔۔ امی جی۔۔۔" کلیم اللہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھا اس نے خلیل احمد کو گلے لگا لیا۔۔۔ اپنی باہوں کے حصار میں بھر لیا۔ اپنے سینے سے اس کے سینے کو مسلنے لگا۔ خلیل احمد کا رونا اور چیخنا چلانا بند ہو گیا تھا وہ

غور سے کلیم اللہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی میلے میں کھوئی ہوئی چھوٹی سی چیز کو تلاش کر رہا ہو۔۔۔۔۔۔

"مم۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں تمہارا دوست ہوں خلیل احمد۔۔۔۔۔ مجھے پہچانو۔۔۔۔۔ میں کُندن ہوں یار" اتنی بات کرتے ہی کلیم اللہ کی ہمت جواب دے گئی وہ زار و زار رونے لگا۔۔۔۔۔ فائز احمد بھی ایک طرف کھڑے اپنے خاص شاگرد خلیل احمد کی اذیت ناک حالت سے سخت دُکھی ہو رہے تھے اور نو مسلم کندن کی دلی کیفیت کو بھی اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ خلیل احمد اور کُندن جگری دوست تھے۔ خلیل احمد نے اپنی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا اس نے کندن کو دین اسلام کی شمع تھما کر اُسے روشنی اور کرنوں کے راستے پر چلنا سکھایا تھا۔ کُندن سے کلیم اللہ بننے میں مدد دی تھی۔ مگر آج وہی خلیل احمد اُسے پہچاننے سے انکاری تھا۔ اس کا دماغ اس کا ساتھ نہ دے رہا تھا۔

"خلیل احمد!" وہ کرب سے دوچار تھا لرزتے ہونٹ دوستی کی پرانی باتوں اور بچپن کے پرانے یارانے کا واسطہ دے رہے تھے۔ "میں تمہارا کلاس فیلو ہو۔۔۔۔۔ مجھے غور سے دیکھو۔۔۔۔۔ تم خلیل احمد ہو۔۔۔۔۔ کالج کے ہونہار سٹوڈنٹ اور مسلمانوں کا فخر ہو تم۔۔۔۔۔" مگر خلیل احمد کی آنکھوں میں شناسائی کی بجائے غنودگی چھانے لگی وہ آہستہ آہستہ کلیم اللہ کی باہوں میں یہی جھول گیا اس نے آرام سے اُسے زمین پر بچھے ہوئے گدے پر لٹا دیا اور دُکھ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ کئی ساعتیں ایسے ہی گزر گئیں وہ پیچھے مڑا تو پروفیسر صاحب موجود نہ تھے غالباً وہ برداشت نہ کر پائے تھے اور کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔

کلیم اللہ بھی دروازے کو بند کرتا ہوا واپس اسی کمرے میں آ گیا جس جگہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوا تھا۔ فائز احمد ایک صوفے پر نیم دراز لیٹے ہوئے تھے اُسے دیکھ کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ رونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں سُوج گئیں تھیں اور ناک بھی سُرخ ہو گئی تھی۔ یہی حال کلیم اللہ کا تھا وہ چلتا ہوا فائز احمد کے پاؤں میں ہی بیٹھ گیا۔ اُنہوں نے اُسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا۔

"یہ سب کیسے ہوا سر؟" کلیم اللہ کی طویل سانس کے بعد چند الفاظ ترتیب سے نکلے تھے۔

فائز احمد سامنے دیوار پر لگے کیلنڈر کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے جس پر خانہ کعبہ کی بڑی سے تصویر چھپی ہوئی تھی۔

"موت تکلیف دہ ضرور ہے مگر اتنی نہیں جتنی کہ زندگی۔" وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولے

تھے۔ ''تکلیف، دکھ، رنج، غم اور مصیبتیں ہمیشہ اپنوں سے ہی ملا کرتی ہیں اجنبیوں سے نہیں...... کلیم اللہ...... میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے حادثے دیکھے ہیں...... میرے بھائی کو اسلام کی خدمت کی پاداش میں میری آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا...... میں وہ حادثہ دل پر سہہ گیا...... آنکھوں نے برسنا چھوڑ دیا تھا مگر دل کی دھک دھک اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ مجھے وہ کام مکمل کرنا ہے جو میرے بھائی نے مرتے وقت چند الفاظ میں میرے سپرد کیا تھا...... اُنہوں نے کہا تھا۔ فائز احمد ہمیشہ ایسا کام کرنا جس سے اسلام کا پرچم سربلند رہے...... میرا سر جھکنے نہ دینا...... اللہ کی عدالت میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے سرخرو ہونا چاہتا ہوں...... میں اپنے بھائی کی لاش کے ٹکڑے سمیٹتا سمیٹتا اتنا مضبوط بن گیا کہ بڑے سے بڑے کفر کے طوفان بھی میرے پاؤں نہ اکھیڑ سکے...... مگر کلیم اللہ۔'' ان کی آواز بھرانے لگی۔ الفاظ گم ہونے لگے۔

''خلیل احمد کو میں جس حالت اور جس جگہ سے لیکر گھر پہنچا ہوں وہ حادثہ میرے دل و دماغ میں نقش ہو گیا ہے...... گو کہ اس حادثے میں مرنے والے سبھی مسلمان نہ تھے مگر انسان تو تھے...... خلیل احمد کا پورا کنبہ ہی جل کر راکھ ہو گیا۔ جس انسان کو رب واحد نے اپنا نائب بنا کر اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے اس نے ایسا انسانیت سوز قہر ڈھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسان بنانے کی مخالفت کرنے والے نکیرین بھی کانپ گئے ہیں۔'' پروفیسر فائز احمد کی آواز نے ان کے ساتھ چھوڑ دیا تھا وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں بھرنے لگے۔

کلیم اللہ سمجھ گیا کہ خلیل احمد کے رشتہ دار پاکستان میں رہتے تھے اس کی فیملی ان سے ملنے کیلئے پاکستان جا رہی ہوگی کہ ٹرین کا حادثہ ہو گیا۔ مگر آگ لگنے کی بظاہر تو وجہ سمجھ میں نہ آئی تھی۔ لیکن پروفیسر صاحب کے الفاظ یہ ثابت کرتے تھے کہ آگ جان بوجھ کر لگائی گئی تھی۔

''مم...... مگر سر!'' کلیم اللہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کونسے الفاظ استعمال کرے۔ ''کوئی انسان ایسا جان بوجھ کر کیوں کرے گا؟...... اُسے اتنے انسانوں کی جان لینے کا کیا فائدہ؟'' وہ روہانسا ہو گیا تھا خلیل احمد کی حالت نے اس کے اندر کی حالت بگاڑ دی تھی۔

''اس کائنات میں انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی رحمٰن و رحیم رب نے شیطان بھی بنایا تھا۔ گو کہ اس کا مقام آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے فرشتے کا تھا مگر وہ بڑا اجبار و قہار ہے...... یہ دُنیا آزمائش کی جگہ اس نے ہی یہ تمام کھیل رچایا ہے ایک فرشتہ اسی کی مرضی اور منشاء سے ہی شیطان بن گیا ہے۔ رحمٰن کا کام بنانا اور شیطان کے کام بس بگاڑنا ہے۔ تم دیکھو اللہ تعالیٰ کی رحیمی کہ کُندن

سے کلیم اللہ بن گئے...... مگر تمہارے باپ کے وسائل ان کا نام، حیثیت اور سٹیٹس کل کو تمہیں اس بات پر بھی مجبور کر سکتا ہے کہ تم واپس اپنی دُنیا میں لوٹ جاؤ...... اگر تم ایسا کرتے ہو تو فتح شیطان کی ہوگی...... اگر نہیں کرتے ہو...... رحمٰن و رحیم اور جبار و ستار رب کی وحدانیت پر قائم رہتے ہو تو شیطان تلملائے گا۔ اپنی شکست پر زخم خوردہ ہو کر تمہارے باپ کو اپنی اپروچ استعمال کرنے پر اکسائے گا۔ اُسے یہ احساس دلائے گا کہ تم نے یعنی کلیم اللہ نے مسلمان ہو کر اس کے منہ پر کالک مل دی ہے...... بس بے بس اور شکست خوردہ انسان پھر اپنا انتقام لیتا ہے اس بات سے قطع نظر کہ اس میں انسانیت کا خون ہو رہا ہے یا اس کے مذہب پر حرف اُٹھے گا۔'' فائز احمد خاموش ہوئے تو کلیم اللہ بات کی گہرائی تک پہنچ گیا تھا اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے وہ خواب بھی تصور نہ کر سکتا تھا کہ اس کا باپ اپنا انتقام اس انداز میں لے گا کہ خلیل احمد کے تمام خاندان کو جلا کر بھسم کرنے کی کوشش میں پوری انسانیت کا قاتل بن جائے گا...... یہ کیسا انسان ہے جو انسانیت کی معراج سے گر گیا ہے؟

''میری کہی ہوئی باتوں پر دل میلا مت کرو کلیم اللہ'' کلیم اللہ چونک کر پروفیسر فائز احمد کی طرف دیکھنے لگا کیونکہ یہ بات اس کے دِل میں تھی کہ ٹرین کو آگ اس کے باپ پرساد چوپڑہ نے لگوائی تھی۔ فائز احمد کو اللہ تعالیٰ نے واقعی علم کا سمندر عطا فرمایا تھا۔ ''خدشوں اور وہموں سے نجات حاصل کرنا سیکھو...... خلیل احمد مسلمان تو تھا ہی مگر انسان بھی تھا۔ اور اللہ کی محبت اور محنت سے بنے ہوئے انسان پر اگر انسان ہی ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تو وہ خود انصاف کرتا ہے...... مگر تم کبھی بھی اس سے انصاف کی طلب مت کرنا...... کیونکہ اس کے میزان میں جھول نہیں ہوتی...... بس ہمیشہ اس رحمٰن کی ذاتِ مقدس سے رحم کی بھیک طلب کرنا اور اس کے فضل کی امید رکھنا۔''

''سر!'' وہ اداس اور غمگین لہجے میں گویا ہوا۔ ''اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سزا کیوں نہیں دیتا؟'' یہ پہلا سوال تھا جو اس نے مسلمان ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق پوچھا تھا۔ ابھی اُسے کافی کچھ سمجھانے اور سکھانے کی ضرورت تھی۔ ''اللہ تعالیٰ کی لاٹھی بڑی بے آواز ہوتی ہے۔'' پروفیسر فائز احمد نے کہا۔ ''اس کے قانون انوکھے اور نرالے ہوتے ہیں...... وہ قادرِ مطلق ہے ہر چیز پر اس کی قدرت ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے مگر اپنے بنائے ہوئے قانون نہیں بدل سکتا!'' کلیم اللہ کی سمجھ میں بات نہ آئی تھی۔ فائز احمد اس کی کیفیت بھانپتے ہوئے بولے۔

''میں تمہیں آسان الفاظ میں سمجھاتا ہوں...... اگر تم دُعا کرو کہ یا باری تعالیٰ مجھے دو سو سال

کی لمبی عمر عطا فرما...... تو تمہارا کیا خیال ہے وہ نہیں کر سکتا...... وہ کر سکتا ہے...... کیونکہ اُسے ہر بات ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔ مگر اس کا بنایا ہوا قانون بہت اہمیت کا حامل ہے وہ ایک انسان کی دُعا قبول کرنے کیلئے اپنے قانون نہیں بدل سکتا...... بس یہ سمجھ لو کہ اللہ کی پاک ذات اس سانحے کے ذمہ داروں کو بہت سزا دے گی جب اس کا قانون چاہے گا...... تب تک وہ ظالموں کی رسی دراز کرتا رہتا ہے...... مگر جب وہ رسی کھینچتا ہے تو ظالم منہ کے بل گرتا ہے۔"

پروفیسر فائز احمد نے کلیم اللہ کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا وہ خلیل احمد کی حالت سے کافی پریشان تھا مگر اس کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔

"اپنے گھر جاؤ کلیم اللہ!" وہ فائز احمد کی بات سن کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ بولے۔ "کلیم اللہ!...... یہ دُنیا فانی ہے جو آیا ہے وہ جائے گا بھی...... مگر وہ زندگی کس طرح گزار کر گیا ہے اس کا حساب اللہ تعالیٰ لے گا...... تمہیں اپنے خاندان سے اُلجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے...... فی الحال اپنے مسلمان ہونے کی خبر ان کو مت بتانا...... اللہ سب بہتر کر دے گا۔" وہ اُٹھتا ہوا بولا۔

"مگر سر!...... خلیل احمد کا کیا بنے گا؟" وہ اپنے جگری دوست اور محسن کی طرف سے پریشان تھا۔

"میں آج اِسے ہسپتال میں داخل کروانے والا ہوں۔" فائز احمد نے جان بوجھ کر مینٹل ہسپتال کا نام نہ لیا تھا۔ انہیں بھی خلیل احمد کی حالت کا افسوس تھا۔ "تم فکر مت کرو...... خلیل احمد سے تمہاری ملاقات ہوتی رہے گی۔" یہ کہہ کر وہ خاموشی سے کلیم اللہ کو دیکھتے رہے وہ ان سے گلے ملا اور روتی ہوئی آنکھوں سے باہر نکل گیا۔ پروفیسر فائز احمد کی نظریں سامنے خانہ کعبہ کے کیلنڈر پر ٹک گئیں۔

"لبیک اللھم لبیک۔ لبیک اللھم لبیک۔" ان کے ہونٹ متحرک ہو گئے۔ آنکھوں نے ساون کی جھڑی لگا دی۔ جاگتی آنکھوں سے آنسو اس قدر روانی سے نکل رہے تھے کہ گویا کسی نے کوئی پانی کی ننھی سی پیہم لکیر بنا دی ہو...... چند ساعتیں ایسے ہی گزر گئیں پھر نجانے ان کے دل میں کیا آئی کہ وہ اُٹھ کر اس دیوار کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے جس پر خانہ کعبہ کا کیلنڈر لٹکا ہوا تھا۔ اُنہوں نے اس تصویر کو بوسہ دیا اور روتی ہوئی آنکھوں سے اُسے چومنا شروع کر دیا۔

"[illegible] اللہ اس بچے کی مدد فرمانا۔ اس کی رہنمائی فرمانا۔" وہ کلیم اللہ کیلئے روتی آنکھوں

سے دُعا مانگ رہے تھے۔ "اسے اپنی راہوں پر ثابت قدم رکھنا اس کے ارادوں کو اٹل اور مضبوط بنا دے۔ اس کی راہوں میں آنیوالے تمام کانٹے اپنے حبیبؐ کے صدقہ سے گلزار بنا دے۔" آنکھوں کی برسات اور الفاظ کے ساتھ ساتھ گریہ زاری اس بات کی علامت تھی کہ کلیم اللہ کیلئے یہ راہیں آسان نہ ہونگی۔

☆☆☆

جگنو کا لباس گو کہ سفید اور بے داغ تھا مگر اس کی رال ٹپک ٹپک کر اس بات کا عندیہ دے رہی تھی کہ لباس انسان کی اچھی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے مگر جھلے اور اللہ والے بندوں کو سفید لباس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کیونکہ وہ ان تمام باتوں سے خود کو بچا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو باتیں دُنیا دار لوگوں کیلئے نعمت ہوتی ہیں۔

وہ اس وقت حافظ جی کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا ان کی ٹانگیں دبا رہا تھا اور حافظ جی کے متحرک ہونٹ اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ وردِ الٰہی میں مشغول ہیں۔ جگنو ان کا مزاج سمجھتا تھا وہ بھی خاموشی سے بیٹھا ان کی خدمت میں مصروف تھا۔ گزشتہ کئی دِنوں سے حافظ جی کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اُنہیں سخت بخار ہو جاتا اور بعض اوقات ان کا جسم بالکل ٹھنڈا ہو جاتا۔ جگنو ان کی اس حالت پر پریشان ہوتا تو وہ اُسے سمجھانے لگتے وہ بڑے انہماک سے ان کی باتیں سنتا رہتا اور پھر گھر آ کر ان پر پہروں غور کرتا رہتا۔ اب وہ بالکل اکیلا ہو گیا تھا۔ عفی اُنہیں چھوڑ کر جا چکا تھا اور آمنہ کی شادی ہو چکی تھی۔ احمد نے کئی بار کہا تھا کہ جگنو آمنہ سے مل آیا کرو...... مگر وہ ہنس کر ٹال دیتا تھا۔

"جگنو!" حافظ جی کی مدہم مگر مٹھاس بھری آواز نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ "جی حافظ جی!" وہ دِل و جان سے بولا تھا۔ "کردار ایک ایسا ہیرا ہے جو پتھر کو کاٹ سکتا ہے۔" حافظ جی کی بات اُسے سمجھ تو نہ آئی مگر وہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلا کر رہ گیا وہ دوبارہ بولے۔ "بڑی سے بڑی آزمائش میں اپنے کردار کی بلندی کو کبھی بھی داغ نہ لگنے دینا۔ انسان اپنے کردار کی بنا پر اس دُنیا میں پہچان بناتا ہے مگر آخرت کی دُنیا میں اپنے اعمال کی بوریاں بھر بھر کر اپنے ساتھ لیجانی پڑتی ہیں۔ اور اچھے اعمال تبھی ہوتے ہیں جب آپ کا کردار اچھا ہوگا۔" اُنہوں نے آنکھیں کھول دیں تو جگنو کو ان کی آنکھوں سے خوف آنے لگا ایک لمحہ تو اُسے ایسا لگا کہ حافظ جی اُسے دیکھ رہے ہیں۔ جگنو نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

''میری باتوں کو اچھی طرح سمجھ لو جگنو میاں۔''

''سمجھ رہا ہوں جی!'' جگنو خوش ہو کر چہکنے لگا۔ ''میں آپ کی باتیں ابا جی کو بتاتا ہوں...... اماں بھی بہت خوش ہوتی ہے۔ ابا جی آپ کی باتیں سُن کر مجھے ان کا وہ...... وہ کیا ہوتا جی...... وہ سمجھاتے ہیں۔'' اُسے کوئی لفظ یاد نہ آ رہا تھا مگر اس کی سادگی پر حافظ جی کھلکھلا کر ہنسنے لگے وہ بہت کم ہنسا کرتے تھے بس جگنو نے اُنہیں مسکاتے ہی دیکھا تھا۔

''مطلب!'' حافظ جی بولے تو جگنو اپنے ٹیڑھے ہاتھ سے بے آواز چٹکی بجا کر بولا۔ ''ہاں جی...... یہی...... جو آپ نے کہا ہے...... مجھے نہیں آ رہا تھا کہ اِسے...... کہتے ہیں۔'' وہ پھر اس لفظ کو ادا نہ کر سکا تو حافظ جی ہنستے ہوئے بولے۔

''اوئے جھلیا! مجھے آج ہنسائے جا رہے ہو۔''

''ابا جی کہتے ہیں جو ہنستا ہے وہ تندرست ہوتا ہے۔''

''جگنو!'' حافظ جی یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ ''حج کرو گے۔'' جگنو کی بھی ہنسی گم ہو گئی اس نے حج کا نام سنا تھا مگر اُسے معلوم نہ تھا کہ حج کسے کہتے ہیں۔ کیسے ہوتا ہے اور کیوں کرنا چاہئے؟ وہ حافظ جی کا منہ تکتے رہ گیا۔

''تمہارے گھر میں کعبہ موجود ہے اس کی خدمت کرو...... اُسے محبت اور پیار سے دیکھو...... ایک بار دیکھو گے ایک حج جتنا ثواب پاؤ گے۔'' وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور حجرے کے ایک کونے کی جانب بڑھ گئے۔ جگنو بھی ان کے احترام میں کھڑا تھا۔ اس وقت رات کا عالم تھا دربار کے احاطہ اور گردو جوار میں کوئی بھی نہ تھا۔ پرنور ماحول اور باادب ہوا نے احترام کی فضا قائم کر رکھی تھی۔ نور شاہ ولی سرکارؒ کے مزار پر جلنے والے چراغ محبت اور خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سحر انگیز ماحول کو جھوم جھوم کر خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ جگنو کیلئے یہ ماحول نیا نہ تھا کیونکہ وہ کئی راتیں دربار کے احاطہ میں گزار چکا تھا مگر آج حافظ جی کا کردار اس کیلئے معمہ بنا ہوا تھا اُنہوں نے کبھی بھی جگنو سے اس طرح باتیں نہ کی تھیں۔ وہ کونے میں رکھے ہوئے ایک چمڑے کے بیگ کی طرف بڑھے تھے اور اب اس میں ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کر رہے تھے۔ جگنو اس وقت ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو گیا جب اُنہوں نے ایک شیشے کے چھوٹے سے فریم میں جڑی ہوئی کسی عورت کی بلیک اینڈ وائیٹ تصویر نکالی وہ جگنو کی طرف مڑے اور اپنے قمیض سے اس تصویر کو صاف کر کے بوسے دینے لگے۔ پل بھر میں خوشگوار فضا سوگواری اور اداسی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

حافظ جی کی آنکھیں برسات برسانے لگیں تھیں۔ جگنو حیرت میں گنگ ان کی طرف اور کبھی ان کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تصویر کو دیکھتا تھا وہ حافظ جی کی اندرونی کیفیت کو سمجھ نہ سکتا تھا مگر یہ ضرور جان گیا تھا کہ یہ عورت ضرور کوئی خاص ہی ہوگی جس کی تصویر کو حافظ جی چوم رہے ہیں وہ پوچھنے کی جسارت نہ کر سکا تھا۔

چند سوگوار گھڑیاں اسی طرح گزر گئیں تو حافظ جی کی آنکھوں کی برسات تھمتے تھمتے تھم گئی۔

''تم حیران ہو گے جگنو میاں!'' وہ بھرائے ہوئے نم لہجے میں بولے تو جگنو ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''یہ تصویر میری ماں کی ہے۔'' جگنو پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ''باپ کی وفات کے بعد انہوں نے مجھے بہت مشکل سے پالا تھا۔ لوگوں کے گھروں کا کام کاج کر کے انہوں نے مجھے پڑھایا لکھایا۔ غربت اور افلاس کی آخری حد پر پہنچ کر میری ماں جب بیمار ہوئی تو گھر میں کچھ بھی نہ تھا میں نے اپنا خون بیچ کر اپنی ماں کی دوائی خریدی تھی۔'' حافظ جی کی آنکھیں ایک بار پھر برسنے لگی تھیں۔ جگنو بھی نمدیدہ آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ ''میری ماں نے مجھے دُعا دی تھی کہ اللہ تمہیں سات سات حج کرائے گا۔ مگر میں ان کے دیدار سے ہی ربِ کعبہ کا نظارہ کر لیا کرتا تھا...... ماں ایک دن مجھے اس دُنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔ میرا حج ختم ہو گیا۔ میری عبادت ختم ہو گئی۔ میری کائنات لُٹ گئی تھی۔'' حافظ جی کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو گئے تھے نمکین پانی نے گویا آنکھوں کو زخمی کر دیا تھا۔

''میں دردر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا۔ زمانے اور حالات کا ستایا ہوا اس فقیر کی چوکھٹ پر پہنچا تو مجھے یہاں کے متولی خوشی محمد نے رہنے کی اجازت دے دی۔ بس میری قسمت جاگ گئی۔ اِن کی بدولت میرے دِل کی تاریک دُنیا روشن ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص کرم فرمایا مجھے سرکار نور شاہ ولی کی زیارت سے فیضیابی ملنے لگی وہ میری رہنمائی فرمانے لگے۔ انہی دِنوں خوشی محمد کی یہاں سے بھی اور جہاں سے بھی ڈیوٹی ختم ہو گئی وہ مجھے سب کچھ سونپ کر اپنا فرض ادا کر کے جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ مگر ان کی ایک نصیحت میں نے اپنے پلّے باندھ رکھی ہے اُنہوں نے کہا تھا...... اگر اس دُنیا کی اچھائی اور بُرائی کو پرکھنا چاہتے ہو تو پھر اپنے ان ہونٹوں کو سی لو۔ کانوں میں سیسہ ڈال لو۔ زبان کو بتیس تالوں کے اندر رکھو۔ دِل پر قابو اور اختیار رکھو...... مگر میں نادان تھا اُن سے سوال کر بیٹھا...... آنکھوں کا کیا کروں؟'' حافظ جی کی آواز بھرا گئی۔ جگنو کا انہماک بتا رہا تھا کہ وہ ان کی ایک ایک بات پر غور کر رہا ہے اور سمجھ میں آ رہا ہے۔

رات کا سرد اور آخری پہر مزار شریف کے احاطہ کو پرنور بنانے کیلئے چاند سے چاندنی چُرا کر خود کو سرخرو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس پہر مزار شریف کے احاطہ میں ہر چیز اللہ کا ورد کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ پرنور اور وجدانی ماحول نے ہر چیز کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اللہ کی وحدانیت اور اس کے پیارے محبوب کی مدح سرائی نے ہر چیز کو خمار بخش دیا تھا۔ جگنو اور حافظ جی اس وقت واحد دو انسان تھے۔ جو اس وقت مزار شریف میں موجود تھے اور صاحب قبر تو یقیناً اللہ کی عبادت میں مصروف ہونگے۔

"پھر کیا ہوا حافظ جی؟" سوگواری اور غمزدہ ماحول میں جگنو کی سرگوشی ابھری تو حافظ جی چونک کر بولے۔

"پھر خوشی محمد نے میرے دل کا چور پکڑا۔ میں مجرم بن کر اس کی کشف بھری عدالت میں نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ خوشی محمد کو شاہ ولی سرکار کی نسبت سے بہت مرتبہ اور علم ملا تھا اُنہوں نے میری وہ چوری میرے سامنے رکھ دی اور بولے۔ حافظ جی سارا فتور اور فتنہ آنکھوں کا ہی ہے یہ حسین اور خوبصورت منظر دیکھ کر دِل کو اکساتی ہیں اور دِل بے ایمان ہو جاتا ہے۔ اور پھر نفس قابو میں نہیں رہتا اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دو جس کو گزشتہ تین ماہ سے ہر جمعرات کی شب مزار شریف پر دُعا مانگتے ہوئے دیکھتے ہو۔ تمہاری آنکھیں اس کی ایک جھلک دیکھنے کو بے چین و بے قرار ہو جاتی ہیں اور جب دیکھ لیتیں ہیں تو تمہارا دل بے تابی اور روانی سے دھڑکنے لگتا ہے اور تمہارا نفس تمہیں گناہ پر اکساتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم اپنی آنکھیں ہی بند رکھو۔ دِل کی دھڑکن کو یادِ الٰہی سے معمور کر لو تاکہ تمہارے نفس پر تمہاری پاکیزگی کی کاری ضرب لگے اور تم وہ بن جاؤ جو میں چاہتا ہوں اور جو صاحب مزار چاہتے ہیں...... یہ سننا تھا کہ میرے دِل کی دُنیا روشن ہو گئی...... میرا رواں رواں خوشی میں ناچنے لگا کہ میں ولی سرکار کی نگاہ میں ہوں وہ میرا خیال رکھتے ہیں۔ اُنہیں میں اچھا لگتا ہوں...... وہ میری ہر حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں میری خوشی دیدنی تھی میرے جسم کے ہر عضو نے شکر ادا کیا کہ میں ولی سرکار کی نگاہوں میں ہوں...... مگر میں نے بہت بڑا تاوان ادا کیا ہے۔" حافظ جی ایک بار پھر نمدیدہ ہو گئے۔ ان کی آواز بھرانے لگی تو جگنو نے اُنہیں دلاسہ دینے کیلئے ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اپنی آنکھیں ان کی ہتھیلیوں پر رکھ دیں آنسوؤں کے دو موٹے موٹے گرم قطروں نے حافظ جی کو بھی لرزا دیا۔ وہ مغموم اور نم لہجہ میں بولے۔

"جگنو! میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ عشق بڑا ہرجائی ہوتا ہے۔ یہ کھال کے جوتے مانگتا

ہے۔ اپنے بدن کی کھال" جگنو سمجھ نہ پایا کہ حافظ جی کے لہجے میں خوشی یا غم پھوٹ رہا ہے۔ بس وہ سنتا رہا۔

"عشق کی راہیں بڑی کٹھن ہیں مگر نجات کا راستہ بھی انہی راہوں پر چلنے سے ملتا ہے۔ لوگوں کا اعتراض اور طنزیہ باتیں عشق کو سرخرو کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ عاشق کیلئے طنزیہ باتیں ایک ٹانک کا کام کرتی ہیں وہ اپنے عشق میں دِل و جان سے ملوث ہو کر ہر قسم کا تاوان ادا کرنے کی ٹھان لیتا ہے اور نتیجتاً عشق سرخرو ہو کر دُنیا کو عاشق کے قدموں کی دھول بنا دیتا ہے...... میں بھی اللہ اور اس کے ولیوں کا عاشق بننا چاہتا تھا مگر اللہ کی قدرت نے مجھ سے میرے عشق کا ایسا تاوان لیا کہ میں اس تاوان کو ادا کرنے میں فرحت محسوس کرنے لگا ہوں۔ مجھے اس تاوان سے اپنائیت ہو گئی ہے میں نہیں چاہتا کہ میں اپنی آنکھوں سے اس ہوس اور ظالم دُنیا کو دیکھوں مگر ربّ ذوالجلال کو میری کوئی ادا اور میرا تاوان پسند آ گیا ہے۔ وہ بھی چاہتا ہے کہ میں اس دُنیا کو دیکھوں ایک بار پھر اپنی آنکھوں سے وہ مزار شریف دیکھوں جس کی چوکھٹ پر میں ایک حقیر سے بھوکے فقیر کی مانند آ کر گرا تھا۔ خوشی محمد کی زبان سے نکلنے والی تاوان کی مدت پوری ہونے والی ہے۔ بات کچھ یوں تھی کہ خوشی محمد نے میری دِلی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا کہ تم جس لڑکی کو من میں بسائے ہوئے ہو وہ کسی اور کی امانت ہے وہ اپنی خوشی حاصل کرنے کیلئے یہاں منت مانگنے آتی ہے مگر تمہاری آنکھوں کا قصور ہے کہ انہوں نے غیر یعنی پرائی امانت کو دیکھ کر تمہارے دل کو اکسایا ہے اس لیئے تمہیں اس بات کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ جب تک یہ لڑکی کعبہ کی چوکھٹ پر اپنا سر اور آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی چوکھٹ پر اپنا دِل نہیں جھکاتی تم نہیں دیکھ پاؤ گے۔ تمہاری آنکھیں تمہارے کسی کام نہ آ سکیں گی۔ اتنا عرصہ تم اندھے بن کر زندگی گزارو گے۔ بس سمجھو کہ یہ تمہاری آزمائش بھی ہے اور تمہارے اس عشق کا تاوان بھی...... جو تم ادا کر سکے تو سرخرو...... ورنہ تمام عمر یونہی بیت جائے گی۔ میں نے ولی سرکار کی نگاہوں کا تارا بننے کیلئے اس تاوان کو ہنس کر قبول کر لیا۔"

جگنو نے دیکھا کہ حافظ جی کے چہرے پر چھائی ہوئی سوگواری ختم ہو رہی تھی ان کے گال فرطِ مسرت سے پھڑ پھڑانے لگے تھے۔ "مجھے میرے مرشد کا قرب مل گیا ہے مگر تا حیات علم کی تشنگی برقرار رہے گی۔ مجھے مرشد سرکار نے بتا دیا ہے کہ اس سال وہ لڑکی حج کی ادائیگی کیلئے جا رہی ہے جیسے ہی وہ رب ذوالجلال کے مقدس گھر کو دیکھے گی میری بینائی لوٹ آنے کی امید ہو جائیگی مگر جب تک وہ روضہ رسولؐ پر حاضر نہ ہو گی میں مکمل طور پر دیکھ نہ سکوں گا...... اور جگنو میاں میں چاہتا

ہوں کہ جب میں دیکھنے کے قابل ہو جاؤں تو سب سے پہلے اپنی ماں کی تصویر دیکھوں اس کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھوں اور پھر...... اور پھر خانہ خدا اور روضۂ مصطفیٰؐ پر جا کر اپنے گناہوں کی تلفی کیلئے سر کو تب تک جھکائے رکھوں...... جب تک میرے تاوان کو قبول کر کے میرا عشق سرخرو نہیں کیا جاتا۔'' حافظ جی کی آنکھیں ایک بار پھر جگنے اور جلنے لگی تھیں۔

''جگنو گنگ ہو کر رہ گیا تھا یوں لگتا تھا کہ اس پر حافظ جی کی داستان سن کر سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ عشق کرنا آسان نہیں ہے۔ کہنا آسان مگر کرنا انتہائی مشکل ہے اس کا تاوان بہت کٹھن ہوتا ہے کبھی پتھر کھانے پڑتے ہیں۔ کبھی آرے سے چیرا جاتا ہے۔ دہکتی ہوئی آگ اور کبھی تیز دار چھری کے نیچے گردن تو کبھی آگ کو منہ میں ڈالنے کا حکم۔ تپتی اور جلتی ریت پر بدن کی ادھڑی ہوئی چمڑی کے ساتھ بھی وحدہ لاشریک کا نعرہ لگانا پڑتا ہے۔

''جگنو میاں! میں جب یہاں آیا تھا تو خوشی محمد ایک ملا پڑھا کرتا تھا جو خوبصورت الفاظ پر مبنی تھی مجھے وہ الفاظ نہیں بھولتے۔ خوشی محمد نے بھی کسی سے سنا تھا کہ......

؎ عشق دی راہ بڑی اوکھی جے ٹُریئے تے یار ملا دیندا
لا کے تخت توں تاجاں والیاں نوں خاکروباں دے نا رلد دیندا
ہتھ پیر دے چمن نہ دین لوکی
عشق کتیاں دے پیر چُما دیندا

جگنو میاں! یہ عشق کے معاملے بہت نرالے ہوتے ہیں انوکھے اور اوّلے ہوتے ہیں۔ دُنیاوی عشق تو سبھی کر لیتے ہیں مگر عشق حقیقی ہی اصل عشق کی رُوح ہے سچا عشق تو بس یہی ہے کہ اللہ کی واحدانیت کا پرچار کیا جائے اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ مقدس کو کائنات کی ہر چیز ہر رشتے اور ہر پہلو سے زیادہ چاہا جائے۔ عشق مصطفیٰ ﷺ کا ڈٹ کر دعویدار بھی بنا جائے۔'' حافظ جی کی آواز میں جوش دیدنی تھا ان کے چہرے کی رنگت سُرخ ہو گئی تھی۔ کان کی لوئیں تپ کر سُرخ رنگ کے سونے کا روپ دھار گئی تھیں۔

''حافظ جی!'' جگنو نے خوابناک ماحول میں ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''میں دل میں مدینہ دیکھنے کی تڑپ لیئے گلی گلی گھومتا ہوں۔ اس در کی چوکھٹ کو آنکھوں سے چومتا ہوں دِل میں ہر روز یہ آس اور امید لے کر آتا ہوں کہ سرکار مجھے مدینہ جانے کا ٹکٹ دیں گے۔'' اس سے آگے وہ بول نہ سکا تھا۔ حافظ جی نے آگے بڑھ کر انداز سے ہی اس کا سر اپنی گود میں چھپا لیا۔ جگنو اپنے اندر کتنا

بڑا طوفان چھپائے بیٹھا تھا یہ کوئی نہ جانتا تھا وہ دِل ہی دل میں مدینہ شریف جانے کی دُعائیں مانگتا رہتا تھا مگر کبھی بھی کسی پر اپنی خواہش کا اظہار نہ کیا تھا۔ وہ لوگوں کے لیئے کملا اور جھلا مست نما آدمی تھا مگر اس کے دِل میں عشق کی جوت جگ چکی تھی۔ وہ دیوانہ بن کر مدینے کی گلیوں میں گھومنا چاہتا تھا۔ پروانہ بن کر شمعِ رسالت کے گرد چکر لگانا چاہتا تھا۔ وہ ہوا میں شامل ہو کر گنبد خضریٰ کا طواف کرنا چاہتا تھا۔ مدینے کی گلیوں میں خاک بن کر اڑنا چاہتا تھا۔ جس طرح چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوتی ہے بالکل اسی طرح ادنیٰ' کملا جھلا اور مست جگنو بہت بڑی آرزو کر بیٹھا تھا۔ اگر کوئی اور اس کی بات سنتا تو ہنسی میں ٹال دیتا یا پھر اُسے پانچ دس روپے دیکر بہلانے کی کوشش کرتا۔ مگر حافظ جی نے اس کے دِل کی تڑپتی ہوئی دھڑکنوں کو سن لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمکنے والے آنسو حافظ جی کو اپنے دِل پر گرتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر مراقبے کی کیفیت میں رہے اور اللہ کی بارگاہ میں جگنو کی فریاد پہنچانے کی کوشش کی۔ مگر جو جواب ملا تھا وہ جگنو کی تڑپ بڑھانے کیلئے کافی تھا۔

''جگنو میاں!'' حافظ جی نے دیر کی وجہ کو الفاظ کا پیرہن اوڑھا کر جگنو کو سمجھانا شروع کیا۔ ''اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی بے نیاز ہے وہ نوازنے پر آئے تو ہم جیسے کم ذاتوں کو بھی اتنا نواز دے کہ جھولی تنگ لگنے لگے۔ مگر اس کے نوازنے کے رنگ نرالے ہیں اس کے انداز وہی جانتا ہے سب کو باری آنے پر اس کا مخصوص کیا ہوا حصہ مل جاتا ہے بس صبر کر کے اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔'' جگنو ان کی بات سن کر اثبات میں گردن ہلانے لگا اس نے حافظ جی کی بات سمجھ لی تھی۔

سردی اور کہرے نے ہر چیز کو منجمد کر کے رکھ دیا تھا مگر دور سے ہواؤں' فضاؤں اور خلاؤں کو چیرتی ہوئی مؤذن کی محبت بھری آواز نے رب واحد کی محبتوں کا پرچار کرتے ہوئے جہان میں پھیلنا شروع کیا تو کفر اور آسیب کے اندھیرے چھٹنے لگے۔ تہجد کی اذان سن کر حافظ جی نے جگنو کو خود سے الگ کیا اور وضو کرنے کیلئے دربار کے احاطہ میں جانے لگے۔ اُنہوں نے جگنو کو بھی آواز دی کہ وہ بھی وضو کرے اور اللہ کے حضور اپنی درخواست آنسوؤں کے قلم سے دل کے کاغذ پر لکھ کر سجدوں کی طشتری میں رکھ کر خلوص اور خضوع کے ساتھ پیش کرے تاکہ اس کی باری جلدی آ سکے۔

☆☆☆

''یہ میں کیا سُن رہا ہوں فریحہ!'' دانیال نے اپنا اٹیچی زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے آج پھر مما کے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔'' وہ ابھی ابھی فارن کنٹری سے لوٹا تھا اس کی ماں نے اُسے فریحہ کے لچھن اور زبان درازی کے بارے میں سخت الفاظ میں بتایا تھا بلکہ کان بھرے تھے وہ دھیمے مزاج کا شخص تھا مگر اپنی بے عزتی برداشت نہ کرتا تھا۔ چاہے اس کی لوّ ڑ کم بیوی فریحہ ہی کیوں نہ ہوتی۔

''میں نے مما کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی ہے...... وہ غلط کہہ رہی ہیں۔'' فریحہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا تو وہ تلملا کر رہ گیا وہ دبیز قالین پر چلتا ہوا قیمتی بیڈ کو کراس کرتا ہوا ڈیکو پینٹ سے بنے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی فریحہ کے پاس پہنچا تو دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں۔ مگر جلد ہی فریحہ کی نظریں جھک گئیں۔

''مجھے بتاؤ بات کیسے شروع ہوئی تھی؟'' گو کہ اس کا انداز دھیما ہی تھا مگر تلخی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ ''اب تم ہی بتاؤ...... میں کیسے اُنہیں سمجھاؤں کہ میں......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر دانیال کی طرف دیکھنے لگی۔

''بات پوری کرو فریحہ! تم جانتی ہو کہ ادھوری بات اور نامکمل شخصیت مجھے ان دونوں چیزوں سے سخت نفرت ہے۔'' بات دھیمی تھی مگر لہجہ تلخ ہونے لگا تھا۔

''میں اور مما ابورشن کروانا چاہتے ہیں۔'' فریحہ کی زبان سے بم نکل کر سیدھا دانیال کے سینے پر لگا اور دل کے چیتھڑے اڑا گیا۔ وہ لرز کر رہ گیا وہ حیرانگی اور سکتے کی کیفیت میں فریحہ کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کیا کہے یا پھر فریحہ نے کیا کہا ہے۔ اس کا سکتہ ٹوٹا تو وہ فریحہ کو کندھوں سے پکڑتا ہوا اس کا چہرہ اپنی طرف کرتا ہوا بولا۔

''میں باپ بنا مجھے علم ہی نہیں ہوا۔ اور تم ماں بن کر اپنی کوکھ سونی کرنا چاہتی ہو۔؟'' اس کے لہجے سے دُکھ عیاں تھا۔

''کم آن دانی...... پلیز'' وہ مفاہمت بھرے انداز میں بولی۔ ''میں ابھی سے اس جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتی۔'' وہ اپنا رُخ دوسری طرف موڑ کر بولی۔ ''ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ میری عمر کی لڑکیاں تو ابھی سٹوڈنٹس ہیں اور اپنی لائف انجوائے کر رہی ہیں...... اور تم چاہتے ہو کہ میں بچے پالوں اُن کو فیڈ کروں...... کم آن واٹ پورنس''؟

''کیا کبھی ان کے بارے میں بھی سوچا ہے کہ جن کی شادی کو دس دس سال ہو گئے ہیں اور

ان کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا۔'' وہ اُسے سمجھانے والے انداز میں بولا تھا مگر لہجے کی تلخی کو چھپا نہ سکا۔

''وہ درباروں اور درگاہوں پر جا جا کر اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندوں سے دُعا کرنے کا کہتے ہیں کہ اللہ ان کی دُعاؤں سے اولاد کی خوشیوں سے جھولی بھر دے۔ اور ایک تم ہو کہ...... اس کی نعمت کی ناشکری کر رہی ہو۔''

''کچھ بھی ہے دانیال......'' وہ ہاتھ کھڑا کر کے بولی۔ ''میں اس بچے کو ابھی جنم نہیں دونگی...... ابھی کیا...... پانچ چھ سال میں اپنی زندگی انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی مرضی سے جینا چاہتی ہوں۔ میں ابھی سے اولاد کی مرضی کی قیدی نہیں بننا چاہتی۔'' وہ اٹل لہجہ میں بولی تو دانیال کی تیوری چڑھ گئی۔ وہ غصے میں پھنکارنے لگا۔

''مجھے یہ بچہ چاہیئے۔'' اس کا لہجہ بھی اٹل تھا۔

''مگر مجھے نہیں چاہیئے۔''

''یہ تمہارا یا تمہاری مما کا فیصلہ ہے؟''

''میں اپنے فیصلے خود کرتی ہوں۔''

''مگر اب تم میری ملکیت ہو۔ میری بیوی ہو۔''

''کیا مجھے خرید کر لائے ہو؟'' تلخی اور تیز و تند فقروں کے تبادلے نے گھر کے دوسرے افراد پر بھی ان کی رنجش عیاں کر دی تھی۔

''میاں بیوی ایک دوسرے کی ملکیت ہی ہوتے ہیں۔ جس پر کوئی تیسرا حق دعویٰ نہیں کر سکتا۔''

''تو پھر میری مرضی ہے کہ میں اپنی زندگی جیسے چاہوں گزاروں اور تم اپنی زندگی جیسے چاہو گزارو۔'' فریحہ کے چیخ و چیخ کر بولنے سے دانیال کی مما' پپا اور سسٹر بھی ان کے کمرے میں آ گئے۔

''کیا ہو رہا ہے یہ سب۔'' وقار عظیم کی پروقار آواز گونجی۔ ''دانیال...... اس طرح بات کرتے ہیں بہو سے؟'' انہوں نے دانیال کو ڈانٹا تو وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مسز وقار بول پڑیں۔

''اس میں دانیال کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' فریحہ نے جل بھن کر ساس کی طرف دیکھا اور زبان پر قابو نہ رکھ سکی۔

''سارا قصور آپ کا ہے۔''

''فریحہ! مائینڈ یور لینگویج...... شی از مائی مدر۔'' دانیال کا پارہ ہائی ہوگیا۔ وقار عظیم کو ساری بات کا پتہ نہ تھا اس لیے وہ ابھی تک شش و پنج میں ہی مبتلا تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ ان کے ذہن میں اُلجھنے والی گتھی فریحہ کی بدزبانی نے سلجھادی۔

''میں جانتی ہوں کہ یہ تمہاری ماں ہیں اور میری ساس...... مگر یہ اپنے بیٹے کے گھر کو کیوں اجاڑنا چاہتی ہیں؟''

''فریحہ!...... بیٹی یہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟'' وقار عظیم کی حیرت دوچند ہوگئی تھی۔

''میں نے آپ سے علیحدگی میں راز رکھنے کو کہا تھا مگر آپ نے اپنے بیٹے کے کان بھر دیئے کہ میں اس کا بچہ گرانا چاہتی ہوں۔'' وہ براہِ راست ساس سے مخاطب تھی وقار عظیم پر ایک اور بجلی گری تھی۔ ''میں ابھی سے بچوں کے جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتی...... میں کل مُما کے ساتھ جا رہی ہوں کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس...... ابارشن کروانے...... کسی کی جرأت ہے تو مجھے روک لے۔'' وہ پاؤں پٹختی ہوئی بولی۔

''اتنی بدتمیز اور ضدی ہو تم...... مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ اس گھمنڈ اور تکبر کو اپنے سر سے اتار دو۔ گھر بسانے کیلئے ماں کی ہدایتیں لینا چھوڑ دو۔'' دانیال اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

''اچھا!'' وہ تنک کر بولی۔ ''تمہاری ماں کی ہدایت پر عمل کروں اور اپنی زندگی ابھی سے اجیرن کر لوں......'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بکواس کرتی ایک زور دار تھپڑ نے کمرے کے تمام مکینوں کی ورطۂ حیرت میں مبتلا کر کے پتھر کے مجسموں میں تبدیل کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت اور دُکھ فریحہ کے چہرے اور آنکھوں سے عیاں تھا کیونکہ دانیال اور وہ ایک دوسرے سے کالج لائف میں ہی محبت کرتے تھے۔ وہ تصور نہ سکتی تھی کہ دانیال اتنی بڑی حرکت کر سکتا ہے۔ وقار عظیم آگے بڑھ کر دانیال کو بازو سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولے۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ زبان سے بات کرو ہر مسئلے کا حل گفتگو سے حاصل ہوتا ہے۔ ڈنڈے لاٹھی گولی اور تشدد سے نہیں۔'' دانیال کو بھی احساس ہو چکا تھا کہ اس نے فریحہ کو تھپڑ [illegible] غلطی کی ہے۔

''آئی ایم سوری پاپا!'' وہ بے دلی سے بولا۔

''فریحہ سے سوری بولو۔'' وہ باپ کے حکم پر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ''دانی!...... میں نے جو

کہا وہ سنا نہیں کیا۔؟'' وقار عظیم کی گونجدار آواز نے دانیال کو مجبور کر دیا کہ وہ فریحہ سے اس زیادتی کی معذرت کرے۔

''سوری فریحہ!''

''تم نے اچھا نہیں کیا دانی اس تھپڑ کا خمیازہ تمہارے سارے خاندان کو بھگتنا پڑے گا...... میں کسی غریب اور لاچار خاندان کی مجبور بیٹی نہیں ہوں جو تمہارے اور تمہاری ماں کے ظلم سہہ کر بھی خاموش رہوں...... یہ تھپڑ تم لوگوں کو بہت مہنگا پڑے گا۔'' وہ منہ سے آگ برسانے لگی تھی۔

دانیال نے بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا اس کا انداز ایسا تھا کہ اگر اب فریحہ نے کوئی بکواس کی تو وہ اس کے دانت توڑ دے گا مگر وقار عظیم معاملہ فہم اور باشعور انسان تھے اُنہوں نے دانیال کو اپنے ساتھ کمرے سے باہر بلوایا۔ ان کے ساتھ ہی سبھی لوگ بھی فریحہ کو کمرے میں اکیلا چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ فی الحال وقار عظیم کی معاملہ فہمی نے معاملہ ختم کر دیا تھا مگر فریحہ نے احتل کو فون کر دیا تھا وہ چند منٹوں بعد توپ کے گولے کی طرح دندناتی ہوئی وقار عظیم کے گھر پہنچ گئی۔

''آپ لوگوں کی جرات کیسے ہوئی کہ میری پھول سی بچی پر ہاتھ اُٹھاؤ'' وہ آتے ہی مسز وقار پر دھاڑی تو سبھی اُسے دیکھ کر حیران رہ گئے کیونکہ اس کا لباس انسانیت کو شرمندہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ وقار عظیم کی نظریں جھک گئیں۔ ہُما جو کہ وقار عظیم کی کنواری بیٹی تھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ زبیدہ خاتون جو کہ مسز وقار عظیم تھیں وہ دِل ہی دِل میں چھپی چھپی کرنے لگیں۔

''آپ تشریف رکھیئے!'' زبیدہ خاتون نے بات کو سلجھانے والا لہجہ اختیار کیا۔ ''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم نے فریحہ کو نہیں مارا بلکہ ان کا میاں بیوی کا آپسی معاملہ ہے۔'' مگر احتل پر دولت کا غرور سوار تھا وہ دھاڑنے لگی۔ ''میاں بیوی کے آپسی معاملات میں ساس سُسر اور نند کا کردار نہیں ہوتا۔''

''آپ بیٹھ کر بات تو سُنیں...... فریحہ کی غلطی ہے...... میں اُسے سمجھا رہا تھا مگر......'' احتل نے دانیال کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

''میری بیٹی جھوٹ نہیں بولتی...... وہ فریحہ کو آوازیں دینے لگی فریحہ بھی اس کی آواز کی منتظر تھی جو فوراً بڑے سے اٹیچی کیس کے ساتھ اپنے کمرے سے نکلی تو سب کی حیرت میں اضافہ ہوگیا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ فریحہ بات کو اتنا بڑھا دے گی کہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔

''چلو فریحہ!'' احتل سخت لہجے میں بولی تو فریحہ نے ایک نظر سب پر ڈالی اور احتل کی طرف

بڑھ گئی۔ وقار عظیم اور زبیدہ خاتون نے آگے بڑھ کر اُسے روکنے اور سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ احتل کے ساتھ سب کی التجا کو رد کرتی ہوئی باہر کی جانب بڑھ گئی۔ دانیال کو دھچکا لگا تھا فریحہ نے اس کے والدین کی بات نہ مانی تھی وہ اپنی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے فریحہ کو پکارا۔ ''ٹھہرو فریحہ!'' فریحہ کے چلتے ہوئے قدم رک گئے اور دانیال اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''خود اس دہلیز سے قدم باہر نکال رہی ہو مگر جب دوبارہ آنا چاہو گی تو خود ہی آنا پڑے گا......مگر اکیلے نہیں.....میرے بچے کے ساتھ!'' احتل خونخوار نظروں سے دانیال کی طرف دیکھنے لگی اس کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی۔

''اس بچے کا ہی تو سارا کیا دھرا ہے...... یہ ابارشن کروائے گی تو تمہیں فون کر دے گی...... خود ہی آ کر لے جانا...... یہ کسی ایرے غیرے کی بیٹی نہیں ہے...... یہ احتل کی بیٹی ہے۔''

''تمہارا کیا جواب ہے فریحہ!'' دانیال کی سوگوار آواز سن کر فریحہ نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

''ابارشن!'' مختصر سے جواب نے دانیال کے ہاتھوں کی مُٹھیاں بھینچ دیں اس نے بمشکل خود پر قابو پایا اور کرب سے فریحہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں فریحہ!'' مسٹر و مسز وقار عظیم بیٹے کا دُکھ جان کر افسردہ ہو رہے تھے۔ ''اور تا حیات کرتا رہوں گا...... مگر افسوس اس بات کا رہے گا کہ تم محبت کرنے والی اچھی لڑکی تو ہو...... مگر شوہر پرست بیوی نہیں ہو...... بالکل ویسے ہی...... جیسے......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر غصے سے احتل کی طرف دیکھا اس کا دیکھنا ہی فقرے کو مکمل کر گیا تھا احتل جل کر کباب ہو گئی تھی اس نے فریحہ کی بانہہ پکڑی اور اپنے ساتھ لیتی ہوئی اس گھر سے نکل گئی۔

''اُن لوگوں کی جرات کیسے ہوئی کہ میری بیٹی کو تھپڑ ماریں۔'' وہ غصے میں تلملاتی ہوئی اپنے گھر میں داخل ہوئی تو اختر علی اس کی پھنکار سن کر چونک پڑا۔ وہ کوئی بزنس کاغذات دیکھنے میں مصروف تھا اس نے احتل کے ساتھ فریحہ کو بڑے سے اٹیچی کیس کے ساتھ دیکھا تو معاملہ اُسے خراب لگا اوپر سے احتل کا پھنکارنا بھی بتا رہا تھا کہ معاملہ نہ صرف خراب ہے بلکہ کافی گڑبڑ بھی ہے۔

''تم جاؤ اپنے کمرے میں...... میں ان سے نپٹ لوں گی۔'' احتل نے فریحہ کو کہا جو باپ کی پرواہ کیے بغیر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ ''پھوں پھوں'' کرتی ہوئی اختر علی کے پاس آ

کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ سردی کا موسم نہ ہوتا تو وہ یقینی طور پر دو تین گلاس پانی چڑھا چکی ہوتی چند ساعتیں اختر علی اپنے کام میں مصروف رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ احتل خود ہی بات کرے۔ کیونکہ وہ اس کے مزاج کو سمجھتا تھا اگر وہ خود پوچھ لیتا تو پھر غبار اس پر ہی نکلنا تھا اس کا صبر رنگ لایا اور احتل کی پھنکار پر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تمہیں پتہ ہے کیا کیا ہے ان لوگوں نے۔'' اختر علی انجان بنا کر بولا ''کن لوگوں نے؟''

''تمہارے سمدھی وقار عظیم نے اور کن لوگوں نے؟'' احتل مزید گرم ہو گئی تھی۔

''کیا کیا ہے؟'' وہ بدستور دھیما لہجہ اختیار کیئے ہوئے تھا۔

''اُنہوں نے تھپڑ مارے ہیں ہماری فریحہ کو۔'' احتل نے ایک تھپڑ کو جمع کر کے کہانی میں سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر اختر علی کچھ خاص متاثر نہ ہوا۔

''کیوں تھپڑ مارے ہیں؟''

''بس یونہی...... بے جا پابندیاں اور کیا؟'' وہ ناک بھوں چڑھا کر بولی اُسے اختر علی کا اہم معاملہ میں انجان بنا رہنا ذرا نہ بھایا تھا۔ وہ پھر اسی انداز میں بولا۔

''کوئی جان بوجھ کر تو نہیں مارتا۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے فریحہ کی کوئی غلطی ہے؟'' وہ تنک کر بولی۔

''غلطی تسلیم کرنا دوسروں کی جیت پر خوشی منانے کے مترادف ہوتا ہے۔''

''دیکھو اختر علی!'' وہ فیصلہ کن لہجہ اختیار کرتی ہوئی بولی۔ ''اب فریحہ اس گھر میں جائیگی تو ایک شرط پر...... وہ تمام خاندان آ کر مجھ سے اور فریحہ سے معافی مانگے......بس...... انف از انف۔''

''معاملہ تو ان دونوں میاں بیوی کا ہو گا......تم......کیوں؟''

''اُنہوں نے میرے ساتھ بھی بہت بدتمیزی کی ہے...... یہ میری انا کا مسئلہ ہے۔'' اختر علی اس کی بات سن کر کھڑا ہو گیا۔ ''تمہاری اناء نے احمد کا گھر بسنے سے پہلے ہی اجاڑ دیا ہے۔'' اتنا کہنا تھا کہ احتل آسمانی بجلی کی طرح چمک پڑی۔

''اختر علی!......تم میری توہین کر رہے ہو......اب اس بات کا بدلہ میں تمہیں احمد کی شادی اپنی سی جگہ پر کر کے ہی چکاؤں گی۔'' اختر علی کا قہقہہ بلند ہو گیا۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"احمد اب تمہاری مرضی سے کبھی شادی نہیں کرے گا...... رہ گئی بات فریحہ کی تو وہ ابھی غصے میں ہوگی...... دو چار دن دانیال سے دُور رہے گی تو خود ہی چلی جائے گی...... آخر وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت بھی تو کرتے ہیں۔ اور ابھی شادی کو دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔"

"احمد میری مرضی سے شادی بھی کرائیگا اور فریحہ بھی میرے حکم کی تکمیل کرے گی...... تم دیکھنا اختر علی۔ میں اپنے بچوں کی زندگی پرسکون بنادوں گی۔" وہ بھی اُٹھ کر اختر علی کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔

"دِل دو بار خاص طور پر ایسے ٹوٹتا ہے کہ اس کی آواز نہیں ہوتی مگر اس کا شور اتنا ہوتا ہے کہ کرچیاں بکھرنے کی صدا کانوں کو زخمی اور روح کو گھائل کر دیتی ہیں۔" وہ اپنے کاغذ سمیٹتے ہوئے بولا۔ "ایک بار تو تب...... جب کسی کو چاہا جائے اور وہ پرایا ہو جائے...... اور دوسری بار تب...... جب جو کچھ سوچا جائے مگر ویسا نہ ہو...... یہ دو نقصان انسان کو بلندی سے پستی تک لیجاتے ہیں...... اور میرا مشورہ مانو اجلال بیگم...... بچوں کو اپنے فیصلے خود کرنے دو...... تا کہ ان کی نظروں میں تمہاری ماں اور رشتے کی بلندی قائم رہ سکے...... اپنے غلط اور من پسند فیصلے بچوں پر ٹھونس کر پستی کی طرف مت جاؤ اجلال بیگم!" اس بات نے اجلال بیگم کی آنکھیں کھول دی تھیں وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اختر علی کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"مائی فُٹ" وہ پاؤں زمین پر پٹختی ہوئی بولی اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

کلیم اللہ گھر لوٹ آیا تھا مگر کسی نے بھی اس کے ساتھ کوئی بات نہ کی تھی پرساد چوپڑہ گھر میں موجود نہ تھا موہن اور پوجا بھابی نے اُسے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنی باتیں جاری رکھیں۔ مہارانی نے بھی منہ پھیر لیا تھا وہ کاجل اور کنگنا کی طرف دیکھتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ مسلمان ہونے کے بعد یہ اس کی پہلی نماز کی اذان تھی وہ اذان کے الفاظ اور موذن کے پرگداز لہجے میں کھو گیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ان الفاظ کے سحر میں کھو کر باقی تمام زندگی گزارنا چاہتا ہے۔

"اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدُ رَسُوْلَ اللّٰه"۔ "میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔" کلیم اللہ کے ہونٹ متحرک ہو گئے۔ اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہونا شروع ہو گئی تھی۔ پروفیسر فائز احمد نے اُسے بتایا تھا کہ دین اسلام میں داخل ہونے کی پہلی شرط عشق ہے۔ اللہ کی اطاعت

اور رسول اللہ کی اطاعت کے بغیر اسلام مکمل نہیں ہوتا۔ اُس نے قرآن کریم اور دوسری کتب میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ اقدس کے متعلق تفصیلی مطالعہ کیا تھا وہ سمجھ گیا تھا کہ اذان میں، نماز میں، قرآن میں، کلمہ میں، حج اور زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اطہر و مطہر کو یونہی نہیں رکھا گیا۔ بلکہ وہ وجۂ تخلیقِ کائنات ہیں۔ اس کائنات کے تمام رنگ ان کے حُسن کی زکوٰۃ سے چمکتے ہیں۔ چاند کی چاندنی، سورج کی کرنیں، تاروں کی ضیاء اور کائنات کے ہر ذرے سے پھوٹنے والا نور حضور نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ مقدس کے حسن کا محتاج ہے۔

اللہ رب العزت کو عشق ہوا تو اس نے اپنے نور سے ایک نور پیدا فرمایا جسے نورانی نور کے دادا عبدالمطلب نے "محمدؐ" کا نام دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس نور کو بشری لبادہ اوڑھا کر اس کائنات کو تخلیق کرنے کی وجہ پیدا فرمائی۔ رب کریم خود کو دیکھنا چاہتا تھا اس نے اسی عشق کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب کر اپنے سراپا نور سے محمد مصطفیٰؐ کا نور پیدا فرمایا۔ اور شرط بھی رکھ دی کہ اسلام میں داخل ہونے والو اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے پہلے رکن کلمہ طیبہ کا ورد کر کے اسلام میں داخل ہو جاؤ مگر پورا کلمہ پڑھنے سے پہلے اس کا پہلا حصہ پڑھ کر اپنے دِل و دماغ کو ہر قسم کے فتور اور زبان کو ہر قسم کی غلاظت سے پاک کرلو۔ اس کے بعد کلمہ کا دوسرا حصہ پڑھو تا کہ میرے محبوب کا نام تمہاری پاک زبان پر آئے اور تمہارے دِل و دماغ روشن ہو جائے اور تم گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکنے کی بجائے شمع رسالت کی روشنی میں اپنے اللہ اور اس کے احکامات کو پہچانو۔ بس اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔

کلیم اللہ نے اذان سُن کر وضو کیا اور اپنے کمرے میں جاء نماز نہ پا کر اُسے افسوس تو ہوا مگر قالین پر ہی اس نے منہ کعبہ شریف کی طرف کیا اور "اللہ اکبر" کہہ کر دونوں ہاتھ باندھ لیئے۔ اس کی متحرک زبان رب تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنے لگی۔ اُس کے منتشر ذہن کو سکون ملنے لگا۔ دِل و دماغ کی دُنیا روشن ہو گئی اُسے اپنے گرد نور کا ہالہ محسوس ہونے لگا۔

وہ زندگی میں پہلی بار ایک ان دیکھے خدا کے سامنے احترام اور خضوع کے ساتھ کھڑا تھا دِل سے نورانی غبار نکل کر آنکھوں کی طرف بڑھنے لگا۔ سورت فاتحہ کے بعد سورت اخلاص پڑھنے کے بعد وہ جیسے ہی اللہ کی کبریائی بیان کرتا ہوا رکوع میں گیا تو آنکھوں کا دریا رواں ہو گا وہ جھک گیا تھا اس خدا کے سامنے جس کو اس نے اور کسی نے بھی نہ دیکھا تھا مگر احساس کی زندگی اور شعور نے

اُسے محسوس کیا تھا ہر لمحہ ہر پل اپنے اردگرد اپنے آس پاس۔ کائنات کے ہر ذرّے سے دیکھنے والے خدا کو اس نے ہمیشہ اپنے ساتھ محسوس کیا تھا۔

پہلا سجدہ اس کی زندگی بدل گیا تھا وہ جیسے ہی سجدہ میں گرا بس پھر دل اور آنکھوں کی دُنیا بدل گئی۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا مصمم ارادہ اور دِل کی سچائی کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی حرمت و پاکیزگی پر اپنی جان قربان کرنے کی ادا پسند آ گئی تھی۔ اس کی رحمت جوش میں آئی کہ کلیم اللہ کو اس نے سجدہ میں ہی اپنے مقدس گھر کی زیارت سے فیض یابی بخش دی۔ اس نے جس خانۂ خدا کو کبھی دیکھنے کی آرزو کی تھی رب کریم نے اس کو پہلے ہی سجدہ میں اس کی مقدس زیارت سے نواز دیا تھا۔ نورانی نور دیکھ کر کلیم اللہ کی گھگھی بندھ گئی۔ آنکھوں کے دریا کی روانی کو عروج ملنے لگا۔ دِل کی ویرانی کو سکون اور دماغ کو روشنی ملنے لگی۔

اللہ کی پاک ذات نے اس کو اس کی سوچ اور توقع سے زیادہ نواز دیا تھا۔ اِس پاک ذات کا فرمان تھا کہ "جو شخص راہِ ہدایت پر چلے گا اس کیلئے دنیا میں کوئی ڈر ہے نہ آخرت میں۔" کلیم اللہ کی زبان سے سبحان ربی الاعلیٰ کا ورد جاری تھا وہ دوسرے سجدہ کیلئے اُٹھنا بھول گیا تھا اس کا ذہن اور دِل آنکھوں کے رستے خانہ کعبہ کی زیارت سے فرحت اور سکون محسوس کر رہا تھا۔

"میرے اللہ پاک ہے تیری ذات جس نے مجھے اس سجدہ کی توفیق دی۔" اس کی زبان سے اللہ کا نام جاری ہونے کی دیر تھی کہ رحمتِ خداوندی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا نورانی سمندر اس کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا اُسے یہ خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں ہے وہ اس کیفیت سے بالکل بے نیاز تھا کہ وہ اپنے گھر میں ہے اور اس کا باپ بلکہ تمام خاندان اس کو زہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔

"موہن!" پرساد چوپڑہ کی زہریلی آواز گونجی تو موہن چونک کر آگے بڑھا۔ "پتہ کرو کہ میرے خاندان پر کس نے شب خون مارنے کی جرات کی ہے؟" موہن باہر نکل گیا تو پرساد چوپڑہ بجلی بنا ہوا آگے بڑھا اور سجدے میں گرے ہوئے کلیم اللہ کو اپنے قیمتی بوٹوں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اس کے سجدوں کی محویت ٹوٹ گئی مگر دِل ابھی تک نظارۂ رحمت میں کھویا ہوا تھا۔ گھر کے دوسرے افراد کی چیخیں نکل گئیں مگر کلیم اللہ کی زبان سے "سی" کی آواز نہ نکلی وہ اپنے ہندو باپ کی مار بڑے صبر اور تحمل سے کھا رہا تھے۔

"حرامزادے! اس دن کیلئے میں نے تجھے جنم دیا تھا..... میری ناک کٹوا دی ہے تم نے۔ برادری اور خاندان میں میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا..... باز آ جا..... ورنہ کتے کی طرح

زندگی گزارنی پڑے گی۔" چوپڑہ کے منہ سے مغلظات کی بارش ہو رہی تھی وہ کلیم اللہ کو پیٹتا بھی جا رہا تھا اور گالیاں بھی بک رہا تھا۔ "کیا کہوں گا میں اپنے ملنے جُلنے والوں سے۔ خاندان کے بڑوں کو کیا جواب دوں گا....." اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا وہ اب مہارانی کی طرف مڑا اور لال آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"سمجھا اس حرامی پلّے کو..... اِسے اپنی کوکھ اور دودھ کا واسطہ دے۔ اُسے بھگوان کی قسمیں یاد دلا۔ اسے بتا کہ نہ دکھنے والا کوئی بھگوان نہیں ہوتا۔ کوئی اللہ نہیں ہے۔ کوئی خدا نہیں ہے۔ یہ سب غلط ہے۔ کفر ہے..... اسے شام تک سمجھا لے مہارانی ورنہ میں اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر چیل کوؤں کو کھلا دوں گا۔" وہ دوبارہ کلیم اللہ کی طرف مڑا تو وہ باہوش اور تندرست ذہن کے ساتھ کھڑا تھا۔

"دیکھو کندن!" مگر چوپڑہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

"میرا نام کلیم اللہ ہے۔" مگر دوسرے ہی لمحہ اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش شروع ہو گئی۔ چوپڑہ منہ سے ہذیان بکنے لگا۔ "میں سمجھا تھا کہ تُو یونہی سجدے میں گرا ہوا ہے..... تمہارے عمل نے مجھے شک میں مبتلا کر دیا تھا اور اب تمہارے نئے نام نے میری نفرت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے..... باز آ جاؤ کندن..... ورنہ میرا انتقام..... اتنا بھیانک ہوگا کہ تمہارا اللہ بھی تمہیں نہیں بچا سکے گا۔" کلیم اللہ کے پھٹے ہوئے ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی جو چوپڑہ خاندان کے لیئے زہر قاتل تھی۔

"جو شخص قربانی اور ایثار کا مظاہرہ کرتا ہے وہ مر کر بھی زندہ رہتا ہے..... آپ کا ظلم و تشدد مجھے موت تو دے سکتا ہے۔ مگر میرے مضبوط ارادے کو ٹس سے مس نہیں کر سکتا..... چوپڑہ صاحب! میرا اللہ ہر جگہ موجود ہے..... تمہارے دل میں بھی اور پتھر کی اس مورتی میں بھی جسے تم پوجتے ہو..... وہ پتھر تمہیں کچھ نہیں دیتا..... اگر دیتا ہے تو میرا اللہ..... بس....." کلیم اللہ نے پہلی بار باپ کو نام لے کر للکارا تھا اور اس کے بھگوان کو الفاظ کو پیرہن اوڑھا کر غلط اور جھوٹا کہا تھا۔ اس بات نے پرساد چوپڑہ کو آگ بگولا کر دیا تھا۔ وہ کلیم اللہ کی باتیں سن کر لرزنے لگا تھا مگر خود پر قابو رکھنے میں ہی اس کی بھلائی تھی کیونکہ کلیم اللہ رب واحد کے احکامات کی پیروی کرتا ہوا ساتھ ساتھ تبلیغ بھی کر رہا تھا۔

"کتنا تشدد سہہ سکتے ہو۔ کُندن؟" پرساد چوپڑہ یکدم لائن پر آ گیا۔ وہ اس کی آنکھوں

میں دیکھتا ہوا بولا۔

''جتنے نام میرے اللہ کے ہیں۔ جتنے سپارے قرآن کریم کے اور ان کے تمام الفاظ اور پھر میرے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جتنے نام اور ان کے حروف ہیں۔ دُنیا میں جتنی مساجد ہیں ان کے جتنے مینار ہیں اور پھر مسجد نبویؐ کے جتنے دروازے ہیں غرض کہ اسلام کی خاطر اُتنے زخم سہہ سکتا ہوں کہ تمہاری گنتی ختم ہو جائیگی۔'' کلیم اللہ کا جواب کیا تھا اسلام کے متعلق اس نے اپنی معلومات کا ذخیرہ پرساد چوپڑہ کے کانوں میں انڈیل دیا تھا۔

''کیا ملے گا تمہیں؟ روپیہ۔ روپیہ۔ گاڑی بینک بیلنس؟'' چوپڑہ کی بھنویں چڑھ گئی تھیں۔

''نہیں کچھ بھی نہیں ملے گا تمہیں بلکہ ان سب چیزوں سے محروم ہو جاؤ گے۔ بھوکے ننگے بن کر جب گلیوں میں بھیک مانگو گے تو پیٹ کے دوزخ کو بھرنا مشکل ہو جائے گا۔'' الفاظ میں سے آگ برس رہی تھی۔ مگر کلیم اللہ کا قہقہہ ان پر مزید آگ برسا گیا۔

''مجھے یہ سب چاہیئے بھی نہیں...... یہ دھن دولت میرے کسی کام کے نہیں ہیں۔ جو کچھ میری آنکھ نے دیکھ لیا ہے۔ دِل اور دماغ نے محسوس کر لیا ہے اگر وہ سب تم لوگ دیکھو تو قسم میرے پاک اللہ کی اس دُنیا میں دولت کو ٹھوکر مار دو۔ اور اسی پاک ذات کے در پر جھکنے کو ترجیح دو۔''

''اس کا کمرہ کوئی نہیں کھولے گا۔ کوئی بھی اس سے ربط نہیں گا۔ اسے بھوکا پیاسا رہنے دو۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کا اللہ اسے کھانا کہاں سے پہنچاتا ہے؟'' پرساد چوپڑہ منہ سے آگ برساتا ہوا اہل خاندان سے مخاطب ہوا اور سب کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی نگرانی میں اس کمرے کو تالہ لگوا دیا۔

''میرے اللہ! مجھے اُن راہوں پر چلنے کی توفیق فرما جو تیرے پیارے محبوب مصطفیٰ ﷺ کی بتائی ہوئی سیدھی اور سچی راہیں ہیں۔'' اس نے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا اور نظر کمرے کی چھت سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ مگر اس کے دِل کو اس بات کا سکون تھا کہ فریاد وحدہ لاشریک کی بارگاہ میں پہنچ گئی ہے۔

کلیم اللہ کا ایمان اور اعتقاد پختہ سے پختہ ہوتا جا رہا تھا وہ ان راہوں کا مسافر بن گیا تھا جن پر چل کر چور ولی اور قطب بن جاتے ہیں۔ وہ کوئی چور نہ تھا نہ ہی اس نے کسی کے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا اس نے دینِ اسلام کا بغور مطالعہ کیا تھا بس دِل نے اسلام کو قبول کر لیا تھا روح نے سمجھ لیا تھا اب واپسی ناممکن ہے۔

☆☆☆

ابراہیم اور عائشہ بی بی کو جگنو کی بدلی ہوئی کیفیت پر تشویش ہوئی تھی وہ اب نہ ہنستا تھا نہ بولتا تھا بس خاموشی سے گھر کے ایک کونے میں پڑا رہتا تھا عائشہ بی بی اُسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا دیتیں تو کھا لیتا ورنہ مانگتا نہ تھا۔ ابراہیم دن بھر کا تھکا ماندہ شام کو گھر لوٹتا تو جگنو حسب معمول باتیں کر کے اس کے کان نہ کھاتا تھا۔ آمنہ کی رخصتی کے بعد اس گھر میں خاموشی کا راج ہو گیا تھا مگر آج ابراہیم نے جگنو سے بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔

وہ کمبل اوڑھ کر لیٹا ہوا تھا اور چھت کو گھورے جا رہا تھا ابراہیم اپنی چارپائی چھوڑ کر اس کی چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا اور جگنو کا آدھا کمبل اپنے بدن پر اوڑھتا ہوا بولا۔

''میں تو آج اپنے بیٹے جگنو کے ساتھ ہی سوؤں گا۔'' مگر جگنو نے کوئی بھی بات کرنے کی بجائے تھوڑی سی جگہ اس کیلئے خالی کر دی ان دونوں کو الجھیا ہوا تو عائشہ بی بی بولیں۔

''پتر! کوئی بات کیوں نہیں کرتے...... اس گھر میں کتنی خاموشی ہے۔ یہ گھر ایسے تو اچھا نہیں لگتا...... بولو چہکو اور قہقہے لگاؤ...... کیا بات ہے؟ مجھے نہیں بتاؤ گے...... میں تمہاری ماں ہوں۔'' ان کی آواز بھرا گئی تو جگنو ان کی طرف غور سے دیکھنے لگا اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے دو آنسو نکل کر گالوں پر لڑھک گئے تو ابراہیم نے اُسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

''میں نے مدینہ جانا ہے اماں جی!'' جگنو کی پرسوز آواز نے کمرے میں ارتعاش تو پیدا کیا ہی تھا ان دونوں کو بھی لرزا دیا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جگنو نے آج سے پہلے کبھی بھی اتنی سنجیدگی سے مدینہ شریف کا ذکر نہ کیا تھا اب اس کے آنسو تھمنے کا نام نہ لے رہے تھے وہ ہچکیاں نہ لے رہا تھا مگر دِل کی آواز آنسوؤں کے نمکین پانی کی صورت میں باہر نکل آئی تھی۔

''تم دُعا کرو ہم سب جائیں گے۔'' ابراہیم نے اُسے تسلی دی تو وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیسے؟ سُنا ہے بہت سارا روپیہ لگتا ہے۔'' جگنو نے آج تک روپے پیسے کو کبھی بھی اہمیت نہ دی تھی مگر آج اُسے شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ مدینہ جانے کے لیئے بہت سارا روپیہ بہت ضروری ہے۔ ''اتنا روپیہ ہم کہاں سے لائیں گے...... ہم کوئی امیر نہیں؟'' اس کے لہجے کی یاسیت نے ابراہیم کو بھی اندر سے ہلا دیا تھا وہ عائشہ بی بی کی طرف دیکھنے لگا مگر وہ شوہر سے آنکھ نہ ملا

سکیں۔

''اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے ہم گناہگار لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔تم نے مدینے جانا ہے نا،تو اس کی رحمت سے مایوس کیوں ہوتا ہے اُس کی رحمت کو پکار اور مدینے والے آقا کا وسیلہ دیکر دُعا مانگ...... وہ خود سنے گا۔مدینے جانے کیلئے روپوں کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ تاجدار مدینہ دِل کا حال جانتے ہوئے ٹکٹ پر مہر لگاتے ہیں۔وہ جب اپنے عاشق کی قسمت پر مہر لگاتے ہیں تو پھر روپوں کا بندوبست بھی خود ہی ہو جاتا ہے۔'' عائشہ بی بی سمجھ گئیں کہ ابراہیم جگنو کو اچھے الفاظ میں سمجھا رہا ہے۔اور جگنو کا اثبات میں سر ہلانا اس بات کی علامت تھی کہ وہ باپ کی باتوں کو نہ صرف سن رہا ہے بلکہ سمجھ بھی رہا ہے۔

''میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔تاجدار مدینہ سرور قلب وسینہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے یتیم پیدا فرمایا تھا کہ وہ یتیموں کے والی بنیں۔اللہ تعالیٰ نے اُنہیں غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرنے کیلئے پیدا فرمایا ہے وہ اللہ کے حکم سے اپنے عاشق کو ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے بھی پہچانتے ہیں اور ان کے حال بھی جانتے ہیں۔تم عشق میں پڑو گے تو وہ تمہیں خود ہی بلائیں گے روپیہ پیسہ ہماری نہیں بلکہ سرکار کی مہربانی سے کسی ایسے انسان کی ذمہ داری ہے جسے سرکار بہتر جانتے ہیں تم دیکھنا تمہارا مدینہ جانا تمہارے لیئے مشکل نہ ہوگا۔بس اللہ مسبب الاسباب ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی بندوبست فرمادے گا۔تم دِل چھوٹا مت کرو۔'' ابراہیم خاموش ہوا تو عائشہ بی بی مسکراتی ہوئی بولیں۔''چل اب اداسی ختم کر کے اس گھر کو اپنی ہنسی اور باتوں سے ایک بار پھر پہلے جیسا گھر بنادے۔'' جگنو مسکرانے لگا تو ان دونوں کی جان میں جان آئی۔

''ایک بات بتاؤں!'' جگنو عائشہ بی بی کی آواز سن کر ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔''میں کل آمنہ باجی کی طرف جارہی ہوں...... میرے ساتھ چلو گے؟'' جگنو خوش ہوگیا اور بولا۔

''میں نے پہلے شوچا تھا کہ میں آمنہ باجی کے گھر جاؤں گا بش اب فیشلہ ہوگیا میں آپ کے شاتھ نہیں جاؤں گا۔آپ کو میرے شاتھ جانا ہوگا تو تیار ہو جانا۔بش فیشلہ ہوگیا۔'' جگنو کی ہنسی لوٹ آئی تھی اس کا انداز ایسا تھا کہ کوئی گھر کا بڑا بوڑھا اپنا فیصلہ سنانے کے بعد اس پر نظرثانی نہیں کرے گا۔وہ دونوں ہی جگنو کے انداز پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''ٹھیک ہے ہم آپ کے ساتھ ہی جائیں گے نانا جی۔'' ابراہیم نے مسکراتے ہوئے کہا تو جگنو اس کی طرف دیکھتے ہوئے یکدم سنجیدہ ہوگیا۔''ابا جی ایک بات تو بتاؤ۔''

''پوچھو!'' ابراہیم اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ڈر گیا تھا اُسے یہ ڈر تھا کہ وہ دوبارہ نہ سنجیدہ طبع ہو جائے۔

''یہ عاشق کیا ہوتا ہے؟'' اس کے چہرے پر بظاہر معصومیت چھائی ہوئی تھی مگر اندر اس سوال کو پوچھنے کیلئے کافی دیر سے ہلچل مچی ہوئی تھی وہ رہ نہ سکا اور پوچھ ہی بیٹھا۔

''عاشق وہ ہوتا ہے جو کسی سے بہت زیادہ عشق کرتا ہو۔'' ابراہیم کو ایک بار پھر اُسے پٹڑی پر لانا تھا۔

''مگر میں تو اماں شے عشق کرتا ہوں پھر میں اللہ کے رسول کا عاشق کیشے ہوگیا؟'' بہت گہرا سوال تھا اور اس کا جواب بھی بہت گہرا ہی ہونا چاہیے تھا۔لہٰذا ابراہیم نے اپنے ذہن کی لائبریری کھولی اور بولا۔

''اللہ تعالیٰ نے ماں کے قدموں تلے جنت رکھی ہے اور فرمایا ہے جو اس جنت کا حقدار بننا چاہتا ہے وہ ماں کی دِل و جان سے قدر کرے۔اس کا حکم مانے اس کی خدمت کرے اس کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرے۔ممتا کی قدر کرے اس طرح کہ جس طرح ایک عاشق اپنے محبوب کی قدر کرتا ہے اس کے حکم پر اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔نیزے پر سر ہوتا ہے مگر تلاوت قرآن مجید سے عشق کی انتہا ہوتی ہے جس کسی چیز کو بہت زیادہ چاہا جائے سمجھو تو اس چیز کے عاشق ہو ماں کی ممتا سے عشق کرو گے تو جنت تمہاری ہوگی...... یہ میں نہیں کہتا بلکہ قرآن اور حدیث میں آیا ہے۔''

''تو پھر میں مدینہ کیشے جاؤں گا......؟'' اس کے دماغ کی گنڈی ابھی تک وہیں پر پھنسی ہوئی تھی۔

''تم میری بہت خدمت کرتے ہو نا۔اس لیئے میں اللہ سے دُعا کروں گی کہ میرے سوہنے اللہ میرا اچھا پُتر میری ممتا کا عاشق ہے تو اسے اپنی رحمت سے مدینہ دِکھادے۔'' عائشہ بی بی بولیں تو وہ جھٹ سے بول پڑا۔

''دِکھادے نہیں کہنا...... کہنا ہے بُلا لے۔'' اس کے ان الفاظ میں بہت تڑپ تھی جسے ان دونوں میاں بیوی نے بھی محسوس کرلیا تھا۔

''چل اب میرا پُتر سو جا! صبح میں نے منڈی بھی جانا ہے۔اور پھر دِن بھر ریڑھی کو دھکا بھی لگانا ہے۔'' ابراہیم نے اس کے منہ پر کمبل دیئے ہوئے کہا تو اس نے کمبل ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ابا جی! صُبح کو میں بھی آپ کے شاتھ جاؤں گا...... مجھے لگتا ہے آپ بڈھے ہوگئے ہو۔''

اس کا انداز بہت پیارا تھا ابراہیم اور عائشہ بی بی مسکرانے لگے۔

"تم کیا کرو گے؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

"آپ کیا کرتے ہو؟ آوازیں لگاتے ہو نا۔ میں بھی آوازیں لگاؤں گا۔ بھلا کیسے؟" وہ معصومیت سے بولا تو ابراہیم نے سر کے اشارے سے پوچھا۔ "کیسے؟"

"سبزی لے لو۔ سبزی والا جگنو آگیا ہے...... ہانڈی روٹی پکا لو...... تازہ سبزی والا آگیا ہے...... ایسے۔ اب سمجھ میں آیا یا نہیں؟" ابراہیم اس کو خوش رکھنا چاہتا تھا تائیدی انداز میں سر ہلاتا ہوا بولا۔

"ہاں...... بالکل...... میں بھی کہوں میری سبزی نہیں بکتی...... مجھے پتہ ہی نہیں کہ مجھے آواز ہی نہیں لگانی آتی......" اس نے جگنو کی طرف دیکھا جو کمبل منہ پر اوڑھے سو چکا تھا۔ ابراہیم نے عائشہ بی بی کی طرف دیکھا اور آہستگی سے اپنی چارپائی کی جانب بڑھ گیا۔

"یہ آج اس کو کیا ہو گیا عائشہ؟" ابراہیم کی پیشانی پر فکر کی لکیریں نمایاں تھیں۔

"یہ کئی دِنوں سے ایسے ہی خاموش تھا۔ اچھا ہوا کہ اس کے دِل کی بات معلوم ہو گئی۔"

"مگر مجھے لگتا ہے کہ یہ دینے والی بات کو بھولے گا یا چھوڑے گا نہیں۔"

"تم اسے صبح اپنے ساتھ لیجانا تاکہ اس کا دھیان ادھر ہی لگا رہے۔" عائشہ بی بی لیٹتی ہوئی بولیں تو ابراہیم بھی سر ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

ابراہیم کو بھی گاہکوں نے جگنو کے متعلق خصوصی طور پر پوچھا تھا کہ یہ آج جگنو کو کیا سوجھی مگر وہ خود ہی لوگوں کی باتوں کا جواب دیتا جاتا تھا۔ اس کی آواز ابراہیم سے زیادہ تیز اور اونچی تھی وہ اونچی آواز میں "ہوکے" لگا رہا تھا۔ گاہک جگنو کی آواز پر کھینچے چلے آ رہے تھے۔ اُنہوں نے محلّہ کی ایک گلی میں ریڑھی کھڑی کی ہوئی تھی جس سے گلی کا راستہ کم ہو گیا تھا۔ گزرنے والے مشکل سے گزر رہے تھے کیونکہ ابراہیم کو بہت زیادہ رش پڑ گیا تھا مگر جگنو ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر اپنی ہی دھن میں آوازیں لگا رہا تھا۔

معمول سے پہلے ہی اس کی تمام سبزی فروخت ہو چکی تھی اب خالی ریڑھی کو وہ تیزی سے دوڑا رہا تھا۔ اس کا معذور ہاتھ اور معذور پاؤں اس کی رفتار میں رکاوٹ نہیں ڈال رہے تھے بلکہ ابراہیم کو بھی تیز تیز قدم اُٹھا کر اور کبھی بھاگ کر اس کے ساتھ ملنا پڑ رہا تھا۔ ابراہیم نے اس کے

کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"جگنو پتر! آہستہ چلاؤ۔ تم بھی تھک جاؤ گے اور پھر اتنا رش ہے ہر طرف گاڑیاں، رکشے اور موٹر سائیکلیں آ جا رہی ہیں۔ اللہ نہ کرے کسی کے ساتھ ٹکرا نہ جانا۔" وہ مسکراتا ہوا بولا۔

"آپ بوڑھے ہو گئے ہو بس گھر بیٹھ کر آرام کرو...... اب جگنو شاحب ریڑھی لگایا کریں گے۔" جیسے ہی جگنو نے ایک موڑ تیزی سے کاٹا سامنے سے نکلنے والی گاڑی سے ریڑھی ٹکرا گئی اور اس کی ہیڈ لائٹس چکنا چور ہو کر زمین پر بکھر گئیں۔ چھنا کا سن کر اردگرد سے لوگ اکٹھے ہو گئے ٹریفک جام ہو گئی۔ جبکہ ابراہیم کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی اور جگنو بھی پریشانی کے عالم میں روہانسا ہو کر مجمع میں مجرم بنا کھڑا تھا۔

ابراہیم کی نظر گاڑی سے نکلنے پر لڑکے پر پڑی تو اس کو کچھ تسلی ہوئی کیونکہ وہ اختر علی کا بیٹا عاصم تھا وہ آگ بگولا ہو کر نکلا تھا اس نے ابراہیم کو نظر انداز کرتے ہوئے جگنو کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ مجمع گنگ ہو گیا تھا۔ جگنو نے بھی اپنے کزن کو پہچان لیا تھا مگر کزن کی آنکھوں پر دولت اور غرور کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"گھٹے کے بچے۔ یہ کیا کیا تم نے۔ نظر نہیں آتا...... اندھے ہو کر بھاگے آ رہے ہو۔" ایک اور زوردار تھپڑ نے جگنو کا سر گاڑی کے بمپر سے ٹکرا دیا۔ خون دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے لگا۔ اس سے پہلے کہ عاصم جگنو کو اور مارتا ابراہیم آگے بڑھ کر عاصم کے پاؤں پڑ گیا۔

"وہ کملا ہے...... جھلا ہے صاحب...... اُسے مت مارو۔ مجھے مار لو۔ اُس کا کوئی قصور نہیں ہے...... وہ بچہ ہے۔ نادان ہے...... اُسے مت ماریں۔ میں اس کا باپ ہوں...... اس کے گناہ کی سزا مجھے دیجئے۔" عاصم کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا ابراہیم نے اپنے سر سے میلا سا صافہ اتار کر اس کے پاؤں میں پھینک دیا۔ "میرے سفید بالوں کا خیال کر دو بیٹا...... ہمیں معاف کر دو......" اس نے ابراہیم کو گریبان سے پکڑ کر اُٹھایا اور نفرت سے بولا۔

"پانچ ہزار روپے کا نقصان تمہاری دس دن کی کمائی بھی نہیں پورا کر سکتی...... اسی لیئے تو ہم تم جیسے رشتہ داروں سے نفرت کرتے ہیں...... دفع ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ اپنی اور اس گھٹے کی شکل مت دِکھانا۔" اس نے آخری الفاظ روتے اور سہمے ہوئے جگنو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے اور ابراہیم کو جھٹکا دیکر پیچھے کی طرف دھکیلا۔ اسی اثنا میں احمد اور آمنہ مجمع کو چیرتے ہوئے آگے پہنچ چکے تھے ابراہیم آمنہ کے قدموں میں جا کر گر گیا۔

تماشائیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ٹریفک کا اژدھام دلچسپ تماشے کی وجہ سے خوفناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ عاصم نے احمد اور آمنہ کو دیکھ لیا تھا مگر وہ آمنہ کو پہچان نہ سکا وہ سمجھا کہ وہ احمد کی آفس ورکر ہوگی مگر احمد کو دیکھ کر اس کی روح فنا ہوگئی تھی وہ جانتا تھا کہ اس نے پھوپھا ابراہیم سے زیادتی کی ہے اور جگنو کو مار کر جرم کیا ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ احمد نے اپنی شادی والے دن اصل سے ان لوگوں کو بے گناہ ہونے پر معافی منگوائی تھی۔ اب بھی احمد کے ارادے کچھ ایسے ہی لگتے تھے وہ مجمع کو چیر کر آگے بڑھا اور عاصم کو گریبان سے پکڑ لیا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ بھائی پر اُٹھتا اس کا ہاتھ کسی نے پکڑ لیا۔ اس نے تڑپ کر ابراہیم کی طرف دیکھا جس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔

احمد کیلئے یہ بہت تکلیف دہ منظر تھا اس نے تماشائیوں پر نظریں دوڑائیں اور عاصم کو چھوڑتا ہوا بولا۔

''تمہاری کتنا نقصان ہوا ہے؟'' مگر عاصم جو کہ احمد کے آنے سے پہلے شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا اب گیدڑ کی طرح دم دبا کر بھاگنے کا رستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر احمد اس کو اس طرح جانے نہ دینے والا تھا۔

''میں پوچھ رہا ہوں کتنا نقصان ہوا ہے تمہارا۔'' احمد دھاڑ کر بولا تو جگنو سہم کر آمنہ کے پاس چلا گیا۔ عاصم کی بھی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ احمد نے جیب سے چیک بک نکال کر ایک چیک پر دستخط کیئے اور زبردستی عاصم کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔ ''اس میں رقم خود بھر لینا تمہارا نقصان پورا ہو جائے گا...... مگر ان لوگوں کی جو بے عزتی تم نے بھرے بازار میں کی ہے اس کا ازالہ کون کرے گا؟'' ابراہیم آگے بڑھ کر دونوں بھائیوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔

''احمد بیٹا!...... جانے دو...... اس نے مجھے پہچانا نہیں ہوگا......'' وہ عاصم کی طرف مڑا۔ ''بولو عاصم...... کہہ دو کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں تھا...... بھلا غریب بھی کسی کا رشتہ دار ہوتا ہے...... گھر جا کر بات کر لینا۔'' ابراہیم کی آنکھوں نے احمد کو مزید تڑپا دیا تھا برسات بن بادل ہی برسنے لگی تھی۔

''شرم سے ڈوب کر مر جانا چاہیئے تمہیں...... جاؤ دفع ہو جاؤ'' اس نے عاصم سے کہا اور ابراہیم کو سہارا دیکر آمنہ اور جگنو کے ساتھ مجمع سے باہر نکل آیا۔ تماشہ ختم ہو گیا تھا۔ مجمع چھٹنے لگا تو ٹریفک بھی اپنے معمول پر چل پڑی۔ ''میں سخت شرمندہ ہوں پھوپھا جی!'' احمد نے اُن دونوں کو اپنی گاڑی میں بٹھا لیا تھا جگنو کے خون بہنے والی جگہ پر آمنہ نے گاڑی صاف کرنے والا کپڑا

باندھ دیا تھا وہ اب تک سہم کر آمنہ کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ اور آمنہ اپنے باپ کو اس حالت میں سرِ بازار تماشہ بنا دیکھ کر دل و جان سے لرز گئی تھی اس کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیر بن گئی تھی۔

''تمہارا کیا قصور ہے احمد بیٹا!......'' ابراہیم دُکھی دِل سے بولا۔ ''قصور تو ہمارا ہے جو غربت کی گود میں پل کر اتنے چھوٹے ہو گئے کہ امیر رشتہ دار ہم سے نفرت ہی نہیں بلکہ......'' اس کی آواز بھرا گئی احمد نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے ابراہیم کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

''آپ ریڑھی لے کر گھر جائیں میں اور آمنہ جگنو کے لے کر آتے ہیں۔'' ابراہیم اثبات میں سر ہلاتا ہوا گاڑی سے اتر گیا۔ وہ لٹے پٹے قافلے کی مانند گھر پہنچا تو عائشہ بی بی حسبِ معمول اس کی منتظر تھیں ابراہیم کے اندر داخل ہونے پر اُنہوں نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا مگر ابراہیم اپنی ہی دھن میں تھا اس نے ہاتھ آگے بڑھایا مگر گلاس پکڑ نہ سکا اور سٹیل کا گلاس صحن کی اینٹوں کو پانی سے بھگونے لگا۔

''آپ کا دھیان کدھر ہے؟ اور وہ میرا عاشق پتر کہاں ہے؟'' عائشہ بی بی کے لہجے میں تشویش تھی اور پھر ابراہیم بھی معمول کی طرح مسکراتا ہوا گھر میں داخل نہ ہوا تھا۔ وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئیں اور حیرت سے بولیں۔

''جگنو کے ابا! کیا بات ہے؟ جگنو کہاں ہے؟ آپ خاموش کیوں؟...... میری برداشت کا امتحان نہ لیں۔ جلدی سے بتائیں میرا جگنو ٹھیک تو ہے...... میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئیں تو ابراہیم نے آنسو بھری آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''جس طرح جرم کرنے والے کا جرم اس کے چہرے پر لکھا ہوتا ہے...... بالکل اسی طرح ذلت اور رسوائی غریب کی پیشانی کی لکیروں سے نمایاں ہو ہو کر غربت اور مفلسی کو عیاں کرتی رہتی ہیں۔'' خاموش آنسو بہہ نکلا تھا۔ عائشہ بی بی تڑپ گئیں۔ ''میں اگر غریب ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے...... میرے اللہ میں نے ساری زندگی اس حال میں تیرا شکر ادا کیا ہے۔ اب بھی مجھے صبر عطا فرما اور مجھے اپنے صابر و شاکر بندوں میں شمار فرمانا...... میرے اللہ میری زبان سے شکوے اور گلے کو کبھی بھی جاری نہ فرمانا...... مجھے معاف کر دے اللہ...... مجھے معاف کر دے......'' ابراہیم ہچکیاں لے لے کر رونے لگا تو شوہر کو روتا دیکھ کر عائشہ بی بی کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔

اُنہوں نے ابراہیم کے ساتھ اپنی زندگی گزار دی تھی مگر بڑی سے بڑی پریشانی اس نے ہنس کر سہی تھی اور ہر مسئلے کو اپنی دانشمندی سے حل کیا تھا۔ مگر آج اُسے روتا دیکھ کر عائشہ بی بی متعجب

تھیں۔

''آپ بتاتے کیوں نہیں...... کیا ہوا ہے؟ میرا جگنو ٹھیک ہے؟'' ممتا کی ماری کو اپنے جھلے بیٹے کی فکر تھی کیونکہ شوہر تو خیریت سے گھر پہنچ گیا تھا۔ مگر وہ کملا جھلا پتہ نہیں کہاں مارا مارا پھرتا ہوگا۔

''آج امارت نے غربت کے منہ پر اتنے زور سے اپنے غرور کا طمانچہ مارا ہے کہ ایک بار تو کاتب تقدیر کا قلم بھی لرز گیا ہوگا۔'' ابراہیم آنکھوں کو صاف کرتا ہوا بولا۔ اس سے پہلے کہ عائشہ بی بی کچھ کہتیں دروازہ کھلا اور جگنو اندر داخل ہوا اس کے ماتھے پر بندھی ہوئی پٹی دیکھ کر ممتا تڑپ اُٹھی دِل پر ایک گھونسا سا لگا اُنہوں نے تقریباً بھاگتے ہوئے آگے بڑھ کر جگنو کو سنبھالا اور اس کا منہ سر چومنے لگیں۔

''کیا ہوا ہے میرے بچے کیا ہوا...... یہ چوٹ کیسے لگی......؟ کس نے مارا ہے تمہیں...... کچھ تو بولو۔'' عائشہ بی بی دیوانہ وار جگنو کو چوم چاٹ رہی تھیں وہ اس قدر سنجیدہ تھا کہ کوئی بھی یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کملا اور جھلا ہے۔ ماں بیٹے کی چوٹ دیکھ کر اس قدر پریشان ہو گئی تھی کہ اُسے بیٹی اور داماد بھی نظر نہ آئے جو جگنو کے پیچھے پیچھے ہی گھر میں داخل ہوئے تھے۔

''اماں جی!'' آمنہ کی آواز پر اُنہوں نے چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھا تو وہ احمد سے شرمندگی محسوس کرنے لگیں کیونکہ آمنہ تو اس کی اپنی بیٹی تھی مگر احمد تو داماد تھا کہیں وہ اس طرح نظر انداز کیئے جانے پر بُرا منا گیا تو...... یہ بات کہیں بیٹی کے آگے نہ آ جائے اُنہوں نے جلدی جلدی جگنو کو چھوڑا اور آگے بڑھ کر احمد کو پیار دیکر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا آمنہ کو بھی پیار دینے کے بعد ایک طرف رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

یہ کرسیاں احمد اور آمنہ نے زبردستی اُنہیں لا کر دی تھیں۔ کیونکہ جب احمد اس گھر میں آتا تھا اس کے بیٹھنے کو ٹوٹی ہوئی کرسی یا پھر اُدھڑی ہوئی چارپائی ہوتی تھی۔ آمنہ کو بہت محسوس ہوتا تھا اس نے ڈرتے ڈرتے احمد سے بات کی تو اس نے بخوشی آمنہ کی بات قبول کر لی کیونکہ وہ بھی چاہتا تھا کہ پھوپھو عائشہ کے گھر کو تھوڑی سی تبدیلی مل جائے۔ ابراہیم فوراً باہر نکل گیا وہ داماد کیلئے کچھ کھانے پینے کی اشیاء خریدنے گیا تھا۔ احمد بھی پھوپھو سے نظریں چُرا رہا تھا حالانکہ مجرم عاصم تھا۔ جگنو بھی ایک طرف چارپائی پر بیٹھ چکا تھا۔ عائشہ بی بی نے گھر کا سُکھ اور سکون بیٹی کے چہرے پر لوٹا دیا تھا۔ انہیں تسلی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے احمد کی صورت میں اس کی ذمہ داری کو احسن

طریقے سے انجام دے کر اُسے باعزت سرخرو کیا تھا۔ مگر جگنو کی طرف سے پریشانی ہنوز قائم تھی۔

''کیسے ہو احمد بیٹا؟'' اُنہوں نے پوچھا تو احمد چونک پڑا۔ آمنہ نے شوہر کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ امی کی باتوں کا جواب پُرسکون ہو کر دیا جائے۔

''آپ کی دُعائیں ساتھ ہوں تو کیسا ہو سکتا ہوں...... بالکل اچھا بھلا ہوں۔'' اس نے مسکان لبوں پر سجاتے ہوئے کہا۔

''سدا خوش رہو...... گھر کے بھاگ لگیں...... خداوند تمہیں سدا سلامت رکھے!'' وہ بظاہر تو احمد کو دُعائیں دے رہی تھیں مگر اندر بیٹھا دل کا چور اس بات سے بھی پریشان تھا کہ اگر احمد کو ان دونوں کی شادی کا علم ہو گیا تھا تو آمنہ کی زندگی میں زہر گھل جائے گا وہ دِل کی پریشانی کو الفاظ کے لبادے میں لپیٹ کر دُعاؤں میں پھولوں کی مانند نچھاور کر رہی تھیں۔ ابراہیم کے ہاتھوں میں کئی چیزیں تھیں آمنہ دیکھ کر جلدی سے اُٹھی۔ اور سب کچھ اس کے ہاتھ سے لے کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ''آپ لوگ تکلف نہ کیا کریں...... مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' احمد نے ایک کرسی کی جانب ابراہیم کو اشارہ کیا وہ آگے بڑھ کر کرسی گھسیٹ کر عائشہ بی بی کے پاس بیٹھ گیا۔ جگنو چارپائی پر بیٹھا بیٹھا ہی سو گیا تھا۔ اس نے گھٹنوں میں سر دیا ہوا تھا مگر والدین جانتے تھے کہ وہ سویا ہوا ہے۔

''ہمیں اچھا لگتا ہے۔ تم اس گھر کے داماد ہو۔ جب تم آتے ہو تو ہمیں خوشی ہوتی ہے...... اس گھر میں اور کون آتا ہے؟'' ابراہیم نے کہا تو احمد مسکراتا ہوا کرسی سے اُٹھا اور آ کر ان دونوں کے قدموں میں زمین پر آ کر بیٹھ گیا وہ حیرانگی سے دیکھنے لگے۔

''ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو...... اُوپر بیٹھو...... زمین ٹھنڈی ہے۔'' ابراہیم نے اُسے بازو سے پکڑ کر اُٹھانے کی کوشش کی مگر وہ چوکڑی مار کر فرش پر بیٹھ چکا تھا۔ ابراہیم کی کوشش بیکار گئی۔ اس نے ابراہیم کے گھٹنوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ چاہتے ہیں کہ اس گھر کا داماد بنوں؟'' اس کی اس بات پر دونوں ہی ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ کچن چونکہ اوپن ہی تھا آمنہ بھی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''نہیں چاہتے نا کہ میں ''داماد بنوں'' احمد نے اُنہیں شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر کہا۔ ''تو پھر مجھے اس گھر کا بیٹا ہی رہنے دیں...... میں بیٹا بن کر آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہوں گا کہ آپ مجھے بیٹا ہی سمجھیں اور ماں باپ کا پیار دیں...... آپ میری پیشانی پر بوسہ دیتی ہیں نا...... تو اس کا مجھے کتنا سکون ملتا ہے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بس...... مجھے داماد نہیں......

بیٹا ہی سمجھیں۔'' احمد کے بڑے پن نے اس کی عزت اور بڑھا دی تھی۔ ابراہیم' عائشہ بی بی اور آمنہ کی آنکھیں جھلمل کر رہی تھیں۔

''اللہ تعالیٰ نے اگر عفی کو بھی نیک سیرت دی ہوتی تو وہ بھی میرے پاس ہوتا۔ میرے تین تین بیٹے ہوئے۔'' عائشہ بی بی کی آنکھیں عفی کو یاد کر کے چھلک پڑیں۔ پھر ان کا دھیان جگنو کی طرف گیا تو ممتا کے سینے پر ایک اور گھونسا لگا۔

''احمد بیٹا!...... سچ سچ بتانا...... جگنو کو چوٹ کیسے لگی؟''

''معمولی سا حادثہ تھا...... وہ بالکل ٹھیک ہے...... آپ کو مجھ پر اعتماد ہے نا......'' احمد عائشہ بی بی کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا وہ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی ہوئی بولیں۔ ''ہاں!''

''تو پھر فکر نہ کریں...... یہ پٹی تو بس اس لیئے کروائی ہے کہ جگنو آئینے میں اپنا زخم دیکھ کر پریشان نہ ہو جائے۔'' احمد کے خوبصورتی سے بات کرنے پر آمنہ اور ابراہیم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

☆☆☆

''میرا جواب وہی ہے...... میں ابارشن ہی کرواؤں گی۔'' فریحہ نے دانیال کو کرارا سا جواب دیا تو ایک لمحہ کیلئے اس کی بھنویں تن گئیں۔ مگر اس نے دوسرا لمحہ پرسکون ہو کر خود کو ریلکس کیا۔ ''میں نے مما سے چوری تمہیں فون کیا ہے...... وہ تو کہتی تھیں کہ ابارشن کے بعد ہی فون کریں گی...... دانی پلیز...... میری مجبوری کو سمجھو...... میں ابھی سے بچے کی جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتی اور نہ ہی اپنا سمارٹ فیگرز خراب کرنا چاہتی ہوں۔'' دانیال اس وقت اپنے آفس میں تھا وہ فریحہ کو سمجھانا چاہتا تھا مگر بات اس کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔

''دیکھو! تم ابارشن کروانے سے پہلے ایک بار مجھے مل لو۔''

''مگر کیوں؟''

''فریحہ! کم آن...... بات کو سمجھنے کی کوشش کرو...... اولاد اللہ تعالیٰ کی نعمت ہوتی ہے کیوں کفران نعمت کر رہی ہو؟'' دانیال کا انداز بدستور سمجھانے والا تھا۔ ''دیکھو!...... اچھا...... ایک بات بتاؤ۔ مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو؟''

''دانی! تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی......''

''تو پھر...... کیا تم چاہتی ہو کہ ہمارے پیار کی نشانی...... اس دُنیا میں آنے سے پہلے ہی

ابارشن کی نذر ہو جائے؟'' دانیال چاہتا تھا کہ وہ ابارشن کا خیال دل سے نکال دے۔ اس سے پہلے کہ فریحہ کوئی جواب دیتی امتل نے اس کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا اس نے ہی فریحہ کو کہا تھا کہ فون کر کے دانیال کو آگاہ کر دے کہ ہم ابارشن کیلئے نکل رہے ہیں اس نے تمام گفتگو سنی تھی اور اب اس کے بولنے کی باری تھی۔

''سنو لڑکے!...... ہم تم سے کوئی مشورہ نہیں مانگ رہے بلکہ تمہیں اطلاع دے رہے ہیں...... کیا تم نہیں چاہتے کہ تم اپنی شادی کو دو تین برس تک انجوائے کرو۔ تمہاری بیوی تمہارے ساتھ کسی فرینڈ کی پارٹی میں جائے اور بور اور بھدی لگے۔'' دانیال سمجھ گیا کہ اس کی تمام گفتگو امتل نے بھی سنی ہوگی۔ وہ خاموشی سے اس کی باتیں سننے لگا۔

''آج کل کے لڑکے تو سمارٹ اور سلم لڑکیاں پسند کرتے ہیں۔ تم کیسے بیوقوف ہو کہ چاہتے ہو میری بیٹی...... جو کہ ابھی کچی عمر کی ہے جس کی پڑھائی کے دن ہیں...... وہ اپنے بچے کو دودھ پلائے اور اپنا سمارٹ اور گڈ لک فیگر خراب کر لے...... نو۔ نو نو نو...... مائی ڈائیر سن ان لاء...... بیوقوفی مت کرو۔ اور اپنی بیوقوف ماں کو بھی سمجھاؤ کہ ابھی ینگ ینگ ہی لگے دادی بننا اچھا لگتا ہے کیا...... اور پھر میں کیوں نانی بنوں...... ابارشن تو ہوگا...... بائے۔'' امتل نے فون بند کر کے فریحہ کی طرف دیکھا جس کی پیشانی پر کوئی ندامت یا شرمندگی کی لکیر نہ تھی۔

''ڈونٹ وری اباؤٹ ہم...... مجھے ایک بات بتاؤ'' دونوں ماں بیٹی کمرے سے نکل آئیں تھیں اور وسیع ڈرائینگ کو کراس کرتی ہوئی باہر لان میں چلی آئیں تھیں۔ ''کیا دانیال تمہیں پیار کرتا ہے؟'' اس سوال پر فریحہ ماں کی طرف نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھ کر رہ گئی۔ اس کا استفہامیہ انداز دیکھ کر امتل دوبارہ بولی۔

''میرا مطلب تھا کہ وہ گھر والوں سے ٹکر لے کر تمہیں بخوشی اجازت دے گا مگر اس کا رویہ ایسا نہ تھا۔ شادی سے پہلے تم نے کہا تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندگی کو گناہ سمجھتے ہو۔''

''مما! دانی مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ ابارشن والی بات چند دنوں میں ہی بھول جائے گا۔'' فریحہ نے پرجوش لہجہ میں کہا تھا۔ چوکیدار گیٹ کھولا تو اختر علی کی گاڑی اندر داخل ہوئی وہ گاڑی کھڑی کر کے لان میں ان دونوں کی طرف بڑھ گیا۔

''سلام ڈیڈی!'' فریحہ نے سلام میں پہل کی تو اختر علی کے ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی۔

''وعلیکم السلام بیٹا! کیسی ہو؟''

''بالکل ٹھیک ہوں؟''مختصر سا جواب دے کر امثل اور فریحہ آگے بڑھنے لگیں تو اختر علی نے اُنہیں روکا!

''امثل بیگم!'' دونوں ماں بیٹی اس کی آواز پر باری باری پلٹیں۔امثل کو اپنے نظر انداز کیئے جانے کا غصہ تھا۔وہ بھونیں چڑھا کر اختر علی کی طرف دیکھنے لگی۔''کبھی پرندوں کو قطار در قطار اُڑتے ہوئے دیکھا ہے؟''

''میرے پاس فضول سوال کا جواب دینے کیلئے کوئی وقت نہیں ہے۔''وہ جل بھن کر بولی۔ کیونکہ یہ بے تکا سا سوال اُس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔اگر آیا بھی تھا تو اس سوال کو کرنے کی کیا تک تھی؟

''امی! کبھی پیار سے بھی بول لیا کیجئے۔''اختر علی کے انداز پر فریحہ مسکرانے لگی تو امثل نے اُسے گھور کر دیکھا۔

''بولو...... کیا کہنا چاہتے ہو؟''امثل نے گویا شوہر کو''کچھ''وقت دے کر اس کی پشتوں پر احسان عظیم کیا تھا۔

''یہ بیوقوف نہیں ہوتے...... ایک دوسرے سے ساتھ نبھانے کا عہد لیکر ایک جگہ سے اُڑتے ہیں...... سارا دن اپنی اپنی فکر اور دھن میں مگن ہو کر اپنا رزق تلاش کرتے ہیں اور پھر شام کو اپنی چونچ میں دانے دبائے دوبارہ قطار در قطار واپس آجاتے ہیں۔جانتی ہو......؟ وہ واپس کیوں اور کہاں جاتے ہیں؟''مگر امثل نے اس فضول بات پر توجہ نہ دی۔اختر علی کو خود ہی اپنی بات کا جواب دینا پڑا۔''یہ واپس اپنے گھونسلوں میں لوٹ جاتے ہیں جہاں ان کے بچے ان کی آمد کے منتظر ہوتے ہیں اور یہ دن بھر کی تھکان کے باوجود اپنے منہ میں دبائے ہوئے دانے کو بچوں کی کھلی چونچ میں دیکر سکون اور فرحت محسوس کرتے ہیں...... ہم پرندے نہیں ہیں...... مگر ہمارے یہ گھر گھونسلوں کی مانند ہیں...... اگر ہم انہیں چھوڑ کر کہیں اور بسیرا کرلیں۔تو ان میں ویرانی اور آسیب بسیرا کرلیں گے۔اس لیئے ہمیں بھی چاہیئے کہ شام کو اپنے گھروں کو لوٹ جائیں تاکہ ان میں رقص کرنے والی خوشیاں ہمارے جانے سے دوبالا ہوسکیں......''وہ خاموش ہوا اور فریحہ کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔

فریحہ بیٹا! میری بات تمہاری ماں کی سمجھ میں شائید نہ آئی ہو...... مگر آسمان کی جانب دیکھو اور ڈوبتے سورج کا نظارہ کر کے اس بات کا اندازہ کرو کہ شام ہونے والی ہے...... اور یہ تمہارا گھر نہیں ہے...... اپنے گھر لوٹ جاؤ تاکہ اس میں کسی بھی قسم کی نحوست اور ویرانی نہ چھا سکے!''اختر

علی تو چلا گیا مگر فریحہ کو اندر باہر سے لرزا گیا تھا...... اُسے کوئی بھی لمحہ سوچنے کا دیئے بغیر امثل اُسے ہاتھ سے پکڑتی ہوئی گاڑی تک لے گئی۔

اختر علی جہاندیدہ آدمی تھا وہ جان گیا تھا کہ امثل فریحہ کو اپنی انگلی پر لگا کر من مرضی کر رہی ہے۔اس نے سوچ بچار کے بعد دانیال کو اپنے پاس بلانے کا فیصلہ کیا اور فون کر دیا۔دانیال کافی مصروف تھا مگر اس نے اپنے گھر کو بچانے کیلئے ایک گھنٹہ بعد کا وقت نکال لیا۔

امثل اور فریحہ کو گئے ہوئے دو گھنٹوں سے زیادہ ہو گئے تھے شام کی سردی بڑھنے لگی تھی۔ ٹھنڈی ہوا اور ہلکی ہلکی دُھند نے سر شام ہی مارکیٹوں اور دفاتر کو بند کرنے کی دھمکی دے رہی تھی۔ دور دراز سے اس شہر میں آکر کام کرنے والے اجنبی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے اور جو باقی بچ گئے تھے وہ ٹرانسپورٹ کم ہونے اور خراب موسم کی وجہ سے گھروں کو جانے کیلئے سڑک کنارے اور بس سٹینڈز پر پریشان کھڑے تھے۔

اختر علی اور دانیال کے درمیان کافی دیر تک فریحہ کے مسئلے پر گفتگو ہوتی رہی۔دانیال مصر تھا کہ فریحہ پہلے بچے کو جنم ضرور دے اور اختر علی بھی یہی چاہتا تھا مگر امثل اور فریحہ یہ نہ چاہتے تھے۔ وہ دونوں گھر میں داخل ہوئیں تو ان کا مقصد دونوں کے چہروں پر لکھا ہوا تھا۔دانیال کا ماتھا ٹھنکا۔ مگر فریحہ نے اس کی طرف دیکھ کر نظریں جھکا لیں تو اُس نے اختر علی کی طرف مایوسانہ نظروں سے دیکھا تو شرم کے مارے اس کی بھی نظریں جھک گئیں۔

کیسے ہو دانی صاحب!؟ امثل کی آواز میں اس کی فتح کا نشہ اور دولت کا غرور شامل تھا مگر دانیال بھی کروڑ پتی باپ کی اولاد تھا وہ دولت اور رعب داب کی وجہ سے دھیما مزاج اختیار نہ کرتا تھا بلکہ وہ فریحہ کو کھونا نہ چاہتا تھا۔وہ اس سے بہت پیار کرتا تھا۔

''فریحہ! کہاں سے آرہی ہو؟ دانیال نے فریحہ کے پاس پہنچ کر پوچھا جواب ایک صوفے پر نڈھال ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔اختر علی شرم کے مارے پانی پانی ہو رہا تھا اس سے برداشت نہ ہوا تو وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''میرے خدشات کو اقرار کی زبان مت دینا فریحہ!...... میرا پیار اور عورت پر سے اعتبار اُٹھ جائے گا۔دانیال کی آواز میں لغزش محسوس کی جاسکتی تھی۔

''میں مجبور تھی دانی!''فریحہ کی کمزور آواز نے دانیال کے دماغ کو چکرا دیا وہ ساس کی طرف دیکھنے لگا اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ نے دانیال کی رہی سہی قوت برداشت بھی ختم کر دی

تھی۔ وہ تڑپ کر اُٹھا۔

''کیا مجبوری تھی؟۔۔۔ہاں! بتاؤ کیا مجبوری تھی؟ لوگ ماں باپ بننے کے لئے دردر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری آواز صدا لگانے سے پہلے ہی سُنلی تھی۔ تم ناشکری اور بیوقوف ہو۔'' اس کی آواز میں چھپا ہوا دُکھ اور تڑپ اختر علی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا محسوس کر رہا تھا مگر احتل اور فریحہ کو اپنی غلطی اور بیوقوفی کا کوئی احساس نہ تھا''۔ تمہاری مجبوری یہ تھی کہ تم ماں کہلانا پسند نہیں کرنا چاہتی تھیں اور تمہاری ماں کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو نانی کہہ کر اپنی عمر ظاہر نہ کرنا چاہتی تھیں۔ تم نے بہت بڑی بیوقوفی کی ہے فریحہ! تم نے اپنی ماں کی بات مان کر میرے بچے کو قتل کیا ہے۔ اس کا انجام تمہیں بھگتنا ہوگا۔ اس کے منہ سے کف بہنے لگا تھا انتہائی غصے کے عالم میں اس کا وجود کانپنے لگا تھا وہ احتل کی طرف مڑا۔ ''اپنی جھوٹی انا اور سوسائٹی میں اپنے آپ کو جوان ظاہر کرنے کی کوشش میں آپ نے میرے بچے کو قتل کیا ہے۔ یہ جوانی اور رنگ روپ ڈھلتے دن کی طرح ہے کب تک روک سکیں گی آپ اپنی جوانی کو...... میرے بچے کو مار کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہیں آپ؟۔۔۔ اگر آپ کو صدا جوان ہی رہنا تھا تو پھر اپنے بچوں کی ماں بھی کیوں بنی...... کیوں اپنا فگر خراب کیا...... کیوں......'' مگر دوسرے ہی لمحہ ایک زوردار تھپڑ نے دانیال اور فریحہ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

چٹاخ کی آواز نے کمرے میں سناٹا کر دیا تھا۔ دانیال اس گھر کا داماد تھا اور فریحہ اکلوتی بیٹی اس کا مطلب کہ دانیال بھی اکلوتا داماد تھا۔ وہ گنگ رہ گیا تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے ساس کی طرف دیکھے جا رہا تھا جس کی ناک ابھی تک پھولی ہوئی تھی اور آنکھیں غصے اور نفرت کی شدت سے کھلی ہوئی تھیں۔

''کتا جب زیادہ بھونکنے لگے تو میں اُسے دھتکارنے کی بجائے پٹہ کھینچ کر اس کی زبان کاٹ دیتی ہوں۔ تمہاری گستاخ اور لغو زباں نے آج ثابت کر دیا کہ تم بھی ایک باپ کی اولاد نہیں ہو۔'' دانیال کے چہرے کی رنگت زرد ہو گئی تھی اس نے احتل کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔ ''جاؤ جا کر اپنی وحشیا ماں سے پوچھو کہ اس کی جوانی آج تک برقرار کیسے ہے؟'' ایک اور بم جو دانیال کے دل و دماغ پر گرا تھا وہ اس کی روح کو گھائل کر گیا تھا۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اور تمہاری ماں اتنی گھٹیا اور ذلیل ہو گے کہ میری بچی پر ظلم کرو گے۔ مجھے اس جاہل اور بے غیرت خاندان میں اپنی بچی کو نہیں رکھنا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے کتیا کی اولاد اور آئندہ اس طرف منہ کیا تو ہاتھ پاؤں تڑوا کر گلی میں پھنکوا دوں گی پھر ساری عمر بھیک مانگتے ہی گزر جائے گی۔ گیٹ آؤٹ فرام ہیر'' (Get out

from here) دانیال نے تڑپ کر فریحہ کی طرف دیکھا مگر اس کی نظروں میں بے رُخی اور بے اعتنائی دیکھ کر اس کے دل میں جمع ہونے والا غبار الفاظ بن کر اس کی زبان پر آ گیا۔

''کبھی گلی کے اس کتے کو دیکھا ہے جو گرمیوں میں اپنی پیاس بجھانے کے لئے گندی نالی کا گندا پانی پینے پر مجبور ہو جاتا ہے''۔ احتل اور فریحہ سمجھ گئیں کہ اب دانیال کی زبان لاوا اُگلے گی۔

''تمہاری اوقات اور حیثیت بس اتنی ہی تھی مگر بھلا ہو اس نیک آدمی کا جس کی دن رات کی محنت رنگ لائی اور تم اس بنگلے میں عیش کر رہی ہو اور رہ گئی یہ بات کہ میری ماں وحشیا ہے اور ہم بے غیرت ہیں تو تم بھی کوئی نمازیں نہیں پڑھاتی احتل بی بی۔ تمہارے گندے اور کالے کرتوت اگر ظاہر کروں تو خارش زدہ کتیا کی طرح منہ چھپاتی پھرو گی۔'' احتل کو تو ہی احساس سے مر جانا چاہیے تھا مگر وہ ہنوز اپنے پاؤں پر کھڑی تھی۔ دانیال فریحہ کی طرف مڑا۔ ''اور رہ گئی اس بیوقوف اور نادان لڑکی کی بات...... تو اس نے مجھے اور میرے پیار کو دھوکا دیا ہے۔ میرے ارمانوں اور میرے جذبات کے ساتھ کھیل کھیلا ہے میرے دل کو چور چور کر دیا ہے اور اب اس دل میں اور اس گھر میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں اپنی بیوی فریحہ بنت اختر علی کو'' طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔'' اختر علی کے کانوں میں سیسہ انڈیل کر اُسے بہرہ کر دیا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی بینائی جاتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو گئی وہ اپنے دل کو پکڑتا ہوا دروازے کی جانب لپکا اور وہیں تیورا کر گر پڑا۔

''اب شوق سے اس کی جوانی سنبھال کر رکھنا اور فریحہ بی بی تم بھی اپنی ماں کی جوانی کا خیال رکھنے کے لئے اس کے گھناؤنے اور کالے کرتوتوں میں شامل ہو جاؤ۔ تاکہ ہر رات نیا مرد تم دونوں ماں بیٹی کو بھرپور جوانی کا مزہ دیتا رہے''۔ دانیال کے الفاظ سیسے کی مانند احتل اور فریحہ کی سماعت میں گونجنے لگے تھے۔ وہ جا چکا تھا مگر دونوں ماں بیٹی ایسے گنگ اور بے حس و حرکت تھیں کہ جیسے پتھر کی بے جان مورتیاں ہوں۔

☆☆☆

پرساد چوپڑہ اپنی بات پر قائم نہ رہ سکا اس نے اس خاندان کی موجودگی میں تالہ کھولا اور کلیم اللہ کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ سورۃ فاتحہ کی تلاوت کر رہا تھا۔ چوپڑہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر وہ اپنا بہت کچھ ہار کر آیا تھا اس نے کلیم اللہ کو آوازیں دیں جو کہ کندن کے نام سے تھیں مگر وہ تلاوت کرنے میں اتنا محو تھا کہ اس نے کسی کی بھی آمد کی پرواہ نہ کی اور اپنے کام میں مصروف رہا۔

پرساد چوپڑہ نے موہن کو اشارہ کیا تو اس نے آگے بڑھ کر اُسے کندھے سے ہلایا تو اس کی یکدم کھلنے والی آنکھیں دیکھ کر تو ایک بار موہن بھی لرز کر رہ گیا۔

کلیم اللہ نے سرخ آنکھوں سے باری باری سب کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو کھل کر بہہ گئے۔ اُسے اس طرح تلاوت کی محویت ٹوٹنے کا سخت دُکھ تھا۔ اس کی نظریں پرساد چوپڑا پر آ کر ٹک گئیں۔

''تم اپنے ارادوں سے باز نہیں آئے۔'' پرساد چوپڑہ نے کہنا شروع کیا۔ ''ہم تمہاری ضد کے سامنے اپنے پرکھوں کا دھرم قربان نہیں کر سکتے اور تم اب واپس نہیں آنا چاہتے...... میرا کسی بھی مسلمان بچے سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے...... اس گھر سے جو بھی چیز اور جتنی بھی رقم چاہیے لے جاؤ۔ مگر دوبارہ کبھی بھی ہماری زندگی میں آنے کی کوشش مت کرنا...... آج کے بعد تمہارا ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اس خاندان کا کوئی بھی فرد تم سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا...... اور جو کوئی بھی تم سے چوری چھپے ملے گا...... اس کے دماغ میں گولی اتڈیلتے وقت میرے ہاتھ نہیں کانپیں گے...... میں تمہیں ان گلیوں میں کتا بن کر بھونکتا دیکھنا چاہتا ہوں...... اور تم دیکھنا میرے بھگوان کے کرم سے یہ ہوگا...... تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی...... اب تم جا سکتے ہو۔'' پرساد چوپڑہ یہ کہہ کر موہن سے مخاطب ہوا۔ ''اِسے جتنی دولت چاہیے دے دو...... اور اس کے کمرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تالہ لگا دو۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا مگر کمرے میں مہارانی اور کاجل کے ساتھ ساتھ کنگنا کے رونے کی آوازوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ کندن مر گیا ہے...... اگر سوچا جاتا تو کندن واقعی مر چکا تھا اب اس کی جگہ کلیم اللہ کھڑا تھا جوان ہندوؤں کا گھر چھوڑ کر مسلمانوں کی دنیا میں اپنا مقام بنانا چاہتا تھا...... اس نے باری باری سب کی طرف دیکھا اور مہارانی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''آپ......!'' مہارانی کی ہچکی بندھ گئی۔ خاوند نے اس کے بیٹے کو گھر بدر کرنے کا حکم سنا دیا تھا وہ ممتا کی ماری مجبور ماں تھی مگر شوہر پرستی ہندو عورتوں کے بڑے پن کی علامت تھی اور مہارانی نے پتی کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی بجائے ممتا کے سینے پر جدائی کا بھاری پتھر رکھ لیا تھا۔

''آپ ماں ہیں!...... ماں ہمیشہ اچھی ہوتی ہے...... رب تعالیٰ کا دوسرا روپ۔ اور جنت کو اپنے پاؤں تلے لئے بچوں کے لئے ہمیشہ رب سے دعا گو رہنے والی کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔'' کلیم اللہ نے مہارانی کے ہاتھ پکڑ لئے اور ان پر گرم گرم ہونٹوں کا بوسہ دیا تو اس کے آنسو مہارانی کے ہاتھوں پر گرے مگر دل موم بتی کی طرح پگھلنے لگا۔ ''میں ہی اچھا بیٹا نہ بن سکا۔'' وہ بڑی سی سانس لیتا ہوا بولا۔ ''آپ سمجھنا آپ کے دو بیٹے نہیں...... بس ایک ہی تھا...... موہن...... موہن بھیا۔'' وہ کنگنا کے پاس آیا تو وہ اس کے گلے سے لگ کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ کلیم اللہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں...... کبھی بھی یاد...... نہ آ سکوں اور کبھی بھی تمہیں...... نہ بھلا سکوں...... یہ ایک مسلمان کا وعدہ ہے کنگنا! مجھے معاف کر دینا...... میں تمہاری ڈولی کا ایک پانسہ خالی چھوڑ کر جا رہا ہوں......'' اس نے کنگنا کو روتے ہوئے خود سے جدا کیا اور باری بار کاجل اور پوجا بھابھی کی طرف دیکھا۔ ''آئی ایم ساری بھابی'' پھر وہ موہن کی طرف مڑا۔ ''موہن بھیا! میں جب اس گھر سے نکل گیا تو پھر سبھی رشتے ختم ہو جائیں گے مگر اب تو آخری بار میرے گلے لگ جاؤ'' ۔ وہ بازو پھیلا کر آگے بڑھا...... مگر موہن نے رُخ دوسری طرف پھیر لیا۔

''تم نے سنا نہیں...... پتا جی نے کیا کہا...... ہمارا کسی مسلمان کے ساتھ کوئی تعلق یا رشتہ نہیں ہے۔'' کلیم اللہ کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ رینگ گئی۔ میں آپ کی جاگیر کا حصہ دار نہیں بننا چاہتا۔ یہ سب جائیداد آپ کو مبارک ہو...... میں نے اللہ کی رضا کی خاطر اسلام قبول کیا ہے...... وہ اگر پتھر میں کیڑے کو سبز پتوں کا رزق مہیا کر سکتا ہے تو مجھے کیوں نہیں میں تو چھ فٹ کا جیتا جاگتا انسان ہو...... دو روٹیاں کہیں سے بھی کھا لیا کروں گا۔ یہ دھن دولت، جائیداد اور جاگیر میں نے آپ کو دی...... اور یہ احساس ہمیشہ آپ کو کچو کے لگاتا رہے گا کہ آپ ایک اُس مسلمان کے حصے کا رزق کھا رہے ہیں جس پر آپ نے اپنے گھر کا دانہ پانی بند کر دیا تھا'' ۔ اس نے اپنے کمرے پر الوداعی نظریں ڈالیں اور باہر نکل گیا۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھا اور جیب میں بھی کوئی پیسہ نہ تھا۔

وسیع و عریض اور خوبصورت سنگ مرمر سے بنی ہوئی عمارت سے نکل کر وہ جیسے ہی وسیع لان میں پہنچا وہاں گن پتی بھگوان کا مجسمہ ایستادہ تھا جس کے سامنے پرساد چوپڑہ دو زانو بیٹھ کر ہاتھ جوڑ کر پوجا میں مصروف تھا۔ کلیم اللہ نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ مجسمے کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظریں پڑھے لکھے اور ہندوستان کے امیر کبیر شخص پرساد چوپڑہ کی اُٹھ گئیں۔ وہ چند لمحے وہاں رکا اور جب جانے لگا تو چوپڑہ کی آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

''اس گھر کا گیٹ کراس کرنے سے پہلے آخری بار سوچ لو۔'' وہ اُٹھتا ہوا کلیم اللہ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''کیونکہ جب تم یہ گیٹ کراس کر لو گے پھر تم ہندو پرساد چوپڑہ کے بیٹے نہیں رہو گے۔ پریشانیاں اور تکلیفیں تمہارا مقدر بن جائیں گی اور پھر اس گھر کی سمت دیکھنے کی جرأت بھی

مت کرنا۔" دبنگ لہجہ اور سخت الفاظ اس کے اندر کے غصہ اور اشتعال کا پتہ دے رہے تھے۔ کلیم اللہ ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہوا بولا۔

"بار بار وارننگ دینے سے آپ کے کمزور ایمان کی نشانی بالکل واضح ہے۔ مجھے اس بات کا ہمیشہ دُکھ رہے گا کہ میں ہندو پرساد چوپڑہ کے گھر ہی کیوں پیدا ہوا۔" لہجہ دھیما مگر الفاظ باپ کی باتوں کا جواب تھے جو پرساد چوپڑہ کو زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی مانند لگ رہے تھے۔ "میں اللہ تعالیٰ کا مشکور ہوں کہ جس نے بہت جلد مجھے جہالت اور کفر کے اتھاہ گھنگھور اندھیرے سے نکلنے کا موقع دیا۔ یہ دنیا بہت چھوٹی ہے چوپڑہ صاحب!...... کبھی راہ گلی میں ہماری ملاقات ہوتی ہی رہے گی...... اور رہ گئی بات اس گھر کی...... تو میں یہ دھن دولت۔ مان مریادہ۔ خاندان اور اپنا حصہ چھوڑ کر جا رہا ہوں...... آپ نے ابھی مسلمانوں کے بڑے دل نہیں دیکھے...... یہ اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے...... اللہ حافظ۔" کلیم اللہ نے پرساد چوپڑہ کی کھوپڑی گھما کر رکھ دی تھی وہ غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہوا اس کلیم اللہ کو دیکھ رہا تھا جو کل تک اس کا ہندو بیٹا کندن تھا۔ وہ اب گیٹ کراس کر گیا تھا اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھنا گوارا نہ کیا تھا۔ کمرے کی بالکنی میں کھڑی مہارانی اپنے لختِ جگر کو جدا ہوتے ہوئے دیکھ کر خاموش آنسو بہا رہی تھی اس کے دل سے بیٹے کے لئے دعائیں نکل رہی تھیں جو کلیم اللہ کی کٹھن راہوں میں مدد کرنے والی تھیں۔

کلیم اللہ سیدھا سرفائز کے گھر پہنچا تھا آج خلافِ توقع زیادہ سکوت اور گہری خاموشی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سرفائز اپنے سٹڈی روم میں مطالعہ کرنے میں مصروف ہونگے اس نے سوچا کہ وہ یہیں رہ کر سرفائز کی خدمت کیا کرے گا اور پانچ وقت کی نماز کی ادائیگی بھی ہوا کریگی اور دین اسلام کے متعلق مزید معلومات کا خزانہ بھی جمع کرتا رہے گا۔

اب وہ اپنا ہر ناطہ اور تعلق ہندو گھرانے سے توڑ چکا تھا وہ ایک مسلمان نوجوان تھا قرآن کریم کی تعلیمات اور اسلامی کتب نے اس کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ وہ پکا مسلمان اور سچا عاشق رسولؐ بن گیا تھا وہ اپنے ایمان کی پختگی کے لئے سرفائز احمد کی شاگردی اختیار کرنا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ ان کی خدمت میں جتا رہے گا تو معلومات بھی جمع ہوتی رہیں گی اور اس کے تعلقات سرفائز کی وجہ سے مسلمانوں کی دنیا میں بن جائیں گے اور اس پر سے ہندو خاندان پرساد چوپڑہ کے بیٹے کا لیبل اتر جائے گا اور بطور مسلمان اس کی شناخت بھی ہو جائیگی۔

مگر جیسے ہی وہ سٹڈی روم میں داخل ہوا اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں اور

دل اس منظر کو دیکھ کر یکدم پتھرا گئے تھے۔ پروفیسر فائز احمد اپنی چیئر پر نیم دراز تھے ان کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی اور گردن میں ایک لمبے پھل والا چاقو پیوست تھا ان کی شرٹ خون سے تر ہو کر سرخ ہو گئی تھی۔ کلیم اللہ پڑھا لکھا باشعور نوجوان تھا اس نے اکثر فلموں میں دیکھا اور کتابوں میں بھی پڑھا تھا کہ پولیس جو کہ ہمیشہ دیر سے آتی ہے مگر ایسے موقعوں پر ہمیشہ وقت پر پہنچ جاتی ہے۔ اس نے کسی بھی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا اور اپنے اردگرد خوفناک نظروں سے دیکھتا ہوا پیچھے کی جانب اُلٹے قدموں ہٹنے لگا۔

ابھی وہ چند قدم ہی چلا ہوگا کہ کسی انسانی جسم سے ٹکرا گیا اس کی خوف سے گھگھی بند ہو گئی تھی مگر پلٹنا ضروری تھا اس نے حوصلہ کر کے پلٹ کر دیکھا تو عقل دنگ اور زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ کیونکہ اس بار بھی پولیس وقت پر ہی پہنچ گئی تھی۔ وہ یکدم پریشان نظروں سے دیکھنے لگا تھانے کا پورا عملہ تھا جو انسپکٹر دشوا ناتھ کی سربراہی میں موقع واردات پر پہنچا تھا۔ "مم...... مم میں نے کچھ نہیں کیا انسپکٹر صاحب!" وہ گھگھیائے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ "کسی نے پروفیسر صاحب کا قتل کر دیا ہے...... میں جب اندر آیا تو......" مگر ایک زوردار تھپڑ کھانے کے بعد کلیم اللہ کی زبان بند ہو گئی وہ ہونقوں کی طرح ایک ایک سپاہی کا منہ دیکھنے لگا حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی سپاہی اس کا شناسا نہ تھا جبکہ وہ اس علاقہ کے تھانے کے تمام عملہ کو جانتا تھا اور عملہ اُسے پہچانتا تھا۔

انسپکٹر دشوا ناتھ کی یونیفارم شرٹ پر اس کے نام کا بیج لگا ہوا تھا وہ اس علاقہ میں نیا معلوم ہوتا تھا کلیم اللہ نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے خاموش کر دیا اور بولا۔

"شی...... میں مجرم کو اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع دیا کرتا ہوں...... کیونکہ میں ہنومان دیوتا کا پجاری ہوں...... اگر مجرم سچ نہ اگلے تو میرے پاس ہنومان جی کا گرز ہے...... بس پھر کیا ہے...... اس گرز سے میں مجرم کی اس طرح دھلائی کرتا ہوں کہ اس کا بھرکس نکل جاتا ہے اور بھرکس سے آواز آنے لگتی ہے...... ہاں۔ ہاں میں ہی مجرم ہوں میں نے ہی جرم کیا ہے......" اس کا انداز بالکل مسخروں جیسا تھا۔ کلیم اللہ کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ یہ کوئی فلم تو نہ تھی کہ وہ اتنی ساری پولیس کو غچہ دے کر نکل جاتا اور نہ ہی وہ ہیرو تھا پولیس والوں نے ایک رپورٹر کو اندر آنے کا راستہ دیا اس نے پہلے کلیم اللہ کی تصاویر بنائیں پھر پروفیسر فائز احمد کی...... یہ الگ بات ہے کہ انسپکٹر دشوا ناتھ نے کلیم اللہ کو کلائی سے پکڑ کر تصاویر بنوائی تھیں۔

انسپکٹر وشواناتھ کا موبائل بولنے لگا تو اس نے جیب سے قیمتی اور نیا موبائل نکال کر کال ریسیو کی۔

''جی سر جی! وشواناتھ سپیکنگ!'' وہ کچھ دیر دوسری طرف کی بات سن کر بولا۔

''مجرم کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا ہے جی''۔ وہ سینہ چوڑا کرتا ہوا بولا تو کلیم اللہ سمجھ گیا کہ اُسے اب اس جھوٹے کیس کو بھگتنا ہوگا مگر وہ دوسرے ہی لمحہ حیران ہو گیا جب انسپکٹر نے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا اور کہا کہ سر جی سے بات کرو۔ حیران کلیم اللہ نے موبائل لے کر کان کو لگایا''

''ہیلو'' کہنے کی دیر تھی کہ دوسری طرف سے ''سر جی'' کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔

''میں تمہیں ابھی کے ابھی اس کیس سے نکلوا سکتا ہوں...... اگر تم واپس اپنے مذہب کی طرف مڑ جاؤ۔'' دوسری طرف کی بات سن کر اس کے لبوں پر دردناک مسکان پھیل گئی۔ ''یہ قتل ابھی اس گھر سے باہر نہیں نکلا مگر جو تصاویر بن گئی ہیں وہ تمام مسلمانوں کو تمہارے خلاف کر دیں گی پھر یہی لوگ تمہیں پتھر ماریں گے۔۔۔ یاد رکھو کندن! جس پتھر کے بھگوان سے تم دور بھاگ رہے ہو وہ تمہاری زندگی میں ایک اہم حصہ بن گیا ہے وہ پتھر کا بھگوان تمہیں اپنا آپ منوا کر رہے گا''۔ ''میں سمجھ گیا چوپڑہ صاحب!'' کلیم اللہ کی زبان سے درد بھرے الفاظ ادا ہوئے۔ ''سورگ محل میرے بغیر اداس اور قبرستان کی طرح ویران ہو گیا ہے...... میں نے اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے حوالے کر دیا ہے۔ آپ پتھر اور گارے سے بنے ہوئے بھگوان کو اپنا مددگار سمجھ کر میرے عشق کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے رہیں اور میں اللہ کی مہربانی اور پیارے آقاؐ کی نظرِ کرم سے اپنے عشق کو سرخرو کرنے کی کوشش کروں گا۔'' پرساد چوپڑہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی کلیم اللہ کے الفاظ کیا تھے اس کے لئے جلتی ہوئی چھت کے شہتیر تھے جو اس پر آن کی آن میں ہی گر پڑے تھے۔ وہ دانتوں کو بھینچتا ہوا بولا۔

''تو پھر کھیل شروع ہوتا ہے مولانا کلیم اللہ صاحب!'' چوپڑہ کی بات اور لہجہ میں چھپا ہوا طنز سن کر وہ مسکراتا ہوا بولا۔ ''نظر نہ آنے والے اللہ کی طاقت اور کبریائی دیکھو چوپڑہ کہ اس نے تم جیسے کو بھی اپنا نام لینے پر مجبور کر دیا ہے حالانکہ وہ تمہارے سامنے نہیں ہے''۔ اس نے موبائل وشواناتھ کی طرف بڑھا دیا جو ایک بار پھر ''جی سر جی۔۔۔ جی'' کی گردان کرنے لگا۔

کلیم اللہ کو گریبان سے پکڑتے ہوئے گھسیٹ کر گاڑی میں ڈالا گیا تو مشتعل ہجوم جو پولیس دیکھ کر جمع ہو گیا تھا اس نے کلیم اللہ کو مارنے کے لئے ہلا بولا۔۔۔ مگر پولیس والے اُسے بچا کر لے گئے۔ پروفیسر کے قتل کی خبر یک دم آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ کلیم اللہ کی بطور مسلمان کے شناخت

کے گواہ پروفیسر صاحب ہی تھے مگر وہ نہ رہے تو کچھ دن پہلے تھمنے والے ہنگامے ایک بار پھر پھوٹ پڑے ہندوؤں کا کہنا تھا کہ کلیم اللہ نے مسلمان ہو کر پروفیسر کو قتل کیا ہے اور مسلمانوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک پیدائشی ہندو ہے وہ مسلمان نہیں ہے اس نے جان بوجھ کر پروفیسر صاحب کو قتل کیا ہے تاکہ مسلمانوں کی طرف سے عظیم رہنما کی موت کے بعد دین اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ رُک جائے۔

پورے ملک میں کہرام مچا ہوا تھا ایک بار پھر مساجد اور مندروں کو آگ لگانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور پرساد چوپڑہ اپنے سورگ محل میں مکروفریب کی ہنسی ہنس رہا تھا اس نے سیکیورٹی گارڈز کی پوری فوج سورگ محل کے گرد جمع کر لی تھی اس طرف کسی نے بھی آنے کی جرأت نہ کی تھی۔ اگر کوئی شروع شروع میں آیا بھی تھا تو اس کے گارڈز نے سیدھی فائرنگ کر کے کچھ مسلمانوں کو زخمی کر دیا تھا اور کچھ کو شہید کر دیا تھا۔ کلیم اللہ کے خلاف ملک بھر میں مسلمانوں نے جلوس نکالے تھے اور پروفیسر فائز احمد کے قاتل کو سرِعام پھانسی دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ کلیم اللہ کی تصاویر پر کیچڑ اُچھالا جا رہا تھا۔ کٹر ہندو خاندان سے تعلق ہونے کی بنا پر سرِعام غلیظ گالیاں اور قابلِ نفریں مواد اور لٹریچر سے کلیم اللہ کی شخصیت کو داغدار کیا جا رہا تھا اس عام ہنگامے کے پیچھے پرساد چوپڑہ جیسے مکار اور عیار شخص کا ہاتھ تھا جو اپنے محل میں بیٹھا مختلف چینلز پر دکھائی دیا جانے والا ہنگامہ دیکھ رہا تھا۔

''اس سارے فساد کی جڑ تم ہو کندن!'' دشواناتھ نے اُسے تھانے کے حوالات میں بند کیا ہوا تھا وہ ٹی وی پر ہونے والے ہندو مسلم فسادات دیکھ کر سیخ پا ہو گیا تھا کیونکہ میڈیا اور اعلیٰ افسران نے اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا اس نے بہت مشکل سے افسران کو رام کیا تھا مگر میڈیا پر قابو اس کے بس سے باہر تھا۔ اب بھی اس کے تھانے میں میڈیا کا ایک نمائندہ بیٹھا ہوا تھا جس نے دشواناتھ سے پرانی اور دور کی رشتہ داری نکال لی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ حوالات کی کوریج نہیں کرے گا اور نہ ہی دشواناتھ کا نام آئے گا بہت ساری رشوت کے عوض دشواناتھ بے ایمان سے مہا بے ایمان ہو گیا تھا۔

حالانکہ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کلیم اللہ کو علیحدہ سیل میں رکھے گا اور میڈیا کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنے دونگا۔ اس وعدہ پر اس نے پرساد چوپڑہ سے کافی رقم اینٹھ لی تھی۔ سچ ہی کہا ہے کہ انسان کا پیٹ قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے۔ اب وہ اپنا غصہ کلیم اللہ پر نکال کر اپنی صفائی دینے کی کوشش میں مصروف تھا۔

''دیکھو...... وہ ٹی وی رپورٹر ہے۔ وہ تمہارا بیان اور فلم ساری دنیا کو دکھائیگا۔ چپ چاپ اپنا

جرم قبول کرلو اور سچ سچ بتادو کہ پروفیسر کو تم نے ہی قتل کیا ہے۔ تمہارے ایسے کہنے سے ملک بھر میں ہندو مسلم فسادات کی جو لہر چلی ہے ختم ہو جائیگی۔" مگر کلیم اللہ کچھ نہ بولا۔ انسپکٹر نے اُسے لاک اپ سے نکال کر سپاہیوں کی موجودگی میں ایک الگ کمرے میں بیٹھا دیا۔ کلیم اللہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کمرے کو شادی والی کرسیوں اور ارد گرد قناتیں لگا کر ایسا منظر بنا دیا گیا تھا کہ جیسے وہ کسی شادی والی جگہ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

وہ وشواناتھ کی پلاننگ سمجھ گیا اور ہوشیار ہو گیا۔ اُسے ایک کرسی پر بیٹھا دیا گیا اور سامنے کمرہ مین سٹینڈ پر کیمرہ لگا کر کھڑا ہو گیا پھر ایک صحافی بھی اندر داخل ہوا جس کے گلے میں اس کے ٹی وی چینل کا نام اور اس کے عہدہ والا کارڈ لٹک رہا تھا۔ کلیم اللہ نے اس کا نام پڑھا تو تسلی ہو گئی کہ صحافی مسلمان تھا کیونکہ احمد حسن کسی ہندو کا نام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ صحافی اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ میرے سوالوں کے جوابات دینے کو تیار ہیں مسٹر کندن!؟" کلیم اللہ نے اثبات میں سر ہلا کر اُسے تیار ہونے کا عندیہ دیا تو اس نے کیمرہ آن اور لائٹیں جلا دیں پولیس والے وشواناتھ کی سربراہی میں کیمرے کے پیچھے کھڑے تھے۔ "آپ نے پروفیسر فائز احمد کو کیوں قتل کیا۔؟" پہلا سوال ہی اس کی روح کو گھائل کر دینے والا تھا۔ وہ کیمرے کی طرف دیکھ کر وشواناتھ کی طرف دیکھنے لگا جس کے چہرے پر خباثت ٹپک رہی تھی۔

"میں نے اُنہیں قتل نہیں کیا...... وہ میرے محسن تھے۔ اس کی زبان سے یہ سن کر وشواناتھ ناک بھوئیں چڑھانے لگا اب کیمرہ آن تھا اور ریکارڈنگ بھی ہو رہی تھی اور جگہ کو خفیہ بھی رکھا جانا تھا اس لئے وہ صرف آنکھ کی گھرکی سے ہی کام چلا سکتا تھا۔ مگر کلیم اللہ سارا سچ عوام کے سامنے لانا چاہتا تھا۔

"میرے سوالوں کو سنجیدہ لو...... کیونکہ یہ صرف تمہاری ذات کا مسئلہ ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی سلامتی کا مسئلہ ہے" احمد حسن نے کہا تو کلیم اللہ بھڑک اُٹھا۔

"کس ملک کی بات کر رہے ہو؟ کس کی سلامت کی بات کرتے ہو؟ وہ ملک جو گذشتہ صدی سے مسلمانوں پر قیامتیں ڈھا رہا ہے۔ طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے مسلمانوں کو اذیت ناک موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ کشمیر میں اپنا اور اپنی افواج کا پیٹ بھرنے کے لئے مذاکرات کا کاروبار کیا جا رہا ہے۔ عزتیں لوٹنا اور مسلمانوں کی املاک کو تباہ کرنا جس ملک کی پالیسی ہے اس ملک کی سلامتی کی بات کر رہے ہو...... اس ملک کی بات کر رہے ہو جہاں مسلمان اپنی مرضی سے کوئی بھی

تہوار نہیں منا سکتا۔ گائے کی قربانی نہیں کر سکتا کہیں بھی راہ چلتے ہوئے نماز ادا نہیں کر سکتا۔ کسی بھی ادارے یا دفتر میں اعلیٰ افسر مسلمان نہیں بن سکتا۔ کوئی سیاستدان مسلمان حکومت نہیں بنا سکتا کس ملک کی بات کر رہے ہو؟۔ آج جو ہندو مسلم فسادات ہو رہے ہیں انکی وجہ میں نہیں ہوں بلکہ ایک ہندو ہے اس ملک کا ایک طاقتور ہندو۔ مگر میں الحمد اللہ مسلمان ہوں...... میں نے پروفیسر کا قتل نہیں کیا بلکہ اُنہوں نے میری ذات پر بہت بڑا احسان کیا تھا مجھے ہندو سے مسلمان بنایا مجھے اسلام کی راہوں سے آشنا کروایا۔ بس...... بس اسی بات کی اُنہیں سزا ملی ہے...... میں نے انہیں نہیں مارا...... میں ہندو نہیں ہوں...... مسلمان ہوں۔" اس نے روئے ہوئے کلمہ طیبہ کا ورد کرنا شروع کر دیا۔

تمام سپاہیوں پر سکوت طاری ہو گیا تھا احمد حسن بھی ان انکشافات کی توقع نہ رکھتا تھا وہ بھی لرز کر رہ گیا کیونکہ اُسے معلوم نہ تھا کہ کندن کلیم اللہ بن چکا ہے۔

"مجھ سے جو شخص انتقام لے رہا ہے میں اس کا نام بتا کر اُسے دنیا بھر میں ننگا نہیں کرنا چاہتا مگر اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے مضبوط ارادوں اور ایمان کو متزلزل کرنے والی اس کے پاس کوئی گھٹیا چال یا طاقت نہیں ہے"۔

کلیم اللہ کے ہونٹ متحرک ہو گئے تھے اس نے کلمہ طیبہ کا ورد کرنا شروع کر دیا تھا مگر احمد حسن پر لرزہ طاری ہونے والا تھا۔ اس نے کیمرہ اور لائٹ آف کرنے کا اشارہ کیا تو وشواناتھ کے اشارے پر سپاہیوں نے کلیم اللہ کو لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ احمد حسن کو فوراً تمام سامان سمیت باہر نکل جانے اور اس فلم کو سرعام چلانے سے پہلے سنسر کرنے کا سختی سے آرڈر دیا گیا تھا۔ اُسے کلیم اللہ کی حالات پر سخت افسوس ہونے لگا تھا مگر وہ بھی مجبور تھا لیکن اس نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے چینل کے مالک کو اس بات پر رضامند کرے گا کہ وہ اس فلم کو بغیر سنسر کئے ہی چلائے۔

"اس حرامزادے کو لاک اپ میں لے جاؤ اور ساری رات سونے نہ دینا۔" وشواناتھ نے زخموں سے چور چور کر کلیم اللہ کی طرف دیکھ کر سپاہیوں کو حکم دیا۔ تمام عملہ ہندوؤں پر مشتمل تھا مگر ایک کمزور سا سپاہی مسلمان تھا جو کہ انتہائی بزدل اور ڈرپوک تھا لیکن وہ ارادوں اور ایمان کا پکا تھا وہ کلیم اللہ کی حالت پر دل ہی دل میں کڑھتا تھا۔

کلیم اللہ کو بغیر کسی ایف آئی آر درج کئے ہی لاک اپ میں آج دوسرا دن تھا وہ گزشتہ دو راتوں سے سویا نہ تھا یا اُسے سونے نہ دیا گیا تھا اس کا سر درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا آنکھیں مسلسل کھلی رہنے کی وجہ سے سوج گئی تھیں۔ سخت سردی کے موسم کے باوجود بھی اس کی زبان سوکھ

کرکانٹا ہونے لگی تھی۔ اب اُسے کچھ دیر سکون کرنے کی اجازت ملی تو وہ زخموں کی پرواہ کئے بغیر ہی سو گیا تھا مگر چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ اُسے سپاہی رام چند کی آواز پر جاگنا پڑا۔ ”کندن!...... کندن...... اُٹھو...... تمہارے پتاجی آئے ہیں۔“ اس نے کندن (کلیم اللہ) کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی تھی اس بات کی پروا کئے بغیر کہ ہندوستان کا امیر ترین آدمی وہاں موجود تھا اور جس پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے وہ اس امیر آدمی کا لاڈلہ بیٹا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ظالم اور ظلم امیر آدمی کی میراث تھا۔ کلیم اللہ نے انگارہ بنی آنکھیں کھولیں تو سامنے پرساد چوپڑہ کا چہرہ دیکھ کر اس نے اپنے دماغ کو زبردستی حاضر کیا۔ ”کیوں بھئی مسلمان!“ چوپڑہ کی زبان نے طنزیہ زہر اُگلنا شروع کیا۔ کہاں ہے وہ...... وہ...... کیا کہتے ہو تم...... ہاں...... اللہ“ اس کی زبان نے گستاخی کا آغاز کیا تو کلیم اللہ کے دل پر نشتر چلنے لگے۔ ”بڑا دعویٰ کرتے تھے کہ وہ تمہاری مدد کرے گا“۔ چوپڑہ لاک اپ کے باہر ایک کرسی پر براجمان تھا ساتھ اس کا باڈی گارڈ نما بیٹا موہن بھی تھا ان تینوں باپ بیٹے کے علاوہ عملہ کا کوئی آدمی وہاں موجود نہ تھا یہ چوپڑہ کی دولت اور اپروچ کا ہلکا سا نمونہ تھا۔

”آواز دو...... اپنے اُس اللہ کو...... وہ تمہاری مدد کو آئے اور تمہیں چوپڑہ کے تشدد اور ظلم سے نجات دلائے۔“ اس کا قہقہہ بلند ہو گیا تو کلیم اللہ کی مریل سی آواز نکلی۔

”مم...... میں...... میں ہار گیا ہوں...... میں ہار گیا ہوں چوپڑہ صاحب“! چوپڑہ کا قہقہہ ٹوٹ گیا وہ حیرانگی سے کبھی موہن اور کبھی کلیم اللہ کو دیکھنے لگا پھر یکدم اس کے بلند و بانگ قہقہے سے تھانے کے در و دیوار ہلتے ہوئے محسوس ہوئے وشوانا تھ اور تمام عملہ حیرانگی سے چوپڑہ کے بلند قہقہوں کی گونج سے محظوظ ہونے لگا تھا سب کو اچھا خاصا روپیہ مل رہا تھا ان کے لئے چوپڑہ ان داتا اور بھگوان تھا اور بھگوان کی عزت ہر حال میں کی جاتی ہے۔

”بہت جلد لوٹ آئے ہو کندن“۔ وہ موہن کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”موہن! میں نے کہا نہیں تا کہ میرا خون اتنا گندا نہیں ہو سکتا کہ پرکھوں کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر نیا مذہب اپنا لے...... دیکھو...... دیکھ اس کو موہن...... یہ تمہارا بھائی کندن ہے...... جس کی غیرت اور مسلمانی نے دو دنوں میں ہی اکڑ فوں نکال دی......“ وہ پھر قہقہہ لگانے لگا۔

”میں نے کہا نہیں تھا کہ تم لوٹ کر آؤ گے کندن!...... بہر حال سورگ محل میں تمہارے شاندار استقبال کے لئے شاندار پارٹی ہو گی...... لیکن سچ پوچھو کندن!...... تو مجھے مزہ نہیں آیا......

کیونکہ مسلمانوں میں ایک ہی دشمن پیدا ہوا تھا اس نے پرساد چوپڑہ کے مذہب اور طاقت سے ٹکر لینے کی کوشش کی تھی...... چچ چچ چچ...... کمزور ایمان اور غربت...... مسلمانوں کی کمزوریاں ہیں جب چاہوں...... اپنی دولت کے بل بوتے پر تم جیسے لاکھوں کلیم اللہ خرید سکتا ہوں...... وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کلیم اللہ کے پاس پہنچ گیا باپ بیٹے کے درمیان سلاخوں کی دیوار حائل تھی۔ وہ دوبارہ گردن اکڑا اکڑ کر بولا۔ ”مسٹر کندن!...... یہ سب دھوکا ہے۔ مسلمانوں کا ڈھکوسلہ ہے...... کوئی اللہ نہیں ہے...... کوئی خدا نہیں ہے (نعوذ باللہ) بس وہی خدا ہے جو دکھائی دیتا ہے جو ہماری باتیں سنتا ہے جو ہماری ضروریات کو پورا کرتا ہے جس کے آگے ہم ہاتھ باندھ کر بنتی کرتے ہیں تو وہ ہماری بات سنتا ہے...... ہر گھر میں موجود ہے...... جس گھر میں بھگوان کی کوئی مورتی نہیں ہے وہ گھر دوزخ سے بھی بدتر ہے......“ وہ چیخ چیخ کر اپنے بھگوان کی خاصیت بیان کر رہا تھا کہ ان ہونی ہو گئی۔ جس بات کی توقع موہن چند اور پرساد چوپڑہ کبھی نہ کر سکتے تھے وہ فعل کلیم اللہ سے سرزد ہو گیا۔

پرساد چوپڑہ جوش جذبات میں سلاخوں کے بالکل قریب چلا گیا تھا کلیم اللہ نے دونوں ہاتھ باہر نکال کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور جھٹکا دے کر اس کا ماتھا سلاخوں سے ٹکرا دیا وہ چھ فٹ کا کڑیل جوان تھا اور پرساد چوپڑہ اپنی جوانی کا سفر کرتا ہوا کھٹارہ بس کی طرح بڑھاپے کی طرف بڑھ رہا تھا وہ جھٹکا نہ سہہ پایا اور اس کا ماتھا پھٹ گیا خون اس کے کپڑوں اور منہ کو تر کرنے لگا تو کلیم اللہ کی دھاڑ گونجی۔

”پرساد چوپڑہ!...... تم نے میری بات سنی نہیں اور اپنی بکواس کرنے لگے تھے...... میں نے اس دل اور زبان کو تمہاری عزت ہی کرتے رہنے کی تلقین کی تھی...... مگر تمہاری غلیظ زبان نے جو الفاظ میرے اللہ کے بارے میں کہے ہیں...... وہ سننے کے بعد میں اپنے دل اور زبان کے سامنے ہار گیا ہوں۔“ موہن کو جیسے یکدم ہوش آ گیا اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا وہ عملے کو بلا رہا تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ کلیم اللہ کی گرفت بہت سخت ہے۔ وہ پرساد چوپڑہ کو جھنجھوڑتا ہوا بولا۔

”میرے اللہ اور اس کے رسولؐ کے بارے میں اگر ایک بھی لفظ غلط نکالا تو چیر کر رکھ دوں گا پرساد چوپڑہ!...... تم کہتے تھے نا...... کہ اپنے اللہ کو بلاؤ...... وہ میری مدد کرے...... دیکھو......“ اس نے ایک اور جھٹکا دیا تو پرساد چوپڑہ کی سانسیں ناہموار ہونے لگیں! ”ہر طرف تمہیں میرا اللہ دکھائی دے گا...... میری مدد کو میرا اللہ آ گیا ہے...... وہ میرے دل میں ہے میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب...... تمہارے بھگوان کی طرح ہر طاق میں نہیں بیٹھا...... وہ کائنات کے ذرے ذرے

میں موجود ہے......" کلیم اللہ کی بات پوری ہونے ہی پہلے ہی بندوق کا زوردار بٹ اس کے سر کے پچھلے حصے پر پڑا تو اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔

موہن چند کا واویلا رنگ لایا تھا سپاہیوں نے جلدی سے لاک اپ کھول کر کلیم اللہ کو پیٹنا شروع کر دیا۔ دشوانا تھ باہر کھڑا چلا رہا تھا...... "مارو...... اس حرامزادے کو اور مارو......" سپاہی مفت کے کھانے کی طرح کلیم اللہ پر پل پڑے تھے وہ پیچھے سے اُسے کھینچتے تو پرساد چوپڑہ ھی جا کر سلاخوں سے ٹکراتا کیونکہ اس کا گریبان کلیم اللہ کے مضبوط ہاتھوں میں تھا پرساد چوپڑہ درد کی شدت سے کراہنے لگا تو دشوانا تھ نے آگے بڑھ کر کلیم اللہ کے ہاتھوں کو سگریٹ سے داغنا شروع کر دیا۔

تکلیف کی شدت سے اس کی سسکاریاں نکلنے لگیں۔ اس نے پرساد چوپڑہ کا کالر چھوڑ دیا تو سپاہیوں نے اُسے لاتوں اور بندوقوں کے بٹ مارنا شروع کر دیئے۔

"پرساد چوپڑہ! تمہارا دشمن کمزور ایمان والا نہیں ہے...... یاد رکھو...... جیت میری ہوگی۔ غربت اور ایمان کی فتح ہوگی۔۔۔" وہ سپاہیوں کے نرغے میں گھرا بول رہا تھا مگر تھوڑی دیر بعد اس کی بولتی بند ہوگئی وہ بے ہوش ہوگیا تھا جبکہ حیرت اور پھٹی پھٹی آنکھوں والے پرساد چوپڑہ کو دشوانا تھ اور موہن جلدی سے وہاں سے نکال کر لے گئے۔

☆☆☆

اختر علی کی طبیعت قدرے سنبھل گئی تھی مگر بیٹی کو کم عمری میں طلاق یافتہ کا لیبل لگ جانے کا اس کے دل کو بہت رنج تھا۔ وہ ہسپتال سے گھر شفٹ ہوگیا تھا وہ اپنے کمرے میں لیٹا چھت کو گھورتا رہتا تھا اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی بس کبھی کبھی احمد سے بات کر لیتا تھا۔ اس نے احتل اور فریحہ سے بات کرنا بھی ترک کر دیا تھا۔ احمد نے بہت زور لگایا تھا کہ وہ اس کے ساتھ اس کے گھر میں رہے تا کہ آمنہ اس کی خدمت کر سکے۔ مگر اختر علی نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ ابھی وہ احمد اور آمنہ کی شادی کو احتل اور دوسرے گھر والوں پر ڈیکلیئر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آمنہ بھی ہسپتال میں احتل کی غیر موجودگی میں اس کی خیریت دریافت کر گئی تھی۔ فریحہ کی شادی اتنی جلدی ناکام ہونے کا اُسے بھی افسوس تھا۔ اختر علی نے اُسے حوصلہ دیا تھا اور سمجھایا تھا کہ وہ احتل سے بچ کر رہے۔ احمد اور آمنہ اس بات کی بہت کوشش کرتے تھے کہ احتل اور کسی گھر والے کو ان کی شادی کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلے وہ اس کام میں کامیاب بھی رہے تھے۔

آمنہ نے احمد کے منع کرنے کے باوجود بھی عائشہ بی بی کو بتا دیا تھا کہ ماموں اختر علی کی طبیعت

خراب ہے اب وہ ہسپتال سے گھر شفٹ ہوگئے ہیں۔ عائشہ بی بی نے ابراہیم کو بھی مجبور کیا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ اختر علی کا حال احوال معلوم کرنے چلے وہ جگنو کو سمجھا بجھا کر گھر سے روانہ ہوگئے۔

"عائشہ!" ابراہیم نے انجانے خوف اور وسوسوں کو ذہن سے نکال لینا چاہا۔ "ہم لوگوں کے جانے سے احتل کے قیمتی صوفے اور قیمتی قالین نہ خراب ہو جائیں۔" عائشہ بی بی معاملہ فہم اور سمجھدار عورت تھیں۔ شوہر کے کرب کو بخوبی سمجھتی تھیں۔ ابراہیم کے الفاظ کرب کی لکیریں بن کر اس کے چہرے کی جھریوں میں اضافہ کر گئے تھے۔

"ہم احتل سے کوئی بات نہیں کریں گے"۔ وہ رکشے میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "بس ایک نظر میں اختر علی کو دیکھ لوں تو میری جان کو سکون ہو جائے گا...... بچوں کی طرح پالا ہے ہم نے اُسے۔۔۔ ہمیں احتل سے کیا لینا دینا"؟

"میرے خس و خاشاک کے وجود میں چند تنکے ہی بچے ہیں جو عزت اور آبرو کو قائم رکھے ہوئے ہیں...... میں ان تنکوں کے سہارے ہی زندگی گزار رہا ہوں" چلتے ہوئے رکشہ میں ابراہیم کی آواز مزید لڑکھڑائی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اختر علی کے گھر کے سامنے پہنچ کر رُک گئے رکشے والے کو فارغ کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ بیل پر اُنگلی رکھ دی۔ چوکیدار نے چھوٹی کھڑکی سے دیکھ کر گیٹ کھول دیا بلکہ اس نے عائشہ بی بی کو سلام بھی کیا اس کا اُنہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

بڑے سے ہال میں ہی ان کا سامنا گھر کی مالکن احتل سے ہوگیا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر ناک بھوں سکیڑنے لگی۔ "اسلام علیکم"! عائشہ بی بی نے پہل کی مگر احتل نے جواب دینے کی بجائے ملازم کو آواز دی تو ابراہیم کی کنپٹی سرخ ہونے لگی وہ ذہنی طور پر تیار ہوگیا تھا کہ ایک بار پھر بے عزتی ہونے والی ہے۔ مگر خیریت ہی رہی۔ ملازم کے آنے پر احتل نے اس سے بڑی رعونت سے کہا۔

"ان کو صاحب کے کمرے میں پہنچا دو!" اور خود ایک طرف بڑھ گئی اسکا لباس چال ڈھال اور بولنے کا انداز پر غرور اور تکبرانہ انداز سے بھرپور تھا۔ دونوں میاں بیوی ملازم کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ایک کمرے تک پہنچے تو اس نے اشارہ سے بتا دیا کہ صاحب اندر ہیں۔ عائشہ بی بی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ان دونوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اختر علی کی اندر سے آواز آئی "دروازہ کھلا ہے آجا جی۔" عائشہ نے ابراہیم کی طرف دیکھا اور دونوں اندر داخل ہوگئے تو بیڈ پر لیٹے ہوئے اختر علی کو دیکھ کر عائشہ بی بی کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ اپنے بھائی کو بیماری کی حالت میں دیکھ کر پریشان ہوگئیں تھیں۔

''میں آپ کے قدموں کی آہٹ اور آپ کے وجود کی خوشبو بہت دور سے محسوس کر لیتا ہوں۔'' اختر علی کی آنکھیں بھی ماں جیسی بہن کو دیکھ کر روشن ہونے لگی تھیں۔

عائشہ بی بی کی گردن فخر سے تن گئی تھی وہ اختر علی کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے بولیں۔

''اتنی بیماری آ گئی کہ بہن کو اطلاع کرنا بھی گوارا نہیں کیا؟'' ان کی بات میں پیار بھرا شکوہ تھا ابراہیم نے بھی اختر علی سے ہاتھ ملایا اور بیڈ کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا عائشہ بی بی بیڈ کے کنارے پر ہی بیٹھ گئی تھیں۔

''میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا...... میرا خیال ہے احمد نے آپ لوگوں کو بتایا ہوگا۔'' اختر علی تھوڑا سا کمر کو اونچا کرتے ہوئے بولا تو تکلیف اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی تھی اس نے آنکھیں سختی سے موندلیں تو عائشہ بی بی نے اس کا ہاتھ تھام کر اُسے تسلی دی۔

''تم جلدی اچھے بھلے ہو جاؤ گے...... کونسا روگ لگا رہے ہو اختر علی...... تم تو کبھی بھی چھوٹی چھوٹی بات کو دل پر نہیں لیتے تھے...... اب ایسا کیا ہو گیا کہ تم بستر پر جا لگے ہو؟ ابراہیم نے کہا تو وہ دُکھ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا ذہن اس آواز میں کھونے لگا جو دانیال نے فریحہ کو کہی تھی۔

''طلاق طلاق طلاق'' کے الفاظ نے اختر علی کے چہرے پر کرب کی ایک اور لکیر کا اضافہ کر دیا تھا۔

''آپا!...... فریحہ کو طلاق ہو گئی ہے۔ اس خبر کی بجلی نے ابراہیم اور اختر علی کو زوردار جھٹکا لگایا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے ابھی دیر ہی کتنی ہوئی تھی اس کی شادی کو...... اور پھر طلاق کا لیبل ماتھے پر لگ گیا تھا۔ ''اپنے افسوس کا اظہار کیسے کروں اختر علی!'' وہ تاسف سے بولی تھیں ان کے الفاظ دُکھ اور کرب کا جامہ اوڑھے ہوئے تھے۔ ''یہ دکھ بھری خبر یقیناً ماں باپ کے لئے بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے میں تمہاری بیماری کی وجہ جان گئی ہوں......'' ابراہیم بھی اس موقع پر مناسب الفاظ تلاش کر رہا تھا جبکہ طلاق کی خبر سنا کر اختر علی کی آنکھیں ساون برسانے لگی تھیں۔

''میں نے سنا ہے کہ جس شخص کو کوئی تکلیف یا ایذا نہ پہنچے تو سمجھو اس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔۔۔ اختر علی!...... تمہارا صدمہ بڑا ہے اور میرا منہ میرے الفاظ کی طرح چھوٹا ہے۔'' ابراہیم کے اندر بیٹھا ہوا فلاسفر باہر نکلنے لگا تھا۔ ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں اتنے بڑے صدمے سے یونہی دوچار نہیں کیا...... اس میں اس کی ضرور کوئی مصلحت اور حکمت ہو گئی کیونکہ جو کام اور جو بات ہماری سمجھ میں نہ آئے وہی تقدیر ہوتی ہے...... جو ہم سمجھ جائیں اور کر جائیں وہ ہماری مرضی ہوتی ہے۔ اللہ تمہیں اس دکھ کو برداشت کرنے کی توفیق اور ہمت دے''۔

اختر علی ہمیشہ سے ابراہیم کے فلسفیانہ ذہن کا گرویدہ تھا اب بھی اس نے اچھے الفاظ میں اس دُکھ کو سہنے کی تلقین کی تھی کہ اختر علی کا ذہن ہلکا ہو گیا تھا...... اتنی دیر میں ملازم چائے لے کر آ گیا...... وہ چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ احمد اور آمنہ اس وقت اپنے الگ گھر میں تھے وہ بھی اختر علی کی بیماری سے پریشان تھے۔

''احمد...... احمد صاحب؟'' آمنہ کے دوبارہ پکارنے پر احمد کی سوچ کا دائرہ ٹوٹا تو اس نے چونک کر آمنہ کی طرف دیکھا جو ہلکے سے پنک کلر کے شلوار قمیض میں بلا کی حسین لگ رہی تھی وہ چائے کے کپ پکڑے احمد کو پکار رہی تھی۔

''جناب کی چائے!'' اس نے شوخی سے کہا اور کپ ٹیبل پر رکھتی ہوئی احمد کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ احمد اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''آمنہ!''

''ہوں۔'' اس نے اپنا سر آہستگی سے احمد کے کندھے پر ٹکا دیا تھا۔

''تقدیر انسان پر جب مہربان ہوتی ہے تو اس کی توقع اور سوچ سے بھی زیادہ اُسے نوازتی ہے۔۔۔ سن رہی ہو نا''؟ اس نے اپنی کہی ہوئی بات کا ہنکارہ آمنہ سے لینا چاہا...... آیا کہ وہ اس کی بات سن بھی رہی ہے یا نہیں۔ ''فرمایئے حضور!...... بندی ہمہ تن گوش ہے۔'' پرخلوص الفاظ اور محبت بھرے انداز نے احمد کا دل جیت لیا تھا وہ اس کی دراز زلفوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا بولا۔ ''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ...... اگر ہم ایک دوسرے کے لئے ہی بنے تھے تو پھر تقدیر نے ہمیں اتنا عرصہ ایک دوسرے سے دور کیسے اور کیوں رکھا؟'' آمنہ نے چائے اُٹھا کر احمد کو تھما دی اور بولی۔

''تقدیر کے فیصلے انسان کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں...... اگر ہمارے درمیان دولت اور تمہاری تعلیم کی دیوار نہ ہوتی تو شائد ہم دونوں ایک دوسرے کو وہ محبت اور پیار نہ دے سکتے...... جواب دے رہے ہیں''۔ وہ چائے کی چسکی لیتا ہوا بولا۔

''میں نے چائے کی چسکی لی ہے۔

''چینی پہلے ہی زیادہ ہے...... چھوڑو مجھے......''

وہ اس کے ہاتھوں میں کسمسائی مگر احمد کی گرفت مضبوط تھی اور اس کے ہونٹوں نے محبت کی مہر اس کے خوبصورت ہونٹوں پر ثبت کر دی تھی۔

''ہوں...... اب کچھ ٹھیک ہے۔'' وہ چائے کی چسکی لیتا ہوا بولا تو آمنہ اس کی طرف محبت

سے دیکھنے لگی۔

"میں بھی اکیلی تھی اور آپ بھی...... اللہ کی قدرت ہے کہ ہم دو ہوئے...... اور پھر...... اب......" احمد نے اس کی طرف تشویش بھرے انداز میں دیکھا تو وہ بات ادھوری چھوڑ کر شرما گئی اور اپنے چہرے کو ہاتھوں کے کٹورے میں چھپالیا۔ "ارے...... نہیں یار......" وہ یقین نہ آنے والے انداز میں آمنہ کے ہاتھ الگ کرتے ہوئے چاند سے چہرے کو جھک کر دیکھنے لگا۔ "واقعی...... اوہ مائی اڈ...... اتنی بڑی خوش خبری...... اللہ...... اللہ تیرا شکر ہے۔" اس نے دیوانوں کی طرح آمنہ کو اپنے بازوؤں کے حصار میں کس لیا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

"احمد...... کیا ہوگیا ہے آپ کو...... کچھ اس معصوم کو تو خیال کیجئے۔ ہٹائیے ہاتھ۔" وہ احمد کے حصار سے نکل گئی تو وہ مسکراتا ہوا بولا۔ "بڑے بدمعاش ہو بھئی دُنیا میں آنے سے پہلے ہی میری بیوی مجھ سے چھین لی۔"

"آپکی بیوی کو آپ سے کوئی نہیں چھین سکتا...... یہ بھی نہیں۔" وہ اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"ہمیں یہ خوش خبری پھوپھو کو سنانی چاہیئے۔" احمد پر جوش انداز میں بولا تو آمنہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا تو وہ اپنی ہنسی ضبط کرتی ہوئی بولی۔

"اماں کو پتہ ہے...... میں ان کے ساتھ ہی تو لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔"

"پھر...... پھر پھر...... کیا کہا پھوپھو نے......" احمد تجسس سے بولا۔ "میرے بارے میں......"

"بدمعاش۔" آمنہ نے ایک لفظ ادا کر کے ہنسنا شروع کر دیا تو احمد نے اُسے ایک بار پھر بازوؤں میں بھر لیا۔

"میں ابو کو بتاؤں گا...... وہ کتنے خوش ہونگے۔ اس کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔"

"ہاں احمد...... آج ہم پر جو بھی اللہ کا کرم ہوا ہے ان کی محبت اور شفقت سے ہی ممکن ہوا ہے۔" آمنہ کو وہ دن یاد آ گئے تھے جب اختر علی نے ان کی شادی کیلئے اماں کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ "مگر خیال رہے کہ اس بات کا آپ کی امی کو پتہ نہ چلے۔" آمنہ کی رنگت یکدم زرد ہو گئی تھی۔

احمد نے اس کی پیشانی پر محبت سے بوسہ دیا اور بولا

"پگلی مت بنو!...... احمد صرف تمہارے لیئے بنا تھا اور تمہارا ہی رہے گا...... ممی کو کبھی پتہ نہیں چلے گا کہ تم میری بیوی ہو۔"

"مجھے خود پر اور آپ کی محبت پر اعتماد ہے۔" آمنہ کی مسکراہٹ لوٹ آئی تھی۔

"اُف بھئی! باتوں ہی باتوں میں چائے ٹھنڈی ہوگئی۔ خیر بات تو خوشی کی تھی...... اب میں تمہیں کوئی بھی زحمت نہیں دونگا۔" یہ کہہ کر اس نے چائے کو ایک ہی گھونٹ میں ختم کر لیا۔ دونوں مسکرانے لگے۔

"تم اپنا اور اس کا خیال رکھنا...... میں ذرا آفس جا رہا ہوں اور واپسی پر ابو کی عیادت بھی کرتا آؤنگا اور یہ پیاری سی خوش خبری بھی سناتا آؤں گا۔" وہ آمنہ کے گالوں پر محبت کی مہر ثبت کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

دانیال اس کا کلاس فیلو تھا مگر محبت کے بعد اس کی زندگی بن گیا تھا فریحہ نے اختر علی اور احتل کے ساتھ ساتھ احمد اور عاصم کو بھی اموشنل بلیک میل کر کے اپنی پسند اور مرضی سے شادی کروائی تھی۔ دھوم دھام سے ہونیوالی شادی تو پائیدار نہ ہوسکی مگر ان دونوں کی محبت پائیدار اور مضبوط تھی۔ طلاق دینے کے بعد دانیال کو اپنی گرم جوشی اور جلد بازی کا احساس ہوگیا تھا اور پھر اس کے باپ اور ماں نے بھی اس غلط فیصلے پر اس کی سرزنش کی تھی۔

فریحہ کو ابارشن کروانے اور اپنی ممی کی بات ماننے کی سزا مل رہی تھی وہ دانیال کی جدائی میں رونے لگی تھی جب احتل اس کی اداسی اور روئی ہوئی آنکھوں کا مدعا جاننے کی کوشش کرتی تو وہ بات ٹال دیتی۔ مگر ایک خلا جو پیدا ہوگیا تھا وہ اب کبھی بھی پورا نہ ہوسکتا تھا۔ دونوں خاندان ہی پریشانی اور اداسی کا شکار ہوگئے تھے۔

اختر علی بیٹی کی طلاق کا صدمہ لیکر بستر سے جالگا تھا۔ فریحہ نے گھر کا کونہ سنبھال لیا تھا۔ احمد نے اپنی مرضی سے آمنہ سے شادی کر کے اختر علی کے علاوہ تمام کو بے خبر رکھا تھا۔ عاصم اور چندا اپنی شادی کی پلاننگ میں مصروف تھے ان کو کوئی پریشانی نہ تھی مگر فریحہ کو دانیال کے ساتھ ایک بیوی کی حیثیت سے گزرا ہوا وقت یاد آتا تو کبھی کالج کے وہ سنہری دِن یاد آنے لگتے جب وہ دانیال سے پہلی مرتبہ ملی تھی۔

دانیال نے بھی اپنے غلط فیصلے پر پچھتانا شروع کر دیا تھا اس کے کام اور گھر میں دِل نہ لگتا تھا وہ گھنٹوں اپنے کمرے میں لیٹا چھت کو گھورتا رہتا اور کبھی کبھار بلاوجہ ہی لانگ ڈرائیو پر نکل جاتا تو کبھی ساحل سمندر پر آنے جانے والی لہروں کو دیکھتا رہتا۔ وہ لہریں کتنی دور اور کتنی محبت سے ساحل سے ملنے آتی تھیں اور پھر واپس لوٹ جاتی تھیں۔ مگر اس نے تو حاصل کی ہوئی فریحہ کو کھو دیا تھا۔

اُسے خود ہی گنوادیا تھا۔ اُسے تحمل اور صبر سے کام لینا چاہیئے تھا۔ مگر امتل نے اس کی ممی کو برا بھلا کہا تھا۔ لیکن دانیال نے بھی امتل کو بُرا بھلا کہہ لیا تھا۔ اُسے کوئی بھی تلخ بات نہیں کرنی چاہیئے تھی اور خاص کر طلاق کی بات تو کرنی درکنار اُسے اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیئے تھا۔ اس نے اپنی غلطی پر پچھتانے کی بجائے اس کا تاوان ادا کرنے کا سوچا۔ اس کوتاہی کا کچھ تو مداوا ہوگا۔ کوئی تو کفارہ ہوگا۔ ہمارے قرآن کریم میں ہر مشکل اور پریشانی کا حل ہے۔ میری پریشانی اور مشکل کا حل بھی ہوگا اس سلسلے میں لازماً کسی عالم دین سے بات کرنی چاہیئے۔ اس نے سوچا اور ذہن میں پلان بنانا شروع کر دیا۔

''زبیدہ بیگم! مجھ سے دانیال کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔'' وقار عظیم نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا وہ اس وقت اپنے گھر کے لان میں کرسیوں پر بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر اکلوتے بیٹے کی وجہ سے کافی پریشان بھی تھے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتی ہوئی بولیں۔ ''کم عمری کی شادی بمشکل ہی اچھا انجام پاتی ہے۔'' ان کی بات پر وقار عظیم ان کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ ''جوانی کے عالم میں خون کو گرم رکھنا ضروری تو ہے مگر اُسے اچھل کر باہر نہیں آنے دینا چاہیئے۔ دانیال نے جذبات میں آ کر جو غلطی کر لی ہے اس کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑے گا۔'' ان کی باتوں سے اداسی جھلک رہی تھی۔ وقار عظیم نے چائے کا ایک اور گھونٹ بھرا۔

''میں آپ کی بات اور پریشانی سمجھتا ہوں۔ کاروبار کی بگڑتی ہوئی صورت حال اور دانیال کی گرتی ہوئی صحت اور ہما بیٹی کے رشتے کا بھی مسئلہ بن جائے گا۔'' وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

''میں نے دانیال سے بات کی ہے۔'' زبیدہ بیگم کی آواز پر وقار عظیم چونک گئے۔

''کس سلسلے میں؟''

''فریحہ کے معاملہ پر...... میں چاہتی ہوں کہ وہ اس بڑے صدمے سے نکل آئے۔''

''پھر...... اس نے کیا کہا؟''

''اُس نے جو کہا...... کیا ایسا ممکن ہے؟'' زبیدہ بیگم شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے چائے پینے لگیں مگر ان کی بات نے وقار عظیم کے خون کو جوش دلا دیا تھا وہ تڑپنے والے انداز میں بولے۔

''بات کھل کر کرو زبیدہ بیگم! میری برداشت اور صبر کا امتحان مت لو!'' ان کے ہاتھوں میں پکڑا ہوا کپ وہیں ٹھہر گیا تھا وہ شروع دن سے زبیدہ بیگم کی اس پہیلی والی عادت سے خائف تھے۔

چائے بھی ٹھنڈی ہوگئی تھی۔

''وہ دوبارہ شادی کرنا چاہتا تھا۔'' زبیدہ بیگم نے اپنی چائے ختم کر لی تھی مگر ان کی یہ بات وقار عظیم کو خاص اچھی نہ لگی تھی کیونکہ وہ بھی تو خود چاہتے تھے کہ دانیال جلدی سے اپنا گھر بسا لے تا کہ وہ پریشانی اور اداسی کے پیرہن سے باہر نکل آئے اتنی سی بات کو زبیدہ بیگم نے طول دیکر چائے کا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔ وہ کپ اپنے ہونٹوں کو لگاتے ہوئے کچھ کہنے ہی والے تھے کہ زبیدہ بیگم نے ان کی چلتی ہوئی سانسیں ایک جگہ ہی ٹھہرا دیں۔

''دوبارہ فریحہ سے شادی!'' ان کو ٹھنڈی چائے یکدم گرم لگنے لگی ان کے حلق سے نیچے جانے والے گھونٹ نے تمام بدن میں آگ بھر دی تھی۔ ان کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا وہ ٹک ٹک بیگم کو دیکھتے جا رہے تھے ان کے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ الفاظ کا خزانہ ختم ہو گیا تھا۔ موبائل فون کی گھنٹی نے اُنہیں چونکنے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

''آئی ایم ساری فریحہ!'' دانیال نے فریحہ کو اس وقت ایک اچھے سے ریستوران میں بلایا تھا۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ ایک بار دانیال سے مل لے وہ بھاگم بھاگ پہنچی تھی۔ ''دراصل مجھے اس طرح طیش میں نہیں آنا چاہیئے تھا۔'' وہ شرمندگی ظاہر کر رہا تھا فریحہ کے چہرے سے بھی ندامت جھلک رہی تھی اور پھر موسم بھی اُس وقت سہانا ہو رہا تھا ہلکی ہلکی بارش کی پھوار نے ان کے ارمانوں کو جگا دیا تھا۔ موسم میں خنکی بڑھنے لگی تھی مگر ریستوران کے اندر کا ماحول گرم تھا۔ ہیٹر اور پھر گرم گرم کافی نے سردی بتدریج کم کر دی تھی۔ ''دراصل ممی کی بھی غلطی تھی اُنہیں آنٹی کے بارے میں ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا۔'' فریحہ کی بھی ندامت بھری آواز نے دانیال کو کافی حوصلہ دیا وہ بات آگے بڑھاتا ہوا بولا۔

''کبھی بھنورے کو پھول سے۔ خوشبو کو کلی سے۔ چندا کو چاندنی اور لہروں کو ساحل سے جدا ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟''

دانیال کی اس خوبصورت بات پر وہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ''یہ تمام چیزیں کائنات کی زندگی کا احساس دلاتی ہیں۔ چند لمحوں کیلئے ایک دوسرے سے جدا ضرور ہوتی ہیں مگر قدرت کا نظام دیکھو...... اگر ان کی جدائی برقرار رہے تو زندگی کا نظام مفلوج ہو جائے۔ ان کا دوبارہ ملاپ اتنا ہی ضروری ہے جتنا زندہ رہنے کیلئے سانس!'' دانیال نے بڑے اچھے پیرائے میں الفاظ ادا کر کے اپنی بات فریحہ کے دِل و دماغ میں ڈال دی تھی۔ فریحہ کے دِل میں اس کی محبت نے انگڑائی لی تو وہ بے

چین ہو کر دانیال کا ہاتھ پکڑتی ہوئی بولی۔

''دانی...... میں بھی اس جدائی میں اتنی ہی قصوروار ہوں جتنا ممی ہیں...... میں بھی بچے کو جنم نہیں دینا چاہتی تھی۔

دانی! آئی ایم ساری...... پلیز...... کچھ کرو...... مجھے پہلے ہی ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھانا چاہیے تھا جس سے تمہیں تکلیف ہوئی...... اور۔ ہماری محبت اس طرح ہماری بے بسی پر آنسو بہاتی۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگئی۔

''فری!...... کیا تم دوبارہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟'' دانیال نے دِل کی بات زبان سے ادا کی تو فریحہ کے دِل کی دُنیا روشن ہوگئی۔ وہ تو خود منہ سے اقرار کرنا چاہتی تھی۔ ان الفاظ کو ادا کرنے کیلئے لفظوں کا سہارا ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر دانیال نے اس کی مشکل حل کر کے اس کا دِل ایک بار پھر جیت لیا تھا اور اپنی محبت کا تاج ایک بار پھر اپنے سر سے اتار کر فریحہ کے سر پر رکھ دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اُسے اپنے دِل کی ملکہ بنانا چاہتا تھا۔ دِل کے سجے ہوئے فریم میں اس کی تصویر سے گرد صاف کر کے اس کی پوجا کرنا چاہتا تھا۔

''دیکھو فری! میں نے دِل کی گہرائیوں سے تمہیں چاہا ہے...... میں نے تمہاری جدائی میں ایک ایک رات کانٹوں پر گزاری ہے۔'' اس کے جذبات کی ترجمانی اس کا چہرہ کر رہا تھا اور پھر بارش نے بھی اس کے دِل کے موسم کو گواہی دینے کیلئے پیہم رم جھم کی صورت برسنا شروع کر دیا تھا۔ ''مگر تم بھی کوئی حل سوچو...... ہمارا مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ طلاق دینے کے بعد وہی میاں بیوی دوبارہ عدالت میں نکاح کر لیں۔'' دانی کی زبانی سن کر فریحہ کو اچنبھا ہوا۔

''میں سمجھی نہیں!؟'' وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ دانیال گہری سانس لیتا ہوا بولا۔

''اس کا حل ہے ایک۔'' وہ جان بوجھ کر خاموش ہوا تو فریحہ نے اس کے ہاتھ بے چینی سے تھام لیئے۔

''مجھے ہر حل قبول ہے۔ ہر شرط منظور ہے...... میں نے تڑپ تڑپ کر تمہارے بنا چند دن اس طرح گزارے ہیں کہ جیسے...... ایک ایک پل صدی بن گیا ہو......''

''حلالہ!'' دانیال کے منہ سے مختصر سا جواب سن کر وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں سمجھی نہیں...... حلالہ!؟'' وہ واقعی اسلامی تعلیمات سے نابلد تھی۔ اعلیٰ سوسائٹی اور اعلیٰ تعلیم نے اُسے کبھی موقع ہی نہ دیا تھا کہ وہ قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتی یا اسلامی تعلیمات

کا مطالعہ کرتی۔

''طلاق یافتہ جوڑے کو دوبارہ نکاح کرنے سے پہلے عورت کو کسی اور مرد سے نکاح کرنا پڑتا ہے اور پھر شریعت اور قانون کے مطابق اس مرد سے میاں بیوی کا ازدواجی تعلق قائم کرنا ہوتا ہے۔ پھر طلاق کے بعد عدت کی مدت پوری ہونے کے بعد وہ دوبارہ اپنے پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے...... اسے حلالہ کہتے ہیں۔'' وہ دانیال کے منہ سے حلالہ کے متعلق سن کر گنگ رہ گئی۔ وہ باہر تیز بارش کی طرف دیکھنے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ چند لمحوں قبل برسنے اور اچھی لگنے والی بارش نے اس کے کچے مکان کی چھت میں سوراخ کر دیا ہو۔ اور اب اس مکان کی کچی دیواریں بھی بارش کے پانی سے گھل گئی ہوں۔ اُس نے کسی اُمید پر دانیال کی طرف دیکھا اور کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا ہی تھا کہ تیز بارش کے ساتھ بجلی کی کڑک نے اُسے کہنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے دانیال کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیئے اور ہوٹل کے دروازے سے باہر برستی ہوئی بارش کو دیکھتی ہوئی بولی۔ ''اگر وہ شخص ازدواجی تعلق قائم کرنے کے بعد طلاق نہ دے تو......؟'' اس سے آگے وہ صرف سوچ کر ہی رہ گئی۔ دانیال نے اس کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے کہا۔

''میری طرف دیکھو فری!'' وہ دانیال کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی اپنی آنکھوں کی نمی کو چھپا نہ سکی! ''ہمارے پاس اللہ کا دیا ہوا بہت کچھ ہے...... اس ملک میں بہت سے ایسے شخص مل جائیں گے جو چند راتوں کیلئے اپنی مجبوریاں ہمیں بیچ دیں گے اور ہم خریدنے کیلئے دولت کی ریل پیل اس کے قدموں میں کر دیں گے۔'' اس کی بات سن کر فریحہ کو کچھ حوصلہ ہوا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس ملک میں ہر شخص بکتا ہے اور ہر دوسرا یا تیسرا شخص اس کی مجبوریوں کا خریدار ہے بس بولی درست لگانے کی بات ہے اور دانیال تو کاروباری بندہ تھا وہ تو ایسے سودے کو اچھی طرح نبھا سکتا تھا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی باہوش...... یعنی چالاک آدمی کی بجائے کسی ایسے شخص سے سودا بازی کریں جو چند ہزار روپوں کو ہی اپنا ایمان سمجھتا ہو۔'' فریحہ کی پرجوش آواز نے دانیال کو بھی حوصلہ بخشا کہ اب فریحہ بھی اس سے تعاون کرے گی اور ان کی شادی دوبارہ کامیاب ہوگی اور وہ زندگی میں کبھی بھی اس غلطی کو دہرانے کی غلطی نہیں کریں گے۔

''تمہارا مطلب ہے...... کوئی فقیر...... یا پھر کوئی لولا لنگڑا...... یا کوئی بہت ہی مجبور شخص؟''

''ہاں دانیال!'' وہ دروازے سے پرے برستی ہوئی بارش کو دیکھتی ہوئی بولی۔ ''جس شخص کو

کل میری شکل وصورت بھی یاد نہ ہو..... تا کہ اگر زندگی میں کبھی اس سے آمنا سامنا بھی ہو جائے تو مجھے شرمندگی نہ اُٹھانا پڑے۔'' دانیال اس کی مجبوری سمجھتا ہوا بولا۔

''تم فکر نہ کرو۔ ہماری نیت صاف ہے تو ضرور کامیاب ہونگے۔'' بارش کچھ کم ہو گئی تھی اور ٹریفک بھی رواں دواں نظر آ رہی تھی۔ ''اگر تم کہو تو میں تمہیں گھر ڈراپ کر دوں؟'' اس سے پہلے اُسے فریحہ سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی مگر وہ اب اس کی بیوی نہ تھی۔

''ہاں! میں بھی یہی چاہتی تھی.....'' وہ اُٹھتی ہوئی بولی! ''دانی! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔'' اس نے میز سے گاڑی کی چابی اُٹھائی اور مسکراتا ہوا بولا۔ ''میں جانتا ہوں۔'' بل ادا کرنے کے بعد وہ دونوں باہر نکلے تو موسم کافی سرد ہو گیا تھا موسم کی شدت کا اندازہ ریستوران کے بند ہال میں نہ لگایا جا سکتا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کا سرد جھونکا آیا تو فریحہ نے اپنے آپ کو دانیال کے ساتھ اس کی بانہوں میں سمیٹنا چاہا مگر ٹھٹھک کر رہ گئی۔

گاڑی اختر علی کے گھر کی جانب سبک رفتاری سے بڑھ رہی تھی کہ ونڈ سکرین پر چلتے ہوئے وائپرز سے آگے ایک جھلّے کو دیکھ کر دانیال کو یکدم بریک لگانے پڑے کیونکہ وہ یکدم گاڑی کے سامنے آ گیا تھا۔ اس کی معصوم نظریں گاڑی کی اگلی نشست پر پڑیں تو اس کی آنکھوں میں یکدم روشنی جگمگانے لگی۔ اس کے ہونٹ متحرک ہوئے اور ایک نام نکلا ''فریحہ!'' مگر گاڑی کے اندر بیٹھی فریحہ اس نام کو بارش کے شور اور بند شیشوں کی وجہ سے سن نہ سکی! دانیال تو گھبرا گیا تھا مگر اس جھلے کے بچ جانے پر اس نے فریحہ کی طرف دیکھا تو وہ باہر کھوئی ہوئی تھی۔

''ہیلو میڈم!'' اس نے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ لہرایا۔ ''کہاں کھو گئی ہو؟'' فریحہ اپنی محویت توڑتی ہوئی چونک کر دانیال کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''جگنو!'' مگر دانیال کی سماعت کیلئے یہ نام نیا تھا۔ وہ حیرت واستعجاب سے فریحہ کو دیکھ رہا تھا۔ ''جگنو؟..... میڈم اتنی بارش میں جگنو کہاں سے آ گئے؟'' اس نے گاڑی آگے بڑھا لی۔ ''یہ جگنو تھا۔'' فریحہ کھوئی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میرا فرسٹ کزن۔ پھوپھی زاد۔ کملا اور جھلا..... پیسے کا طلبگار بھی ہے..... ہمارے کام آ سکتا ہے۔'' دانیال کے پاؤں ایکسیلیٹر سے ہٹ کر بریک پر پڑے تو ٹائروں کے چرچرانے کی آواز گاڑی کے اندر بھی محسوس ہوئی۔ دانیال اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

ابراہیم کو کھانسی کی شدت کا احساس ہوا تو وہ جگنو کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ بارش کی زیادتی کے باوجود بھی وہ اپنی بیماری کو جلد ہی کور کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کی بیماری طول پکڑ گئی تو وہ بستر پر جا لگے گا اور پھر اس گھر کو کون چلائے گا۔ عفی تو نجانے کہاں کھو گیا تھا۔ جگنو اتنی سوجھ بوجھ نہ رکھتا تھا کہ گھر گرہستی کو اچھے طریقے سے چلا چکے۔ اس نے بارش کی پرواہ نہ کی اور ڈاکٹر کے پاس جا پہنچا۔ اچھی طرح چیک کرنے کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ خشک کھانسی تھی جواب بارش کے بعد ختم ہو جائیگی۔ کیونکہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے اکثر لوگوں کے گلے میں خراش اور سوزش کی شکائیت پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے کھانسی کا مرض پھیل گیا تھا۔

ڈاکٹر نے ایک پرچی پر دوائی لکھ کر دی کہ بازار سے منگوا کر استعمال کریں آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ جگنو ابراہیم کو گھر چھوڑ کر بازار سے دوائی لینے نکلا تھا۔ اس نے دوائی کی پرچی اچھی طرح پلاسٹک کے لفافے میں ڈھانپ کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ ایک میڈیکل سٹور سے دوائی نہ ملنے پر وہ بھاگا ہوا سڑک کراس کر رہا تھا کہ دانیال کی گاڑی کے ٹائر چرچرانے کی آواز سن کر گھبرا گیا۔ اس نے غصیلی آنکھوں سے ڈرائیور کی طرف دیکھا مگر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی فریحہ کو پہچان کر اس کے ہونٹوں سے اس کا نام نکلا۔ فریحہ بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی جگنو کے لیئے یہی کافی تھا۔

وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے فریحہ کو جاتا ہوا دیکھتا رہا اُسے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا ہے اور بارش سے اس کے کپڑے خراب ہو رہے ہیں۔ یکدم کسی نے اُسے اپنی بانہوں کے دائرے میں بھرا اور لڑھکنیاں کھاتا ہوا اُسے بھی ساتھ لے گیا۔

''مرنے کا ارادہ ہے کیا؟'' بچانے والے نے غصے سے کہا مگر دوسرے ہی لمحے دونوں زمین پر گرے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ جگنو بے اختیار ہو کر دوسرے شخص سے چمٹ گیا۔ ''عفی! میرے بھائی..... عفی..... عفی.....'' وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور عفی کو چومنے چاٹنے لگا۔ عفی نے بھی اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا دونوں بھائیوں کی آنکھوں سے برسات جاری تھی۔ بارش نے ایک بار پھر برسنا شروع کر دیا تھا۔ سردیوں کی شام ٹھنڈی اور گہری ہو رہی تھی۔ لوگ اپنے گھروں میں جانے کیلئے ٹرانسپورٹ کی مدد حاصل کر کے منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے کھڑے ہو کر اور لٹک کر بھی سفر کرنے پر تیار تھے۔ وہ دونوں بھائی بھی ایک بس سٹاپ پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس کے شیڈ تلے دونوں ایک دوسرے کو کوئی مہینوں بعد دیکھ رہے تھے۔ جگنو اس کے منہ پر ہاتھ پھیر کر یقین کر

لینا چاہتا تھا کہ وہ عفی ہی ہے۔ اس کا بچھڑ جانے والا بھائی۔

''بش! میرے شاتھ گھر چلو!'' جگنو اپنے مخصوص انداز میں بولا تو عفی کی آنکھیں جگنے لگیں۔ یہ کملا جھلا اس کا بڑا بھائی تھا۔ عفی نے اُسے کبھی بھی جوکر سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی مگر جگنو کا پیار بھرا انداز دیکھ کر اس کے دِل سے ایک گولا سا اُچھلا اور آنکھوں کا نمکین پانی بن کر آنکھوں کے قید خانوں کے بند توڑتا ہوا گالوں پر بہنے لگا۔ جگنو نے اپنے معذور ہاتھ سے اس کی آنکھوں سے آنسو صاف کیئے اور بولا۔

''کوئی اِش طرح بھی اپنے بھائی کو چھوڑ کر جاتا ہے...... اماں...... ہر روز تیرا راشتہ دیکھتی ہے...... اور...... اور ابا...... نئے نئے محلوں میں جان بوجھ کر شبزی بیچنے جاتا ہے...... بھلا کیوں؟'' جگنو کی آنکھیں بھی بن بادل برسات بنی ہوئی تھیں۔ وہ عفی سے سوالیہ انداز میں بولا تو عفی نے نہ سمجھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تو بھی جھلا ہی ہے...... وہ اِش لیئے...... کہ کہیں...... اُش کا بیٹا۔ عفی نظر آ جائے...... اُش کے کلیجے کو ٹھنڈک مِل جائے...... اور ماں...... میں جانتا ہوں...... وہ مجھ سے اور ابا سے چھپاتی ہے مگر...... میں نے کئی بار اُشے گلیوں کی خاک چھانتے ہوئے دیکھا ہے...... بش ایک بار...... ایک بار کہیں سے تمہاری 'بوتھی' نظر آ جائے......'' جگنو دھاڑیں مار کر رونے لگا تو عفی نے اُسے آگے بڑھ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ بارش تھم چکی تھی مگر سردی کی تیز لہریں ہوا بن کر ان کے جسموں کو چیرتی ہوئی گزرنے لگی تھیں۔ ''میں آؤں گا...... کسی دِن ضرور آؤں گا۔'' عفی نے جگنو کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''نہیں...... تمہیں ابھی میرے شاتھ چلنا ہوگا۔ ابا بھی بیمار ہے اور پھر اب تو اماں بھی اکیلی ہے...... آمنہ باجی کی شادی جو ہو گئی ہے۔'' جگنو نے ہنسنے کی اداکاری کرتے ہوئے آمنہ کی شادی کی اطلاع دی تو عفی مسکرانے لگا۔

''مجھے پتہ ہے کہ آمنہ کی شادی ماموں اختر علی کے بیٹے احمد سے ہو گئی ہے۔'' جگنو حیرت میں مبتلا ہو کر عفی کی طرف دیکھنے لگا۔ ''یہ دیکھو!'' جگنو نے بند مٹھی کھول کر مڑی تڑی پرچی جس پر کھانسی کے شربت کا نام لکھا ہوا تھا عفی کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''اِش میں ابا جی کی دوائی کا نام لکھا ہوا ہے۔ ہم وہاں سے دوائی لے کر گھر چلتے ہیں۔'' وہ عفی کا باز و مضبوطی سے پکڑتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ عفی اس کے خلوص اور بھائی پیارے پر قربان ہو رہا تھا۔

اُس نے اپنی زندگی میں کبھی بھی جگنو کو بڑے بھائی کی طرح عزت واحترام نہ دیا تھا لیکن آج جگنو اس کا بڑا بھائی بھی تھا اور اس کا مان بھی۔ وہ اس کے خلوص کو رد نہ کر سکا اور خاموشی کے ساتھ چل پڑا۔ اُنہوں نے میڈیکل سٹور سے دوائی خریدی تو پیسے عفی نے دیئے جگنو نے اصرار کیا مگر عفی نے سختی سے منع کرتے ہوئے پیسے خود ادا کر دیئے۔

''عفی نے اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے ایک رکشہ والا کو اشارہ سے اپنے پاس بلایا اور حیران و گنگ جگنو کو اس میں بٹھا کر خود بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ گھر کا پتہ بتا کر عفی جگنو کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''اب تو میرا بازو چھوڑ دو...... میں تمہارے ساتھ ہی جا رہا ہوں۔'' جگنو مسکرانے لگا مگر اس نے بازو نہ چھوڑا۔

''ابا جی کہتے ہیں۔ ہاتھ آئے تو جانے نہ دینا ورنہ پچھتانا پڑے گا۔'' اس کے بھولپن اور جھلے پن نے اُسے محلے بھر میں مشہور شخصیت بنا دیا تھا۔ وہ سب کی عزت کرتا تھا اور تمیز کے ساتھ پیش آتا تھا۔ پہلے پہل تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے مگر اب نجانے جگنو کی شخصیت میں ایسی کیا کشش تھی کہ لوگ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی اس کا احترام کرنا شروع کر دیتے تھے۔ اس نے نور شاہ والی سرکار کی چوکھٹ پر اپنے سر اور دِل کو جھکایا ہوا تھا اور پھر حافظ جی بھی اس کی روحانی تربیت کر رہے تھے وہ حق و معرفت کی منازل طے کر رہا تھا مگر راز ہی راز میں۔ اس بات کا جگنو اور حافظ جی کو ہی علم تھا۔

وہ گھر پہنچے تو عفی کا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا کیونکہ اس نے عائشہ بی بی کو دروازے کی چوکھٹ میں ہی کھڑے پایا تھا۔ وہ ماں کی شکل کافی دیر بعد دیکھ پایا تھا۔ جگنو نے ایک فاتح کی طرح ماں کی طرف دیکھا اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کوئی قارون کا خزانہ دریافت کر کے لایا ہو۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ اکڑ کر کھڑا تھا۔ گلی میں ان تینوں ماں بیٹوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ سردی کے اکثر گھروں کے دروازے سرِ شام ہی بند کروا دیئے تھے۔

''ماں کا دِل آئینے کی طرح ہوتا ہے عفی۔'' عائشہ بی بی کے عقب سے ابراہیم کی کھانستی ہوئی آواز آئی تو سب نے چونک کر دیکھا ابراہیم گرم چادر لپیٹے ہوئے کھڑا تھا۔ ''یہ آج صبح سے کہہ رہی تھی کہ میرا دِل کہتا ہے میری کھوئی ہوئی چیز مجھے واپس ملنے والی ہے۔'' ابراہیم کی آواز لرز گئی تو عائشہ بی بی کی آنکھوں برسنے لگیں جبکہ جگنو نے اداس اور غمگین کھڑے عفی کو ایک دھکا لگا کر

آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تو اس کی آنکھیں بھی برسات بن گئیں۔ ماں بیٹے کا ملاپ گھر کی چوکھٹ پر ہوا تو گھر کی ہر ایک اینٹ نے آنسو بہا کر اس ملاپ کو خوش آمدید کہا۔ عفی نے رو رو کر عائشہ بی بی کے کندھے پر آنسوؤں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ وہ کچھ نہ بول رہی تھیں بس ان کی برستی آنکھیں اور سینے میں دھڑکنے والا دل بیٹے کو گھر میں پا کر رب تعالیٰ کی شکر گزاری میں جھکا ہوا تھا۔ اُنہوں نے ممتا کے مٹھاس بھرے ہونٹوں سے عفی کے ماتھے پر محبتوں کی مہر ثبت کی تو جگنو نے بھی اپنا چہرہ آگے کر دیا۔

چند لمحے پہلے پھیلنے والی ماحول میں اداسی اور سوگواری جگنو نے اپنی ایک ہی حرکت سے ختم کر کے سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ عائشہ بی بی نے اس کی پیشانی پر بھی بوسہ دیا تو ابراہیم نے عفی کو گلے لگا لیا۔

"ماں باپ تو اولاد کے سکھ کی خاطر اپنی نیندیں قربان کر دیتے ہیں..... تم نے میری بات کا اتنا برا منایا کہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔" ابراہیم کی بات میں نمی اور شکوہ محسوس کرتے ہوئے عفی شرمندہ ہو گیا مگر اُس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا وہ سر جھکا کر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں اس کی واپسی ہو گئی ہے..... مگر ابھی تو وہ ان راہوں کا مسافر بنا ہی تھا جن پر واپسی کے تمام راستوں پر بڑے بڑے پتھر رکھ کر راستہ بند کر دیا جاتا ہے۔

"عفی!" عائشہ بی بی بولیں تو وہ جی جان سے متوجہ ہوا۔ "کھانا کھاؤ گے بیٹا!؟" اُنہوں نے کھانا ڈال کر عفی کے سامنے رکھ دیا۔ اتفاق سے آج بھی دال ہی پکی ہوئی تھی۔ ابراہیم نے عائشہ بی بی کی طرف دیکھا وہ سمجھا کہ ممتا ایک بار پھر بیٹے کا امتحان لے رہی ہے مگر عائشہ بی بی اس بات سے بے نیاز اور بے خبر تھیں۔

"عفی!..... یہ وہی دال ہے جسے تم چھوڑ کر گئے تھے۔ دیکھ لو..... ہم بھی تو زندہ ہیں۔" جگنو کی معصومیت تھی یا پھر عفی پر طنز تھا مگر اُسے بالکل بھی بُرا نہ لگا تھا اس نے پیٹ بھر کر دال کے ساتھ روٹی کھائی چند نوالے عائشہ بی بی نے بھی اس کے منہ میں ڈالے وہ روتی ہوئی آنکھوں سے کھانا کھاتا رہا۔ اس سے پہلے ذائقہ اور محبت و خلوص کی مٹھاس کبھی بھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج اُسے دال زندگی کے ہر کھانے سے لذیذ لگ رہی تھی۔

"اماں جی!" عفی نے پہلی بار زبان کھولی۔ "میں آپ لوگوں کو چھوڑ کر خوش تو نہیں ہوں..... مگر جن راہوں پر چل کر نکلا ہوں..... واپس نہیں آ سکتا..... نوکیلے پتھر اور سوکھے کانٹے

ان راہوں کا بچھونا بن گئے ہیں..... میرے ان ہاتھوں کی کھال اُدھڑ گئی ہے..... مگر میں اپنی راہوں سے ان پتھروں اور کانٹوں کو ہٹا نہیں سکا!" اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں تو عائشہ بی بی اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیلاتی ہوئی بولیں! "میں تمہاری ماں ہوں..... تم اس دُنیا میں جہاں بھی رہو..... میں تمہارے بھلے اور بہتری کیلئے دُعا گو رہوں گی..... مگر عفی..... زندگی میں کوئی بھی کام ایسا نہ کرنا کہ روزِ محشر مجھے اپنے پروردگار کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔"

"آپ کو میری طرف سے کبھی بھی کوئی شکائیت نہیں ملے گی..... میں آپ کا سر بلند کرنے کیلئے اپنا سر تو کٹوا سکتا ہوں..... مگر کبھی بھی آپ کے جھکے ہوئے سر نہیں دیکھ سکتا۔" اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ "اماں جی..... ابا جی!" وہ اس بار دونوں سے ہی مخاطب ہوا تھا۔ "آمنہ..... احمد کے ساتھ بہت خوش ہے..... میں آپ لوگوں سے دور ہو کر بھی بہت قریب ہوں..... میں تو آمنہ کی شادی میں شریک ہونا چاہتا تھا مگر آپ لوگوں نے بہت سادگی سے کام کیا۔" اس کے لب مسکرائے۔

"مجبوری تھی بیٹا!" ابراہیم نے دوائی کی چمچی اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "بیٹی کی خوشیاں خریدنے کیلئے ہمیں اندھیروں کا سہارا لینا پڑا تھا..... اور تم نے یقیناً دیکھا ہو گا..... وہ الحمدللہ اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہے۔" عفی نے ابراہیم کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"مجھے آپ کے فیصلوں پر ہمیشہ فخر رہا ہے..... اور اب بھی میں آپ کی طرف سے ایک اہم فیصلے کا منتظر ہوں۔" ابراہیم عائشہ بی بی اور جگنو اس کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھنے لگے۔ چند لمحات اسی طرح سکوت میں ہی گزر گئے تھے۔ عفی نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر ابراہیم کے ہاتھوں پر رکھ دیں۔ اتنے سارے روپے ایک ساتھ دیکھ کر ان تینوں کی تو سٹی گم ہو گئی تھی مگر عفی کی آواز نے اُنہیں چونکا دیا۔

"یہ روپے میں نے اپنی جان پر کھیل کر کمائے ہیں..... میرے کسی کام کے نہیں ہیں بلکہ میری جان کیلئے خطرہ بھی ہیں آپ ان روپوں کو رکھ لیں۔" ابراہیم نے غور سے پیسوں کی طرف دیکھا اور پھر عائشہ بی بی کی طرف دیکھا..... گویا کہ تصدیق مانگی۔ لیکن اُنہوں نے نظریں جھکا لیں..... ابراہیم سمجھ گیا کہ یہ فیصلہ اُسے ہی کرنا ہے کیونکہ زندگی کے تمام اہم فیصلے ابراہیم نے ہی کیئے تھے اور ان کے دور رس نتائج بھی اچھے ہی برآمد ہوئے تھے۔

"مگر..... تم یہ روپے ہمیں کیوں دے رہے ہو؟" وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ عفی کی آنکھیں

برسنے لگیں۔ وہ روتی ہوئی آنکھوں سے بولا۔ ''جن کا کوئی نہیں ہوتا...... وہ اس دُنیا میں زندہ رہنے کیلئے صرف دو روٹیاں مانگ کر بھی کھا لیتے ہیں مگر جن کا ہر رشتہ ہوتا ہے وہ مجبوری اور لاچاری سے کمائی ہوئی روٹیاں کھا تو لیتا ہے...... مگر اُنہیں ہضم نہیں کر پاتا...... میں آپ کو...... یہ روپے اپنے خون پسینے کی کمائی سے دے رہا ہوں...... آپ آج کے بعد ریڑھی نہیں لگائیں گے...... تاکہ...... کوئی بھی امیر زادہ...... اپنی گاڑی سے ریڑھی ٹکرانے پر آپ کو دھکا نہ دے...... اور میرے اس بھائی کے منہ پر تھپڑ نہ مارے۔'' عفی کی آواز میں لرزش نمایاں تھیں مگر اس کی اشارہ عاصم اور جگنو والے واقعہ کی جانب تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس دِن عفی بھی وہاں تھا...... اگر یہ وہاں تھا تو پھر باپ اور بھائی کو تماشہ بنتا کیوں دیکھتا رہا؟! ابراہیم نے یہ سوچا اور دِل میں آنیوالے الفاظ کو زبان دے دی۔

''اس دِن تماشے والی جگہ پر تم بھی تھے...... تو پھر ہماری مدد کیوں نہ کی!؟'' اس کی زبان لڑکھڑا کر رہ گئی۔ ''میں آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا کہ احمد اور آمنہ وہاں آ گئے اگر میں کھل کر سامنے آ جاتا تو لازماً آمنہ مجھے بھائی کے روپ میں دیکھ کر پکارتی اور پھر جگنو بھی...... اور اس طرح آمنہ کی شادی منظرِ عام پر آ جاتی اور عاصم یقیناً اصل ماں کو بتاتا...... اس طرح آمنہ کی خوشیوں بھری زندگی میں زہر گھل جاتا۔'' عفی الفاظ کو ٹھہر ٹھہر کر ادا کر رہا تھا اس لفظوں نے ابراہیم اور عائشہ بی بی کی نظروں میں اس کی اہمیت اور قدر اور بھی بڑھا دی تھی۔ وہ پھر بولا۔ ''میں نے دِل پر پتھر رکھ کر اس دِن آپ کی توہین برداشت کر لی۔ تاکہ آمنہ خوش اور سُکھی رہ سکے!''

ابراہیم اور عائشہ بی بی اپنے اس ''نکھٹو'' بیٹے کی طرف فخر سے دیکھ رہے تھے جو ان سے دور رہ کر بھی ان کے پاس رہتا تھا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہو رہے تھے۔ جگنو کو اللہ جانے باتوں کی سمجھ آ رہی تھی یا نہیں لیکن وہ غور سے عفی کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

''ان روپوں سے آپ کوئی چھوٹا موٹا کام کر لیں...... بس ریڑھی لگا کر نہ جایا کریں۔'' عفی نے ابراہیم کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میں اب کماتا ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ میرا باپ بڑھاپے میں بھی اپنا اور گھر والوں کا پیٹ بھرنے کیلئے گلیوں میں آوازیں لگاتا پھرے۔'' عائشہ بی بی نے آگے بڑھ کر عفی کے ماتھے پر بوسہ دیا تو جگنو مسکراتا ہوا بولا۔

''اماں جی...... ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔!'' اس کا انداز ایسا تھا کہ ماحول زعفران بن گیا۔

''اب مجھے اجازت دیجئے...... میرے پاس وقت بہت کم ہے۔'' اداسی اور سوگواری کے ماحول میں عفی نے ان سب سے اجازت طلب کی اور باہر نکلنے لگا تو بولا۔ ''ابا جی! میں آپ سے اکیلے میں کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔''

ابراہیم اور عائشہ حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگے تو جگنو نے فقرہ لگایا۔ ''میں بھی ساتھ ہوں گا۔'' عفی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ہاں!'' تینوں باپ بیٹا باہر گلی میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ اندھیرے کے ساتھ ہی سردی بھی اپنا جوبن دکھانے لگی تھی۔ ''ابا جی! میں اب شائد کبھی بھی آپ سے نہ مل سکوں۔'' ابراہیم عفی کے الفاظ سن کر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اندھیرے میں عفی کی جگتی ہوئی آنکھیں دیکھ سکتا تھا اور عفی باپ کی آنکھوں میں چھپے ہوئے سوالیہ فقرے کو پڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف جہاد کر رہا ہوں ابا جی!''

''زندہ باد عفی جی!'' جگنو کی پُرجوش آواز گونجی تو عفی نے جگنو کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''جگنو!...... میرے بھائی...... میرے لیئے دُعا کرنا...... میں شہید ہونا چاہتا ہوں۔'' جگنو اور ابراہیم کا سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا تھا۔ ''ابا جی! اماں کو طریقے سے بتا دینا...... میں ان کی نظروں میں نکما اور نکھٹو ہوں...... مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ میری شہید ہونے کی تمنا تبھی پوری ہو گی جب میری ماں میرے لیئے دُعا کرے گی...... ابا جی...... جگنو...... اماں سے کہنا کہ میرے لیئے دُعا کریں...... میں ان کی دُعاؤں کے بغیر بے بس اور لاچار ہوں...... بس...... صرف مرنا نہیں چاہتا بلکہ شہادت کی موت پسند کرتا ہوں......'' اس نے ابراہیم کو گلے لگا لیا۔ ''میری غلطیاں اور کوتاہیاں معاف کر دینا میں آپ کا صحیح صحیح بازو نہیں بن سکا!''

''اللہ کی راہ میں...... تمہاری شہادت...... میرے لیئے باعثِ فخر ہو گی۔'' ابراہیم نے اُسے خود سے الگ کر کے اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''میں قیامت والے دن اللہ کی بارگاہ میں اپنے اعمال سے ندامت ضرور محسوس کروں گا...... مگر تمہاری شہادت میرے لیئے فخر اور غرور کا ثبوت ہو گی...... جاؤ میرے بیٹے میری دُعائیں تمہارے ساتھ ہیں...... اللہ تمہیں ہر اس کام میں سرخرو کرے جو تم اللہ کی وحدانیت کا پرچار کرنے کیلئے کرو گے۔''

''اور میری دُعائیں بھی تمہارے ساتھ ہیں عفی!'' اس آواز نے سب کو اندھیرے میں ایک سمت دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ جہاں عائشہ بی بی آنکھوں میں آنسو لیئے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔

''اللہ تعالیٰ ہر ماں کو تم جیسا ہی بیٹا دے۔''

''اور تم جیشا بھائی!.....تمہارا درجہ بہت بلند ہے عفی..... حوریں تمہاری منتظر ہیں اور پروردگار......'' یکدم جگنو خاموش ہو گیا وہ عفی کے گلے مل کر لڑکھڑاتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔

ماں باپ نے جی بھر کر بیٹے کو پیار کیا اور بیٹے نے بھی ان کے آنسوؤں کے نذرانوں کو اپنے ہونٹوں سے چوم کر محبت اور فرمانبرداری کی ریت کو زندہ کیا تھا۔ وہ روتی آنکھوں کے ساتھ عفی کو الوادع کر رہے تھے مگر ان کے سینے اور سر فخر سے تنے ہوئے تھے اور دِل بارگاہِ الٰہی میں سجدے میں جھکے ہوئے تھے۔

☆☆☆

میڈیا اور صحافت کے لوگ شور مچا مچا کر خاموش ہو گئے تھے پروفیسر فائز احمد کے قتل سے ہونے والے ہنگامے اور دھنگے اب آہستہ آہستہ کم ہونے لگے تھے۔ ویسے بھی انسان کی نفسیات ہے کہ وہ کوئی بھی کام جس جوش اور ولولے سے کرتا ہے اُسے کبھی بھی اسی ولولے کے ساتھ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا پاتا۔ یا تو وہ انتہائی تھک جاتا ہے یا پھر کام کی رفتار انتہائی سست ہو جاتی ہے۔

پروفیسر فائز احمد کے قاتل کو سرِ عام پھانسی پر لٹکانے کا معاملہ بھی چند ہفتوں بعد ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

ہر کوئی اپنے اپنے کام اور معاشی مسائل میں گھرا ہوا تھا ہندو اور مسلمانوں کے رہنماؤں نے بھی زوردار تحریکوں کے بعد چپ سادھ لی تھی۔ کبھی کبھار بھولے بسرے سے پروفیسر فائز احمد کا نام لیا بھی جاتا تو باتوں میں وہ دم خم نہ ہوتا۔ بس بے بنیاد باتیں اور سیاسی بیانات پر مبنی بے سروپا کہانیاں ہی ہوتیں۔ مثلاً ''ہم یہ کر دیں گے۔ وہ کر دیں گے۔ ہم منتخب ہو کر قاتل کو سرِ عام پھانسی پر لٹکا دیں گے......'' وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو لکھی پڑھی بات ہے کہ جو بھی لیڈر اور رہنما یہ کہے کہ وہ کر دیں گے۔ گا۔ گی وغیرہ...... حقیقت میں وہ کچھ بھی نہ کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے۔ بس اس طرح کلیم اللہ کا معاملہ بھی لٹک گیا تھا۔ وہ اس وقت اپنے ہندو باپ کے ظلم اور بربریت کے علاوہ جھوٹی انا اور ظلم وتشدد کا نشانہ بنتا ہوا ہندوستان کی بدنام ترین جیل میں تھا جس میں کسی چور اچکے اور ڈاکو وغیرہ کی گنجائش نہ تھی بلکہ نامور قاتلوں اور دہشت گردوں کو رکھا جاتا تھا۔ اس جیل میں ایسے ایسے ناگ قید تھے جنہیں حکمران اور اپوزیشن ارکان اپنے فائدے اور مقصد کیلئے جیلر اور عملہ کی ملی بھگت سے باہر نکال کر کام لیتے تھے اور دوبارہ ان کو جیل میں بند کر دیتے یا پھر استعمال کے بعد ختم کروا دیتے تھے۔

کلیم اللہ کو اس جیل کی بابت کچھ علم نہ تھا مگر اب وہ ایسا قیدی تھا جس پر کوئی دفعہ نہ تھی اور کوئی ایف آئی آر درج نہ تھی بس پرساد چوپڑہ کے ہائی سطح پر تعلقات نے کلیم اللہ کو ذاتی عناد کا نشانہ بنایا

تھا۔ مگر اتنے ظلم وتشدد کے بعد بھی اس کے ایمان اور ارادوں میں کوئی کمی نہ آئی تھی بلکہ اس کا ایمان پختہ سے پختہ ہو گیا تھا۔

اُسے ایک تنگ اور قدرے تاریک کوٹھڑی میں قید کیا گیا تھا گزشتہ ایک ماہ کے دوران اس سے کوئی بھی ملنے نہ آیا تھا۔ مگر آج ایک کانسٹیبل کی آواز نے اُسے چونکا دیا تھا۔ ''کندن تمہاری ملاقات ہے۔'' وہ اپنے پرانے نام سے پکارے جانے پر چونک گیا اور کانسٹیبل کی طرف دیکھنے لگا۔ ''کوئی لڑکی ہے......صرف دس منٹ کا وقت دیا ہے صاحب نے۔'' وہ تلخ مزاج سپاہی چلا گیا تو کوٹھڑیوں کے تنگ وتاریک ماحول میں لیڈیز سینڈلوں کی آواز گونجنے لگی۔

''ٹک ٹک ٹک ٹک۔'' آنیوالی جو کوئی بھی تھی ابھی چند قدم دور تھی مگر کلیم اللہ کے دِل پر ٹک ٹک کی آواز انجانے ہتھوڑے کی مانند لگ رہی تھی۔ وہ حیران اور پریشان تھا کہ اس کال کوٹھڑی میں اس سے ملنے کون آ سکتا ہے اور پھر اس جیل میں تو کافی سختی ہے جیلر اور عملہ کی مرضی کے مطابق یہاں تو پرندہ بھی پر بھی نہیں مار سکتا۔ سینڈلوں کی ایڑھی کی آواز اس کی بیرک کے سامنے آ کر رک گئی۔ وہ نظریں اُٹھا کر اپنے ملاقاتی کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

''کاجل!'' اس کے منہ سے ایک لفظ نکلا۔ وہ کاجل کو اچھی طرح پہچان گیا تھا۔ یہ وہی کاجل تھی جس نے اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے سنہری سپنے دیکھے تھے مگر وہ کندن کی ضد کی وجہ سے ان سپنوں کو حقیقت میں نہ بدل سکی تھی۔

''کندن! کیسے ہو؟'' اس حالت میں اُسے کاجل کے سوال بڑا عجیب سا لگا تھا مگر اس فقرے کی بہت اہمیت تھی کیونکہ اس کال کوٹھڑی میں اُسے ایک ماہ بعد کسی اپنے کا چہرہ نظر آیا تھا اور اس نے اس کا حال پوچھا تھا۔

''جس شخص کا پنجہ بھوکے شیر کے منہ میں پھنسا ہوا اور وہ نہتا ہو......تو اس کا حال کیسا ہو سکتا ہے کاجل!'' اس کی آواز میں کرب نمایاں تھا۔ ''تم کہو کیسی ہو......شادی کر لو؟'' اس نے دس منٹ کی گفتگو کی اجازت کو گزارنا شروع کر دیا۔

''کندن! مجھے اس حالت میں تمہیں دیکھ کر بہت دُکھ ہو رہا ہے۔'' کاجل کی آواز بھیگ گئی۔

''تمہاری ہمدردی کا شکریہ کاجل!'' وہ بے دِلی سے بولا۔

''محبت میں شکریہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔'' وہ دِل سے بولی تھی۔ ''میں تمہارے لیئے کچھ کرنا

چاہتی ہوں۔"

"احسان!؟" اس نے مختصر الفاظ میں کاجل کے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔ طنزیہ انداز محسوس کر کے کاجل بھی تلملا کر رہ گئی۔

"میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں کندن!"

"اب بھی..... جبکہ میں تو مسلمان ہو گیا ہوں۔" وہ لبوں پر زہریلی مسکراہٹ لیئے ہوئے بولا۔ "تمہارا اسٹیٹس اور چوپڑہ کا نام بدنام نہیں ہوگا کاجل؟" وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتی ہوئی بولی۔

"کندن!" عشق اور محبت، رسموں رواجوں، ذاتوں پاتوں اور مذاہب کے امتیاز کو نہیں مانتی۔" اس نے آگے بڑھ کر کلیم اللہ کے ہاتھ پکڑ لیئے جو اس نے سلاخوں پر رکھے ہوئے تھے۔

"تم خود ہی بتاؤ کندن!..... تم نے کونسی ایک جھلک ایسی دیکھی کہ تم اپنا دین دھرم، دھن دولت اور سٹیٹس چھوڑ کر اس جھلک کے عاشق بن گئے؟"

"میرا دعویٰ ہے کاجل!..... اگر تم وہ بھی جھلک دیکھ لیتی تو خدا کی قسم اپنے بھگوان بھول جاتی۔" وہ عشق الٰہی سے سرشار تھا۔ "کندن!..... میں مذہبوں کی تفریق اور تقسیم میں اُلجھ کر جب اپنے پیار کو تمہاری محبت سے ضرب دیتی ہوں تو یقین کرو..... کئی ہزار گنا پیار ملتا ہے جو عشق کا روپ اختیار کر کے میرے ارد گرد پاؤں میں گھنگرو باندھ کر نچانا شروع کر دیتا ہے۔" وہ کہیں دور خلاؤں میں گھورنا چاہتی تھی مگر کلیم اللہ کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"کیا کر سکتی ہو، میرے لیئے..... میری محبت کی خاطر!؟"

"اگر جان اور عزت بھی نچھاور کرنا پڑی تو تمہاری محبت پر قربان کر دوں گی....." وہ جذبات میں ڈوبتی ہوئی بولی۔

"مجھے یہاں سے نکال سکتی ہو کاجل!" وہ کلیم اللہ کی طرف دیکھنے لگی۔ "میں یہ جانتا ہوں کہ تم اگر مجھ سے ملاقات کرنے کیلیئے آ سکتی ہو تو مجھے یہاں سے نکال بھی سکتی ہو..... یا پھر..... کوشش کر سکتی ہو..... میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

اس نے کاجل کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "روزِ محشر میں پروردگار سے کسی انعام یا حور کا مطالبہ نہیں کروں گا..... صرف تمہارا ساتھ مانگوں گا کاجل!" کلیم اللہ نے اس کے دِل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔ کاجل کی آنکھوں میں دیپ جلنے لگے تھے وہ کانپتے ہاتھوں اور لرزتے ہونٹوں کے ساتھ آگے بڑھی اس نے کلیم اللہ کے ہاتھوں پر اپنی محبت کی مہر ثبت کرتے ہوئے کہا۔

"کندن! اس جہان میں نہ سہی..... اس جہان میں ہی میں تمہاری بننا چاہوں گی۔"

"وقت ختم ہو گیا ہے میڈم!" کانسٹیبل کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا جو نجانے کب چپکے سے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ "میری وفا پر اعتماد رکھو..... میرا انتظار کرنا کلیم اللہ" اس نے پہلی بار کندن کو اس کے اسلامی نام سے پکارا تھا۔ "جلد یا بدیر میں ضرور آؤں گی!" وہ یہ کہہ کر چلی گئی کلیم اللہ اس کے سینڈلوں کی ٹک ٹک کو دِل پر بجتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پوجا بھابی کے پتا جی کا پولیس میں بہت اثر و رسوخ ہے۔

اس نے کاجل کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ دراصل اس نے کبھی بھی کاجل سے پیار نہ کیا تھا وہ اُسے اپنی دوست سمجھتا تھا۔ مگر کاجل اُسے دیوداسیوں کی طرح چاہتی تھی وہ اُسے پجاری مانتی تھی۔ پتہ نہیں وہ یہاں تک کیسے پہنچی تھی۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اگر چوپڑہ کو معلوم ہو گیا تو وہ بہت مشتعل ہوگا۔

"اور تمہارے رب نے فرمایا: مجھ سے دُعا کرو۔ میں تمہاری دُعا کو قبول کروں گا۔ بے شک وہ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر دوزخ میں جائیں گے۔" (مومن۔۶۰)

اُسے ان مشکل حالات میں پروفیسر فائز احمد بہت یاد آئے جنہوں نے اُسے اللہ تعالیٰ سے بہت قریب ہونے کا موقع دیا تھا اور وہ آج اس قابل بنا تھا کہ اپنے مضبوط ارادوں کے چٹانوں سے بھی مضبوط پاؤں پر کھڑا تھا۔ دُعا کرنے کیلیئے اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ اس نے کئی دِنوں سے وضو نہ کیا تھا۔ مگر اس کا اعتقاد تھا کہ وہ رحمٰن و رحیم پروردگار دِل کے وضو کو مانتا اور جانتا ہے۔ بس پھر کیا تھا دِل کی باتیں زبان سے ادا ہونے لگیں۔ آنکھوں نے برسنا شروع کر دیا تھا۔

"میرے اللہ!..... میں حقیر اور پُر تقصیر سا بندہ ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ تجھے کیسے مخاطب کیا جاتا ہے..... تجھے کیسے منایا جاتا ہے۔ تیری پرستش کیسے کی جاتی ہے..... میرے اللہ! میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ تو سچا ہے۔ تیرا قرآن سچا ہے اور تیرا فرمان ہے کہ مجھ سے دُعا کرو تو میں قبول کرتا ہوں..... بس میرے اللہ! میرے دِل کی نیک تمناؤں کو میری دُعا سمجھتے ہوئے قبول فرما!" اس پر گریہ طاری ہو گئی۔ رقت اور خضوع سے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

جیل کے پُرخوف اور اندھیرے ماحول میں خاموشی کا سینہ چیرتی ہوئی اس کی آواز ہواؤں، فضاؤں اور خلاؤں کو اپنے محبت بھرے پروں سے طے کرتی ہوئی بارگاہِ الٰہی میں پہنچی تھی۔ جیل کے عملہ اور افسران اس کی گریہ زاری سن کر لرز کر رہ گئے۔ قیدیوں پر لرزہ طاری ہونے لگا تھا۔ بڑے

بڑے نامور گرامی غنڈے، تخریب کار اور دہشت گرد قاتل بھی کان لگا کر اس کی گریہ زاری سننے لگے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا رونا پسند آ رہا تھا۔ اس کا انداز اچھا لگ رہا تھا۔ رحمتِ خداوندی جوشِ محبت سے لاکھوں میلوں کا فاصلہ طے کرتی ہوئی چند سیکنڈ کے چند حصوں سے بھی پہلے اس کے بیرک کے باہر پہنچی تھی۔ وہ گڑگڑا رہا تھا۔

"میرے اللہ! تو بہتر جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ تیرا نام لینا اگر جرم ہے تو میں مجرم ہوں۔ میں اس جیل کی دیواروں کی ایک ایک اینٹ پر تیرا نام لکھنا چاہتا ہوں...... میں اپنے آپ کو قصوروار مانتا ہوں کہ میں جہالت اور شرک کے اندھیرے میں جیتا رہا...... مجھے معاف کر دے اللہ! اپنی راہوں پر چلنے کیلئے مجھے ثابت قدم رکھ۔ تجھے تیرے محبوبؐ کی آل کا واسطہ! شہدائے کربلا کی ذاتِ مقدسات کا واسطہ! جہالت اور کفر میں گزاری گئی میری زندگی کی غلطیاں معاف کر دے۔"

میرے اللہ مجھے اس عذاب سے نجات دِلا۔ میری بے گناہی...... اپنی رحمت سے سچ ثابت کر دے۔ اللہ کا وعدہ اور فرمان سچا ہے اس نے کلیم اللہ کی دُعا سن لی تھی۔ اُسی لمحہ آئی جی جیل خانہ جات جیلوں کے دوسرے پر تھا وہ بھی اس کی رقت بھرے الفاظ میں التجا کو سن کر اس کی بیرک کے برآمدے کے باہر سُن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ماتحت اور جیلر کی ہوا نکل رہی تھی کیونکہ ابھی تک کلیم اللہ کو ذاتی عناد اور ذاتی دشمنی کی بنا پر قید میں رکھا گیا تھا اس پر کوئی فرد جرم یا الیف آئی آر درج نہ تھی۔

وہی ہوا جس کا جیل انتظامیہ کو ڈر تھا آئی جی اس برآمدے کی جانب بڑھ گیا تمام عملہ اس کی معیت میں آگے بڑھ رہا تھا جبکہ جیلر کے پسینے چھوٹ رہے تھے کیونکہ وہ جھوٹا اور کلیم اللہ سچا تھا۔ اس کی گریہ زاری نے اس ہیبت ناک جیل کی دیواروں کو لرزا دیا تھا۔ آئی جی جیل چلتا ہوا اس کے بیرک تک پہنچا تو اس نے حیرانگی سے دیکھا کہ ایک مجرم جو کہ جیل کی وردی میں تھا وہ سجدہ میں گرا ہوا تھا اور ان دیکھے خدا سے التجائیں کر رہا تھا۔

یہ کوئی اپنی نوعیت کا پہلا کیس نہ تھا کہ ہر قیدی اور مجرم اپنے آپ کو بے گناہ ہی کہتا ہے۔ مگر یہ انوکھا مجرم اپنے آپ کو بے گناہ کسی جابر و ظالم حکمران یا پھر جیلر کے سامنے نہیں کہہ رہا تھا بلکہ ان دیکھے مہربان اور رحمٰن و رحیم ربّ کے سامنے التجا کر رہا تھا اس کی گریہ زاری نے آئی جی کا دِل دہلا دِیا تھا۔ اس نے سپاہی کو اشارہ کیا تو وہ بیرک کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا اور سجدہ کی حالت میں گرے ہوئے کلیم اللہ کو کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"اوئے اپنی بک بک بند کر...... اور صاب کو سلام کر......" مگر دوسرے ہی لمحہ وہ کلیم اللہ کی سُرخ انگارہ بنی آنکھوں کو دیکھ کر خوف اور دہشت سے پیچھے ہو گیا۔ چند ثانیے بعد کلیم اللہ کے کانوں میں آئی جی کی آواز اُبھری۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"کلیم اللہ" مختصر سے جواب کو سن کر آئی جی کے ہونٹ سکڑ گئے کیونکہ نام بھی مسلمانوں والا تھا اور کام بھی۔

"تمہارا جرم کیا ہے؟" جیلر سر تا پاؤں لرز گیا تھا اور جواب اس کی توقع کے مطابق ہی تھا۔

"میں بے گناہ ہوں...... نہ کوئی جرم نہ کوئی گواہ...... بس مذہبی شر پسندوں کی ذاتی پسند ناپسند کا شکار ہوں۔"

"اس نے اپنے ہی مذہب کے عظیم سکالر پروفیسر فائز احمد کو قتل کیا ہے سر!" اس بار جیلر نے آگے بڑھ کر کلیم اللہ کا جرم آئی جی کو بتایا تو اس نے غور سے جیلر کی طرف دیکھا۔ "اسے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے جناب!" جیلر اپنی بدحواسی پر قابو پا چکا تھا۔ مگر آئی جی بہت کایاں آدمی تھا وہ سمجھ گیا کہ جیلر کی بانگ رواں نہیں ہے۔ اس نے ایک بار سب پر طائرانہ نظریں ڈالیں اور بولا۔ "اس قیدی کو نکال کر لاؤ۔" اور خود باہر کی جانب بڑھ گیا۔

"اگر اپنا منہ کھولا تو یاد رکھنا...... تمہارے حلق میں تیزاب انڈیل دوں گا۔" جیلر نے کلیم اللہ کے کان میں زہریلے انداز میں کہا تو وہ ایک لمبی سانس لیتا ہوا بولا۔ "جیلر صاحب! میرا وجدان کہتا ہے کہ اب میری ملاقات آپ سے کبھی نہیں ہوگی...... اللہ اکبر۔" کلیم اللہ ہتھ کڑیوں میں جکڑا ہوا سپاہیوں کے ہمراہ چل پڑا۔

"اُسے جیلر کے کمرے میں ہی لایا گیا تھا آئی جی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد اس نے فون کا ریسیور کریڈل پر رکھا اور سپاہیوں کو حکم دیا۔ "تم باہر جاؤ۔" سبھی جانے لگے تو جیلر بھی بل جل کرنے لگا تھا مگر آئی جی کی کڑاکے دار آواز نے اس کے پاؤں پکڑ لیئے۔ "تم ٹھہرو جگادر!" وہ سمجھ گیا کہ آج تو پٹی اتر گئی۔ وہ اس وقت کو کوسنے لگا جب آئی جی دھرم سنگھ اچانک دورے پر نکل آیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ دھرم سنگھ آ رہا ہے تو وہ کلیم اللہ کو کہیں اور بند کروا دیتا۔ مگر اب تو ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا تھا۔

"مجھے اس قیدی کے متعلق تمام ڈاکومنٹس کی فائل دکھاؤ۔" یہ حکم اس کیلئے متوقع تھا کیونکہ

اس نے سن رکھا تھا کہ آئی جی دھرم سنگھ ذات پات اور مذہب سے بالا ہو کر میرٹ اور قانون کے مطابق اپنی ڈیوٹی کرتا ہے۔

جگادر کی سانس پھولنے لگی تھی وہ خود پر قابو پاتا ہوا بولا۔ ''وہ...... دراصل سر...... بات یہ ہے کہ...... اوپر سے حکم آیا تھا کہ اس قیدی کو اس جیل میں رکھنا ہے۔'' وہ جلدی جلدی اپنی بات مکمل کر کے جان چھڑاتا ہوا بولا۔ مگر آئی جی تو آج اس کا تیل نکالنے پر تلا ہوا تھا۔ ''کس جرم کے تحت؟''

''آئی ڈونٹ ناؤ سر'' اس کی گھگھی بندھنے والی تھی۔ دھرم سنگھ اپنی کرسی سے اُٹھتا ہوا بولا۔

''یعنی کہ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ...... ایک مجرم تمہاری جیل میں بھیجا گیا ہے جس کے جرائم کی تفاصیل کا تمہیں علم نہیں ہے...... ایم آئی رائٹ؟'' اس نے اپنے سوال کی جگادر سے تصدیق چاہی تو وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔ ''سر جی!...... کیا بات ہے کہ میں بھی حکم کا غلام ہوں...... اپنی پیٹی تو سب کو پیاری ہوتی ہے۔'' اس کا انداز گھگھیا ہوا تھا۔ ''تو پھر ٹھیک ہے...... مجھے اس مجرم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے مگر میں اس وردی اور قانون کا رکھوالا ہونے کے ناطے انصاف کرنے لگا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے میز پر پڑی ہوئی بیل بجائی تو سپاہی حاضر ہوا۔ اس نے ایڑیاں جوڑ کر سیلوٹ کیا۔ ''اس مجرم کی ہتھکڑیاں کھولو۔'' دھرم سنگھ کا حکم سن کر سپاہی نے جیلر کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھ کے اشارہ سے ہتھکڑیاں کھولنے کا کہا۔

کلیم اللہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا تہہ دِل سے قائل ہو گیا تھا اس کی گڑگڑا کر رب کریم سے کی گئی التجا اللہ کے حضور قبول ہو گئی تھی اور وہ باعزت رہا ہو گیا تھا۔ اس نے شکریہ ادا کرنے کیلئے منہ کھولا ہی تھا کہ دھرم سنگھ بول پڑا۔

''اللہ اور گرو ایک ہی ہستی کے نام ہے بس الفاظ اور مذاہب کا ہیر پھیر ہے...... تم اپنے اسلام کے مطابق اس عظیم ہستی کو اللہ کہتے ہوئے ہو اور ہم اپنے مذہب کے مطابق گرو کہتے ہیں...... اس نے تمہاری فریاد سن کر مجھے بھی نیکی کی توفیق بخشی ہے...... بے شک وہ سننے والا اور جاننا ہے۔'' جگادر کے ماتھے پر پسینے کے نمایاں قطرے دیکھتے ہوئے دھرم سنگھ بولا۔ ''جس کسی کا بھی ''اوپر'' سے حکم آئے اُسے کہہ دینا کہ دھرم سنگھ نے کلیم اللہ کو اوپر والے کے حکم پر رہا کیا ہے...... بے شک وہ بڑا مہربان حکمران ہے جس کے انصاف میں کبھی بھی جھول نہیں ہو سکتی۔'' پھر وہ کلیم اللہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اپنے دشمنوں سے ہوشیار رہنا۔ اپنے کپڑے لے لو اور اپنا کام جاری رکھو!''

کلیم اللہ روتی آنکھوں سے شکریہ ادا کر کے باہر نکل گیا جبکہ دھرم سنگھ رجسٹر پر کچھ درج کر

نے لگا۔

☆☆☆

مسلمان ہونے کے بعد وہ پہلی مرتبہ اللہ کے گھر مسجد میں داخل ہوا تھا۔ وہ لطف و سرور کی کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر تھا۔ وضو کرنے کے بعد اُس نے آسمان کی جانب شہادت کی انگلی اُٹھا کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد مصطفیٰ ﷺ کے رسول ہونے کی گواہی دی تو اس کی نگاہیں آسمان کی جانب اُٹھی کی اُٹھی رہ گئیں۔

بادلوں کی ٹولیاں خرمستیاں کرتی ہوئی ادھر سے اُدھر جا رہی تھیں نیلے نیلے آسمان کا پیارا سا رنگ ان بادلوں کی اوٹ سے جھلکتا ہوا قدرت کا بہترین منظر پیش کر رہا تھا۔ کلیم اللہ کی انگلی اور نگاہیں تو آسمان کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں لیکن دِل اس منظر کے احترام میں جھکا ہوا تھا جو بادلوں کی بارات نے نیلے آسمان پر بنا دیا تھا۔ دُنیا کے کوئی بھی نامور آرٹسٹ اور مصور اس منظر کو صدیوں تک اپنے کینوس پر پینٹ نہ کر سکتا تھا۔ یہ صرف اسی مصور کا کام تھا جس نے کائنات کے ذرے ذرے سے اپنے اور اپنے محبوب کی ذات کو عیاں کیا تھا۔

بادلوں کی ترتیب کچھ اس طرح سے تھی کہ نیلے آسمان پر مصور کائنات نے اپنے محبوب اور والیٔ کائنات کا نام محمدؐ بڑی محبت اور چاہت سے تخلیق کر کے کلیم اللہ کو واضح اشارہ دیا تھا کہ میری اطاعت میرے رسولؐ کی اطاعت ہے وجۂ تخلیق کائنات کے مقدس و معطر وجود کی خاطر رب کائنات نے اس کائنات کا ظہور فرمایا تھا۔ اور یہ بات رب تعالیٰ نو مسلم کلیم اللہ کو اپنے انداز سے سمجھا رہا تھا۔ اس نظارے کے بیکراں لطف و سرور کو محسوس کرتے ہوئے کلیم اللہ کی آنکھیں حیرت و استعجاب سے پھیل گئیں۔ کان کی لوئیں سُرخ ہو کر کندن بننے لگیں تو دِل کی دھڑکن باترتیب ہو کر درود شریف کا ورد کرنے لگی۔ سانسوں نے دھونکنی کی طرح چلنا شروع کر دیا۔ جسم کے مساموں نے پسینے کا اخراج کر کے اس کے عشق کو خراج تحسین پیش کرنا شروع کر دیا۔ پورے جسم کے بال کھڑے ہو گئے۔ پورے وجود کی تمام نسیں باادب ہو کر محبوب الٰہی کی مدحت بیان کرنے لگیں۔ کلیم اللہ کو اگر کوئی دیکھتا تو حیرت کے گنگ ہو جاتا کیونکہ اس کی سرخ انگارہ آنکھیں اب آسمان پر رونما ہونے والے نام کے ساتھ ساتھ گنبدِ خضریٰ کا دیدار بھی کر رہی تھیں...... یہ حسین اور دلآویز منظر چند لمحے رہا اور پھر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

اس کی لرزتی ٹانگوں نے اس کی ٹنوں کے حساب سے بوجھل لگنے والے وجود کا بوجھ اُٹھانے

سے انکار کر دیا۔ دماغ نے گرم پانی کی طرح ابلنا شروع کر دیا تھا آنکھیں خون برسانے لگیں تو کانپتی لرزتی ٹانگوں نے اس کے کھڑے رہنے کا بھرم بھی توڑ دیا اور وہ غش کھا کر مسجد کے صحن میں پکے فرش پر گرا اور دُنیا و مافیا سے بے گانہ ہو گیا!

☆☆☆

دانیال کافی دیر سے کھڑا جگنو کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ جگنو کبھی بغیر ڈھول کے ہی ناچنا شروع کر دیتا ہے اور کبھی کھانا کھانا شروع کرتا ہے تو کھائے ہی چلا جاتا ہے۔ اس کے منہ سے بہنے والی رالیں دانیال کو بہت بُری لگ رہی تھیں وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ شخص اس کی فریحہ کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم کر سکتا ہے یا نہیں۔ اُسے اپنی جلد بازی اور احتل کی بیوقوفی پر سخت غصہ آنے لگا تھا اور سب سے زیادہ غصہ تو اُسے فریحہ پر آ رہا تھا۔ بھلا کیا تک تھی جگنو کو حلالہ کے لیئے چُننے کی۔

وہ کافی دیر سے نور شاہ ولی سرکار کے مزار پر بیٹھا ہوا تھا وہ اس سے پہلے کبھی اس مزار پر نہ آیا تھا مگر فریحہ نے جگنو کی تعریف ہی اتنی کر دی تھی کہ وہ گزشتہ دو گھنٹوں سے بھی زیادہ جگنو کی طرف دیکھے جا رہا تھا اور جگنو بھی بظاہر اس سے بے نیاز تھا جب دانیال کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تو اس نے سوچا کہ اب یہاں سے جانا ہی بہتر ہے وہ اُٹھ کر جانے لگا تو کسی آواز نے اس کے پاؤں جکڑ لیئے۔ ”ٹھہرو نوجوان!“ ان الفاظ کے اپنی سماعت سے ٹکراتے ہی وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور سامنے سے آتے ہوئے نابینا شخص کو دیکھ کر حیران رہ گیا جو اکیلا ہی چلا آ رہا تھا مگر انداز ایسا تھا کہ وہ مزار شریف کے احاطہ میں لگے ہوئے ستونوں سے ٹکرا جانے کے ڈر سے خود کو بچا رہا ہے۔

دانیال کے لیئے یہ منظر بھی حیران کن تھا کہ وہ شخص جو خود کو ستونوں سے ٹکرانے سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے اُس نے یہ کیسے دیکھ لیا کہ میں جا رہا ہوں یا پھر میرا وجود اس جگہ موجود ہے اس نے سر کو جھٹک کر اس بات کو جھٹلا دیا کہ حافظ جی نے اُسے پکارا ہے وہ دو قدم آگے بڑھ گیا۔ اتنی اثنا میں حافظ جی اس کے قریب آ گئے تھے۔

”میں تمہارا نام لے کر تمہیں روکنا نہیں چاہتا۔“ اس بار واقعی دانیال کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے اس نے گھبرا کر صاحب مزار کی جانب نگاہ اُٹھائی تو قبر شریف پر پڑی ہوئی چادر کے اور وہ کپکپا اٹھا۔ اس نے لرز کر حافظ جی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا جو کہہ رہے تھے۔

”سودا کرنا چاہتے ہو؟“ مگر دانیال کے دل کی دُنیا اتھل پتھل ہوتے ہوئے رہ گئی…… وہ

کچھ نہ بول سکا بلکہ توجہ سے حافظ جی کی باتیں سننے لگا۔ ”یہ جو درویش منش لوگ ہوتے ہیں نا…… ان سے سودے بازی نہیں کیا کرتے انہیں ان کے ظاہری حلیے سے نہیں پہچانتے۔“ دانیال کی نظریں فوراً اس جانب اُٹھ گئیں جس طرف حافظ جی نے انگلی کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ جگنو گہری نیند سنگ مرمر کے ننگے مگر ٹھنڈے فرش پر سو رہا تھا۔ وہ سردی اور موسم کی زیادتی کی پرواہ کیئے بغیر ماں کی گود کی طرح پُرسکون سو رہا تھا۔ دانیال کے پورے وجود میں سردی کی شدید لہر سرائیت کر گئی۔

”زندگی کے سب سے بڑے بیوپار میں اگر گھاٹا پڑ جائے تو انسان اپنی ہوش گنوا دیتا ہے۔“ وہ حافظ کی آواز کی جانب دوبارہ متوجہ ہوا۔ ”یا پھر دیوانہ بن کر گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے مگر اس نقصان کا ازالہ کبھی بھی نہیں ہوتا۔“

”کیا آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں بابا جی؟“ دانیال ابھی تک مخمصے کی کیفیت میں ہی تھا تبھی تو وہ حافظ جی سے پوچھ بیٹھا۔ ”کوئی اور در کھٹکھٹا لو میاں…… اللہ کے بندوں کے امتحان بندے نہیں اللہ ہی لیا کرتا ہے…… اللہ ہی لیا کرتا ہے۔ اللہ ہی لیا……“ حافظ جی جس طرف سے آئے تھے آہستہ آہستہ ادھر ہی بڑھ گئے۔

دانیال نے سر کو جھٹک کر تمام باتوں کو بے معنی اور ایک ڈرامہ قرار دیا اور مزار کے احاطہ سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے…… اس بدتمیز سے دوبارہ شادی کرو گی۔“ احتل فریحہ کی بات سن کر تڑپ کر بولی۔ ”کیا تم بھول گئی کہ اس نے تمہاری ماں کی کتنی بے عزتی کی تھی؟“ فریحہ تو خاموش رہی مگر اختر علی جو کہ صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا وہ بولا۔ ”پہل ہمیشہ کی طرح تم نے ہی کی تھی احتل بیگم!“ یہ سننا تھا کہ وہ چمک کر بولی۔

”وہ اتنا ہی مغرور اور ضدی تھا تو گزارہ کر کے دِکھاتا میری بیٹی کے بغیر۔“

اس کی رگیں پھولنے لگیں تھیں۔ ”نتیجہ کیا نکلا اختر علی! دُنیا کو تماشہ دکھایا اور بات بھی ہماری ہی مانی گئی نا۔“ وہ فریحہ کے اپارٹمنٹ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”دانیال سے فریحہ کی شادی تمہاری اور فریحہ کی پسند تھی…… اس میں میرا کوئی عمل دخل نہ تھا۔“ اختر علی کے چہرے پر کرب کی لکیر نمایاں تھی۔ ”دانیال اچھا لڑکا ہے۔ فریحہ سمجھتی ہے کہ وہ اس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اختر علی کا واضح فیصلہ بن کر احتل کی

ناک بھوں چڑھ گئی وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ پا رہی تھی۔فریحہ نے اُسے تذبذب کے عالم میں دیکھا تو بولی۔''میں کورٹ میرج کرلوں گی......اور میرے اس فعل سے آپ کی زیادہ بدنامی ہوگی۔''اختر علی اور امتل چونک کراس کی طرف دیکھنے لگے۔''میری ایک شرط ہے۔''امتل جوان بیٹی کے فیصلے کے سامنے اپنی شکست تسلیم کرتی ہوئی بولی۔''دانیال مجھ سے معافی مانگے۔''

''وہ آپ سے معافی مانگ لے گا......مگر میری بھی ایک شرط ہے۔جو آپ دونوں کو پوری کرنا پڑے گی۔''فریحہ دانیال کو پانے کیلئے دوٹوک لہجے میں گفتگو کر رہی تھی۔وہ دونوں اس کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھ رہے تھے۔''دانیال سے دوبارہ نکاح کرنے کیلئے شریعت کے کچھ اصول اور قانون ہیں۔''

''میں جانتا ہوں بیٹی!''اختر علی حلالہ کی بات جوان بیٹی کے منہ سے نہ سننا چاہتا تھا اسی لیئے فوراً بولا۔''مگر اس کے لیئے بااعتماد شخص کی ضرورت ہوتی ہے......جو ہماری بات پر پورا اتر سکے اور ہمیں یا تمہیں بلیک میل نہ کر سکے!''امتل بھی حلالہ کی بات کو جانتی تھی مگر خاموش رہی۔''کیا تمہاری نظر میں کوئی ایسا شخص ہے یا پھر دانیال کسی ایسے شخص کو جانتا ہو۔جو بعد میں دونوں خاندانوں کو بلیک میل نہ کر سکے!''اختر علی اس بات کو کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہا تھا مگر وہ بھی چاہتا تھا کہ چڑیا اپنے گھونسلے میں چلی جائے۔

''میں نے اور دانیال نے ایک ایسا ہی شخص ڈھونڈ لیا ہے۔''فریحہ کی نظریں جھک گئی تھیں۔یہی تو ایک خوبی ہے مشرقی بیٹی میں......وہ کتنی بھی آزاد خیال ہو جائے مگر شرم و حیا کی بات پر وہ نگاہیں جھکا کر اپنے باادب اور مشرقی روایات کی ترجمان ہونے کا ثبوت ضرور دیتی ہے۔''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ شخص قابل بھروسہ ہے اور تمہیں نکاح کی رات کے اگلے دن ہی طلاق دے دے گا؟''امتل آہستہ آہستہ اس کی شادی پر قائل ہو رہی تھی اور اب گفتگو میں دلچسپی بھی لے رہی تھی۔

''جی مما! وہ ہمیں بلیک میل نہیں کر سکتا......کیونکہ اس لفظ کو سمجھنے کی اس میں طاقت ہی نہیں ہے اور نہ ہی مینٹلی اپروچ۔''

فریحہ بولی تو امتل کو اس کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''کیا تم پاگل شخص سے شادی کرنے والی ہو؟''امتل رہ نہ سکی اور پوچھ کر ہی رہی۔فریحہ نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھرتی ہوئی بولی۔''ہاں مما اور پاپا......بعض

اوقات انسان تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لیتا ہے......مگر قدرت کے فیصلوں کے سامنے سینہ سپر ہونے سے پہلے وہ خود کو بہت طاقتور اور مضبوط سمجھتا ہے......لیکن تقدیر کے لکھے ہوئے لفظ اس کی طاقت ،غرور اور مضبوطی کا بھرم کھول دیتے ہیں۔''امتل اور اختر علی کو فریحہ یک دم سمجھدار اور دوررس نتائج دیکھنے والی سلجھی ہوئی معاملہ فہم عورت لگ رہی تھی۔

''جو بھی بات ہے وہ کھل کر کہو فریحہ!''امتل تجسس کی قائل نہ تھی۔''مجھ سے یہ سسپنس برداشت نہیں ہو پا رہا۔''

''جگنو۔''فریحہ مختصر سے بھی مختصر جواب دے کر دونوں میاں بیوی کے منہ کو تالے لگا چکی تھی۔امتل بیگم کو گھر کا قیمتی فانوس گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔اُسے یکدم لگا تھا کہ وہ جس زمین پر کھڑی ہے اُسے فریحہ نے اپنی زبان سے نکلنے والے ایک ہی لفظ کی کسّی سے کھود دیا ہے اب اُسے اس میں دفن ہونا ہے۔

''تم دیکھنا امتل بیگم! آج میرے جس بیٹے کو کتا کہہ کر دھتکار رہی ہو......کل اسی کے در پر جھولی پھیلا کر سوالی بن کر کھڑی ہوگی۔''عائشہ بی بی کے الفاظ اس کے کانوں میں زہر گھولنے لگے تھے۔اُسے گھر کی ہر چیز سے ایک ہی آواز آ رہی تھی۔''جگنو......جگنو......جگنو۔''وہ دیوانوں کی طرح کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخنے لگی۔اختر علی اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔''نہیں۔نہیں......یہ کبھی نہیں ہو سکتا......''وہ یکدم ہوش میں آتی ہوئی بولی۔

''فریحہ! میں تمام عمر تمہیں اسی حالت میں بیٹھی رہنے دونگی مگر میری ایک بات یاد رکھو! جگنو سے تمہارا نکاح کبھی نہیں ہوگا۔''وہ پاؤں پٹختی ہوئی جانے لگی تو فریحہ کی دھمکی آمیز بات نے اس کے پاؤں جکڑ کر اُسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

''میں دانیال کو اپنانے کی خاطر......سب کچھ کر سکتی ہوں......آپ کی پرائیویٹ محفلوں اور کلب ڈانس اور......''

''فریحہ!''وہ چیختی ہوئی بولی مگر اختر علی کا سر ندامت سے جھک گیا تھا۔''تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو۔''؟ مگر یہ فقرہ ادا کرنے کے بعد اُسے فوراً ہی اپنی بیوقوفی کا احساس ہو گیا۔اس فقرے کا مطلب تھا کہ وہ چور ہے اور فریحہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ حرف بحرف سچ ہے۔وہ دھیما لہجہ اختیار کرتی ہوئی بولی۔

''میرا مطلب تھا کہ......ہم......یعنی میں......تمہیں کوئی بااعتماد شخص ملوا سکتی ہوں۔''اس کی

نظریں اختر علی سے ملیں تو اختر علی نے نفرت اور حقارت سے منہ پھیر لیا۔ امتل نے کبھی نشہ کی لت میں فریحہ سے دِل کی بات کہہ دی ہوگی آج وہی اس کیلئے وبالِ جان بن گئی تھی۔ ''تم جگنو کے علاوہ اس دُنیا کے کسی بھی شخص کو کالر سے پکڑ کر لے آؤ...... میں بخوشی تمہارا نکاح اس سے کروا دوں گی...... بات کو سمجھو بے بی۔'' امتل کا انداز صلح جو تھا مگر فریحہ کا موڈ دانیال نے خراب کر دیا تھا اس نے حافظ جی والی تمام گفتگو اُسے سنادی تھی اور ایک ہی بات پر اتفاق کیا تھا کہ یہ مولوی شولوی اور بابے چھابے سب ڈھکوسلہ اور فریب ہیں اب اُنہوں نے اس بات کو چیلنج کے طور پر لیا تھا اور پھر دانیال نے یہ بھی نوٹ کر لیا تھا کہ جگنو کو روپے پیسے کی کوئی لالچ نہ تھی اور ذہنی طور پر بھی وہ انہیں بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔

''ہاں یا ناں مما!'' فریحہ اٹل ارادے اور مضبوط لہجے سے بولی تو امتل بھی لڑکھڑا گئی کیونکہ وہ اپنی ہی بیٹی کو اپنا راز دار بنا کر گھر میں ہی دشمن پیدا کر بیٹھی تھی۔ ''کیا مطلب...... سوچنے...... یہ کیا ہوگیا ہے تمہیں...... کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔'' وہ فریحہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھتی ہوئی بولی۔ اس نے آنکھ کی گھرکی سے فریحہ کو مرعوب کرنے کی بھی کوشش کی مگر آج فیصلہ ہونا ہی تھا۔

''آج شام کو پانچ بجے آپ اور پاپا عائشہ پھوپھو کے گھر جائیں گے......'' فریحہ بولی تو اختر علی کی حیرت دوچند ہوگئی۔

''مگر کیوں؟'' امتل پر شائد ابھی تک بات واضح نہ ہوئی تھی یا پھر وہ جان بوجھ کر بات کو طول دے رہی تھی۔

''جگنو اور میرے نکاح کی بات کرنے...... اینڈ دیٹس آل...... یاد رہے شام پانچ بجے۔'' فریحہ یہ کہہ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی مگر اختر علی کے ذہن میں ہزاروں کلبلانے والے شک اور نفرت کے کیڑوں کو ورغلا گئی تھی۔ امتل بے بسی کی تصویر بنی اختر علی کی طرف دیکھنے لگی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے اختر علی!'' وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی تو اختر علی نے پشت اس کی طرف کر لی۔ ''میرے گھر کو نظر لگ گئی ہے۔ جب سے تمہاری آپا اس گھر سے ہو کر گئی ہے میرا گھر اجڑ کر گیا ہے۔ اختر علی...... وہ ہے ہی منحوس صورت۔'' ...... وہ آگے کچھ نہ بول سکی کیونکہ زناٹے دار تھپڑ نے اس کی بولتی بند کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں بھی حیرت سے کھول دی تھیں۔ کتنا بھی طوفان کیوں نہ آجاتا تھا اختر علی نے کبھی بھی اس کے سامنے آنکھ نہ اُٹھائی تھی مگر آج ایسا کیا کیا کہ اختر علی کا ہاتھ بھی اُٹھ گیا اور اس کی آنکھوں میں ناچنے والی نفرت کی آگ کی تپش امتل

نے اپنے پورے وجود میں محسوس کی تھی۔

''میں نے بہت برداشت کیا امتل بیگم!'' وہ دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی کھڑی کرتا ہوا بولا۔ ''تم میری ماں جیسی بہن کو اپنی گندی زبان سے قابلِ نفرین الفاظ میں پکارتی رہی مگر میں خاموش رہا۔ تم نے بچوں کے فیصلے کو کوئی اہمیت نہ دی اور اپنی من مانی کی۔ میں چپ چاپ دیکھتا رہا۔ احمد کا گھر بسنے سے پہلے ہی اجڑ گیا وہ بھی تمہاری بیوقوفی اور بد دماغی تھی...... میں نے بیٹے کی خوشیاں قربان کر دیں...... مگر آج تمہاری نحوست نے فریحہ کو طلاق یافتہ کا لیبل لگا دیا ہے...... یہ تو اچھا ہوا کہ میں زندہ ہوں...... آج ناک سے نکلنے والی تمہاری لکیروں کو دیکھوں گا جس عائشہ آپا کو تم منحوس کہہ رہی ہو...... اپنی ہی تربیت کی ہوئی بیٹی کو دی گئی ڈیڈ لائن کو یاد رکھنا امتل بیگم!''

اختر علی کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا وہ اپنا سانس درست کرنے کیلئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ امتل بیگم ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اختر علی کا زہر میں بجھا ہوا ایک اور تیر اس کی سماعت سے ٹکرایا۔

''پرائیویٹ محفلیں...... کلب ڈانس شراب اور نجانے کیا کچھ...... چھی چھی چھی امتل بیگم! بہت ہی نیچ نکلی ہو تم۔''

''میں جانتی ہوں اختر علی!'' وہ بپھری ہوئی شیرنی کی مانند غرائی۔ ''تم باپ بیٹی مجھے عائشہ آپا کے آگے جھکانا چاہتے ہو...... مگر یہ تمہاری اور فریحہ کی بھول ہے۔'' ایک طرف سے فریحہ نکل آئی اس نے امتل کے آخری الفاظ سن لیئے تھے اس کے ہاتھ میں تصاویر کا ایک البم تھا وہ اُسے امتل کی آنکھوں کے سامنے نچاتی ہوئی بولی۔

''مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے مما کہ اس میں بہت ساری تصاویر ایسی ہیں جو پاپا نے نہیں دیکھی ہونگی۔'' امتل کے چہرے کی رنگت زرد ہوگئی تھی وہ سکتے اور گوگو کی حالت میں کبھی بیٹی اور کبھی خاوند کو دیکھ رہی تھی۔

''بات سمجھنے کی کوشش کیجئے مما!'' فریحہ نے البم اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ''میں نے آپ کے کہنے پر اپنا ابارشن کروایا تھا اور نتیجہ مجھے دانیال سے الگ ہونا پڑا...... مگر اب میں دانیال کو کسی بھی قیمت پر حاصل کروں گی۔ کسی بھی قیمت پر۔'' وہ یہ کہہ کر واپس اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ لیکن امتل کی حالت کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ پت جھڑ کے موسم میں چلنے والی بے وقت کی آندھی نے درختوں کے رہے سہے پتے بھی گرا دیئے تھے اور وہ ٹنڈ منڈ ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کا

وجود بید مجنوں کی طرح لرزنے لگا تھا۔ آنکھوں سے شعلوں کی چنگاریاں نکلتی ہوئی اختر علی کو واضح طور پر محسوس ہوئی تھیں۔

''آپ ہی اپنے دام میں صیاد آ گیا!'' اختر علی نے ایک اور طنز کا تیر پھینکا۔ ''میں شام پانچ بجے تیار ہو کر تمہارا یہیں انتظار کروں گا...... ورنہ......؟'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر وہاں سے جانا ہی بہتر سمجھا۔

امتل کی نیند اور سکون برباد کر دیا تھا فریحہ نے۔ حالانکہ امتل نے اختر علی کو اپنی زندگی میں کبھی بھی خاص اہمیت نہ دی تھی۔ اگر فریحہ اختر علی کو وہ تصاویر دکھا بھی دیتی تو کچھ خاص نہیں ہونے والا تھا...... اگر کچھ خاص نہیں ہونے والا تو پھر وہ بلیک میل کیوں ہو رہی ہے؟ اس میں ضرور کچھ راز ہوگا۔ اختر علی اپنی اس سوچ پر خود ہی شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ حقیقت میں وہ خود یہی چاہتا تھا کہ فریحہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ اس نے احمد اور آمنہ کی منگنی بچپن میں ہی طے کر دی تھی لیکن امتل کے غرور اور دولت کے تکبر کی وجہ سے وہ اپنی بات پوری نہ کروا سکا۔ اس نے پروردگار سے دُعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ احمد اور آمنہ کے سلسلہ میں اس کی عزت آبرو قائم رکھے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی دُعا سن لی تھی۔ امتل کی مرضی سے ہونے والی بہو پہلے ہی شادی شدہ تھی۔

اب بھی تقدیر اس پر مہربان ہونے والی تھی۔ فریحہ اور دانیال کی شادی اور پھر ان کی علیحدگی ہونا بھی قدرتی عمل تھا اور بہانہ بن گیا ابارشن کا۔ اور پھر حلالہ کیلئے فریحہ نے خود ہی جگنو کو چنا تھا اس کا مطلب تھا کہ جس جگہ کی اینٹ تھی وہیں لگنے جا رہی تھی لیکن اختر علی کی خواہش تھی کہ یہ اینٹ مستقل مزاجی کے پختہ سیمنٹ اور محبت کے گارے سے بالکل پکی طرح لگ جائے۔ اس نے وضو کیا اور اپنے کمرے میں جا کر جاءنماز بچھا کر رب تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے سر کو جھکا دیا اور دِل کو صدا کو آنسوؤں کے رستے آنکھوں سے بہا بہا کر اللہ تعالیٰ سے التجائیں کرنے لگا۔

وہ جوں جوں دُعائیں مانگتا جاتا اس کا دِل ہلکا ہوتا جاتا آنسوؤں کے نذرانوں میں وہ رب تعالیٰ سے بیٹی کی خوشی اور سدا سہاگن رہنے کی دُعائیں مانگ رہا تھا۔ اس کا دِل بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے کنارے رونے کی وجہ سے سوج گئے اور ان کی سُرخی نمایاں ہو گئی تھی۔ اس نے رب تعالیٰ کے حضور اپنا مدعا خاموشی کی زبان میں پیش کیا تھا۔ اس کی زبان اور ہونٹ غیر متحرک تھے لیکن آنسوؤں کی زبان رب واحد سے کلام کر رہی تھی۔ دِل اور پورے وجود کی ایک ایک رگ خدا وند کریم سے ملتمس تھی کہ وہ اختر علی کی خواہشات کو اپنی رحمتوں کا لبادہ اوڑھا دے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے وجود کو ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ اس کے لرزتے ہونٹوں نے خاموشی سے اپنی بات کہہ دی تھی۔ سانسوں کی روانی احتراماً باادب ہو کر رب کے حضور اپنا مدعا بیان کرنے میں کامیاب ہو گئیں تھیں۔ یا نہیں...... یہ رب تعالیٰ بہتر جانتا تھا۔

امتل ٹھیک پونے پانچ بجے تیار ہو کر ڈرائینگ روم میں کھڑی تھی۔ اختر علی کیلئے یہ تبدیلی خوشگوار تھی اس نے کوئی بھی بات کیئے بغیر امتل سے باہر آنے کا کہا۔ مدتوں بعد وہ ایک گاڑی میں کہیں جا رہے تھے۔ اختر علی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتا ہوا بولا۔

''آپا عائشہ سے تم ہی بات کرنا۔'' گاڑی کوٹھی سے نکل چکی تھی۔ امتل اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی وہ غصے میں تلملا رہی تھی مگر کچھ بھی نہ کر سکتی تھی کیونکہ اختر علی اور فریحہ نے اُسے بلیک میلنگ کے شکنجے میں اچھی طرح جکڑ لیا تھا۔

گاڑی ابراہیم کے گھر کے باہر جا کر کھڑی ہو گئی تھی یہ وہ وقت تھا جب ابراہیم ریڑھی واپس لیکر آ جاتا تھا۔ اب بھی ریڑھی گھر کے باہر کھڑی تھی امتل نے مکان کی طرف دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی اور اس کی نگاہ ریڑھی پر پڑی تو اُسے فریحہ کی سوچ پر افسوس ہونے لگا۔

''اس بیوقوف لڑکی کو بھی یہی کھنڈر ملا تھا۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔ اختر علی نے دروازے کی کُنڈی کھٹکھٹائی تو خلاف توقع دروازہ جگنو نے کھولا وہ حیرانگی سے ماموں اور ممانی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی رالیں ٹپک ٹپک کر اس کی قمیض کو گیلا کر رہی تھیں۔

امتل نے آج پہلی بار اس کی طرف غور سے دیکھا تھا اس کا دایاں ہاتھ اور پاؤں بھی معذور تھا مگر شکل وصورت خوبصورت تھی۔ فریحہ کی بات درست تھی کہ وہ انہیں کبھی بھی بلیک میل نہیں کر سکتا اور نہ ہی اُسے طلاق دینے میں ہچکچائے گا۔ امتل کو بڑی حیرت ہوئی جب جگنو نے اُنہیں اچھے الفاظ میں خوش آمدید کہا۔

''اللہ کی قدرت ہے آج کنواں پیاسے کے پاس چل کر آیا ہے۔'' امتل کو اتنی دور بینی اور سمجھداری کی بات کی جگنو سے توقع نہ تھی مگر وہ جگنو تھا۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا۔

''کیسے ہو جگنو؟'' اختر علی نے اس سے پوچھا اور اندر داخل ہوتے ہی اس سے مصافحہ کرنے کیلئے ہاتھ آگے بڑھایا تو جگنو حیرت واستعجاب سے اس کی طرف دیکھنے لگا وہ کبھی اختر علی کی طرف اور کبھی اپنے ہاتھ کی طرف دیکھتا تھا۔

''ماموں جی!'' وہ اپنا ہاتھ قمیض میں لپیٹتا ہوا بولا۔ ''میرے ہاتھ گندے ہیں اور ٹھیک بھی

نہیں۔" جگنو نے آخری الفاظ بڑے کرب میں ادا کیے تھے مگر اختر علی نے اُسے مزید حیران کر دیا جب اس نے جگنو کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

"میں آج بہت خوش ہوں جگنو۔" اتنی دیر میں اندر سے عائشہ آپا اور آمنہ بھی نکل آئیں۔ آمنہ ان دنوں بیڈ ریسٹ کی غرض سے آئی ہوئی تھی۔ عائشہ بی بی تو حیرت سے بھائی اور بھابی کو دیکھنے لگیں اُنہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ امثل خود چل کر گھر آئی ہے۔

"بسم اللہ بسم اللہ...... آج میرے آنگن میں بھی چاند اترا ہے۔" عائشہ بی بی آگے بڑھ کر مسکراتی ہوئیں امثل کی طرف بڑھیں اور حیران و پریشان امثل کو گلے لگا لیا۔ "آج ہم غریبوں کو کیسے یاد کر لیا۔" عائشہ بی بی کی خوشی دیدنی تھی وہ اُنہیں لیتی ہوئی صحن میں آ گئیں۔ آمنہ نے بھی ساس اور سُسر کو سلام کیا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس رشتے سے صرف امثل بے خبر تھی۔ جگنو کی خوشی دیدنی تھی جبکہ آمنہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی اس نے چور نظروں سے اختر علی کی طرف دیکھا تو اس نے اشاروں ہی اشاروں میں اُسے تسلی دی کہ اس کی شادی خفیہ ہی ہے۔ وہ بے فکر ہو کر جائے۔ وہ صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ آمنہ پرسکون انداز میں آگے کچن کی جانب بڑھ گئی اور دوسرے کمرے سے ابراہیم اپنا حقہ لیکر باہر آیا تو اختر علی اس کے احترام میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ امثل کو مجبوراً اس کی پیروی کرنا پڑی۔ ابراہیم نے اختر علی سے ہاتھ ملایا اور امثل کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو وہ مزید حیران ہو گئی۔ امثل اپنی جگہ پر حیران کھڑی تھی کہ وہ اپنے گھر میں ان لوگوں کے ساتھ کتوں اور ملازموں جیسا سلوک کرتی ہے لیکن اس کے آنے کی خوشی ان لوگوں کے چہروں سے عیاں تھی۔

ابراہیم اور عائشہ بی بی ان دونوں کو اکٹھے دیکھ کر یہی بات سوچ رہے تھے کہ کہیں امثل کو احمد اور آمنہ کی شادی کا پتہ تو نہیں چل گیا۔ جگنو نے کرسیاں رکھ دی تھیں۔ وہ لوگ چارپائی سے اُٹھ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"امثل! آج تو تم نے مجھے حیران ہو کر دیا۔" عائشہ بی بی نے بات شروع یا پھر اپنے اندر کا خوف باہر نکالا کہ امثل کدھر آ گئی ہے۔ مگر اس بات کا ان کوئی جواب نہ ملا امثل رسمی سی مسکان ہونٹوں پر سجا کر خاموشی اختیار کر گئی۔

"وہ دراصل کیا ہے کہ...... کوئی بھی دوسروں کی مدد نہیں کرنا چاہتا...... اس لیے اپنی مدد آپ ہی کرنے کیلئے آ گئے ہیں۔" اختر علی نپے تلے انداز میں بولا تھا کیونکہ اس کے سامنے ان پڑھ

فلاسفر بیٹھا ہوا تھا جو اس کا بہنوئی بھی تھا اور باپ بھی۔ اس نے بالکل باپ کی طرح اختر علی کو پال پوس کر اس معاشرے میں اپنے قدموں پر کھڑا کیا تھا۔

"ہر شخص صرف اپنے لئے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ ایک دوسرے کی مدد کیلئے پیدا کیا گیا ہے تبھی تو دُنیا کا نظام قائم ہے۔" وہی ہوا تھا جس کا اختر علی کو انتظار تھا۔ ابراہیم نے اس کی مدد والی بات کو پکڑ کر اچھا خاصا فقرہ سنا دیا تھا اور مزید بولا تھا۔ "کسی کی مدد کر کے ظاہر نہ کرو یقین کرو تمہاری مصیبت میں غیبی ہاتھ خود بخود تمہاری مدد کو پہنچ جائے گا۔" امثل حیرت سے اس ان پڑھ سبزی فروش کی باتیں سن رہی تھی جو بڑے بڑے فلاسفر یا مفکر بھی نہیں کرتے تھے۔ اتنی دیر میں چائے بن کر آ گئی۔ آمنہ نے چائے اور کچھ لوازمات جو اس نے اپنے کھانے کیلئے احمد سے منگوائے تھے ان کے سامنے رکھ دیئے۔ امثل آمنہ کی خاموشی اور مہمان نوازی کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"دراصل ہمارے آنے کا مقصد تھا کہ......" اختر علی نے بات شروع کی عائشہ آپا نے بات کاٹ دی۔

"مدتوں بعد میرے گھر میں آئے ہو باتیں تو جی بھر کروں گی۔ پہلے چائے پی لو۔" اُنہوں نے ایک کپ امثل کی طرف بڑھایا اور ایک اختر علی کو دینے کے بعد ابراہیم کو بھی کپ پکڑا دیا جبکہ وہ پیالی میں چائے پینے کا عادی تھا۔ مگر موقع اور وقت کا تقاضا یہی تھا کہ کپ سے ہی ہونٹ اور کلیجے کو جلایا جائے۔ اس دوران امثل کی نظریں گھر کی خستہ حالی کا طائرانہ جائزہ لیتی رہیں۔ اُسے فریحہ کی سوچ پر شرمسار ہونا پڑ رہا تھا۔

"امثل آپ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔" چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد اختر علی نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا تو امثل کے تن بدن میں آگ لگ گئی وہ سمجھ گئی کہ اختر علی اس کے منہ سے جگنو اور فریحہ کی بات نکلوانا چاہتا ہے۔ امثل بات کو سوچ سمجھ کر کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ حلالہ کی بات ان لوگوں سے نہیں کرنا چاہتی تھی چہ جائیکہ یہ لوگ متنفر ہو جائیں اور وقتی شادی پر رضامند ہی نہ ہوں۔ وہ الفاظ کو ناپ تول کر بولی۔

"آپا جی! بات دراصل یہ ہے کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات والی بات ہے۔" امثل اختر علی کی طرف دیکھنے لگی کہ وہ اس سلسلہ میں کچھ مدد کرے لیکن وہ جگنو سے مصروف گفتگو تھا اور امثل جانتی تھی کہ اس کے کان ادھر ہی ہیں۔ اس لیئے یہ زہر اُسے ہی پھانکنا تھا۔ "میں نے غصے میں آپ کو بہت بُرا بھلا کہا۔ میں کافی شرمندہ ہوں۔" ابراہیم اور عائشہ بی بی کیلئے یہ خبر حیران کن تھی۔ ایک تو

زندگی میں پہلی بار امتل کا ان کے گھر آنا اور پھر سونے پہ سہاگہ یہ کہ وہ اپنی زبان سے اپنی غلطیوں کا اعتراف بھی کر رہی تھی بلکہ شرمسار ہو کر معافی بھی مانگ رہی تھی۔ ابراہیم نے محسوس کیا کہ امتل کو اپنی غلطی کا احساس ہے اس لیئے وہ فوراً بولا۔ ”کوئی بات نہیں امتل! تم میری بہن جیسی ہو۔ اور بہن بھائیوں میں تو اونچ نیچ ہو ہی جاتی ہے۔“ آمنہ بھی اپنی ساس کی زبان میں لچک کو معنی خیز انداز میں لے رہی تھی۔ جبکہ امتل نے ابراہیم کے الفاظ پر دِل ہی دل میں اس رشتے کو تسلیم کرنا تو درکنار لعنت بھیجنا شروع کر دی کیونکہ وہ امیر اور کروڑ پتی تھی اور ابراہیم معمولی سبزی فروش تھا مگر مجبوری اس رشتے کو تسلیم کروانے پر مجبور کر رہی تھی۔

”آپ کو تو علم ہی کہ فریحہ کی غلطیوں کی سزا ہم سب بھگت رہے ہیں۔ اب جوان بیٹی کو گھر تو نہیں بٹھا سکتے...... دراصل ہم سب چاہتے تھے کہ جگنو بیٹے کا نکاح اگر سادگی کے ساتھ فریحہ سے کر دیا جائے تو...... آپ کی مہربانی ہوگی۔“ امتل نے کبھی کسی کے سامنے درخواست نہ کی تھی اور کبھی بھی معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہ کیا تھا اس لیئے وہ الفاظ کو استعمال کرنے کا فن نہ جانتی تھی۔ وہ تو غرور اور تکبر میں بھرے ہوئے الفاظ کی کھلاڑی تھی بلکہ ماہر کھلاڑی۔

ابراہیم، عائشہ بی بی اور آمنہ کیلئے یہ الفاظ نہیں بلکہ حیران کن خبر تھی کہ جس جگنو کو کبھی امتل نے کتے کی طرح دھتکار کر گھر سے نکال دیا تھا۔ آج ایک سوالی بن کر اُسے اپنا بیٹا بنانے کیلئے نازو نعم سے پلنے والی بیٹی کا رشتہ دے رہی تھی۔ ابراہیم اور عائشہ تو اپنی سماعت کو مشکوک قرار دینے لگے تھے لیکن امتل کی بات حقیقت تھی کیونکہ اختر علی نے بھی بات میں لقمہ دے کر اپنا فرض ادا کرنا ضروری سمجھا تھا۔

”آپ لوگ امتل کی پرانی باتوں کا برا مت منایئے اور سادگی سے جگنو کا نکاح فریحہ کے ساتھ کر دیتے ہیں۔ ہم دونوں گھروں کی عزت رہ جائیگی۔“ ابراہیم کو بھلا کہا اعتراض ہو سکتا تھا اور جگنو تو ماموں کی بات سن کر شرم و حیا سے دوہرا ہو رہا تھا اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ساس اور سُسر کی موجودگی میں اُٹھ کر ناچنا شروع کر دیتا۔

”ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے...... بس آپ لوگوں کی خوشی ہمیں درکار ہے۔“ ابراہیم کی طرف سے لائن کلیئر ملنے کی دیر تھی کہ امتل نے سکون کی لمبی سانس لی اُسے یکدم محسوس ہوا کہ اس کے کندھوں سے منوں بوجھ اتر گیا ہے۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ”تو پھر ٹھیک ہے...... آپ لوگ اگلے اتوار کو سادگی سے تشریف لائیں تاکہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک انجام پہنچایا جائے۔“ وہ اور اختر علی

اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تو عائشہ بی بی اور ابراہیم بھی ان کو رخصت کرنے کیلئے کھڑے ہوئے تو عائشہ بی بی بولیں۔ ”میں تو کہتی ہوں امتل کہ ہمیں دو ایک ماہ کا وقت دو تا کہ ہم فریحہ بیٹی کے لیئے کو بری وغیرہ تیار کر لیں۔“

”جتنے روپوں کی تم بری تیار کرو گی اتنا خرچہ میری بیٹی ایک ہفتے میں کر لیتی ہے۔“ امتل نے دِل میں سوچا اگر وہ یہ الفاظ منہ سے ادا کر دیتی تو پھر بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا تھا اس لیئے اس نے زبان پر قابو ہی رکھا۔ ”کوئی بات نہیں آپا! جو اس کے مقدر کا ہوگا اُسے نکاح کے بعد بھی مل جائیگا۔ ماشاء اللہ ادھر ہی رہنا ہے اس نے۔“ اتنی لچک اور باتوں میں اتنی محبت ابراہیم تو شک کی نگاہ سے اختر علی کی طرف دیکھنے لگا لیکن اس کا چہرہ مطمئن اور خدوخال پر سکون دیکھ کر ابراہیم کو بھی امتل کی باتوں پر یقین کرنا پڑا۔

”تو پھر ٹھیک ہے...... ہم اگلی اتوار چند چیدہ چیدہ بندوں کی بارات لے کر آ جائیں گے۔“ امتل نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گئی جگنو تو فرط جذبات سے ناچنے لگا تھا۔ اختر علی نے اُسے مذاق میں چھیڑا۔

”جگنو...... تمہاری شاٹس آ گئی......“ وہ یکدم سہم کر رک گیا تو صحن میں قہقہوں کا طوفان اُمڈ آیا۔ آمنہ بھی تمام باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اختر علی مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اتنی دیر میں امتل گاڑی سیدھی کر چکی تھی۔ اختر علی نے ابراہیم سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ”ایک بار پھر میری عزت رکھنے کا شکریہ!“ عائشہ بی بی نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”ماں کا ظرف بہت وسیع ہوتا ہے اختر علی!“ وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ابھی گاڑی چند فٹ ہی چلی ہوگی کہ سامنے سے آنیوالی گاڑی کی وجہ سے راستہ بند ہو گیا مگر آنیوالی گاڑی کو دیکھ کر امتل اپنی گاڑی سے باہر نکل آئی تھی جبکہ اختر علی اور ابراہیم اور عائشہ بی بی اپنی اپنی جگہوں پر ساکت ہو گئے تھے۔

”احمد تم!“ امتل کے منہ سے نکلا تو آنیوالی گاڑی کا مالک جو کہ احمد تھا وہ گڑبڑا کر ماں اور باپ کو دیکھ رہا تھا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ احمد نے اپنی گڑبڑ پر قابو پایا اور بولا۔

”کیا مطلب...... کہ یہاں کیا کر رہا ہوں...... مما...... ادھر ایک فیکٹری ہے...... میں تو اکثر آتا جاتا رہتا ہوں۔“ اپنے تئیں اس نے امتل کو مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر شک کی لکیر امتل کی پیشانی پر واضح ہو گئی تھی۔ ”وہ تو کئی سالوں سے ہمارے ریگولر کسٹمرز ہیں۔“

"اوہ!" امثل کے ہونٹ سکڑ گئے۔ احمد اپنی گاڑی ریورس کر چکا تھا اور امثل اپنی گاڑی آگے بڑھا لے گئی۔ احمد کے ساتھ ساتھ ابراہیم اور عائشہ بی بی نے بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ آج تو بال بال بچے تھے۔

☆☆☆

اُس کی یہ حالت کیسے ہوگئی تھی وہ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا معلوم تھا کہ گھر سے بہت دور نکل آیا ہے۔ پاؤں کے تکلیف دہ چھالوں نے اس سے چلنے کی رہی سہی کسر بھی چھین لی تھی لیکن وہ ہاتھ میں کشکول پکڑے پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ صحراؤں اور بیابانوں کو پار کرتا ہوا شہر در شہر گھومتا ہوا ایک بستی میں پہنچ گیا تھا وہ کئی روز کی بھوک برداشت کر رہا تھا پیاس کی وجہ سے اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے لیکن کوئی بھی اُسے پانی اور کھانا نہ دے رہا تھا۔

وہ جس کسی کے آگے بھی اپنا کشکول کرتا لوگ نفرت سے اُسے دھتکار دیتے۔ کچھ تو اس کی حالت دیکھ کر بلند قہقہوں سے اس کا استقبال کرتے تھے۔ وہ اسی طرح دیوانہ وار پھرتا ہوا اس بستی میں آ پہنچا تھا کہ بھوک اور پیاس کے ساتھ ساتھ گرم موسم کی شدت نے بھی اس کی حالت بگاڑنے میں مدد کی تھی۔ وہ نڈھال ہو کر ایک جگہ پر بیٹھ گیا اس کا سانس پھولا ہوا تھا وہ ایک دیوار کے سائے میں بیٹھا دور سامنے دیکھ رہا تھا کہ ایک مشکیزہ بردار اُسے پانی پینے کیلئے آوازیں دے رہا تھا۔ اس کی ہمت اور طاقت جواب دے گئی تھی مگر پانی کی طلب نے اس کی پیاس کو بھول جانے پر مجبور کر دیا کہ وہ تھکا ہوا نڈھال مسافر ہے وہ دیوانہ وار بھاگنے لگا مگر یہ کیا مشکیزہ بردار اس کے آگے آگے بھاگنے لگا اس کی دوڑ بھی کافی تیز تھی مگر نڈھال مسافر اپنی پیاس بجھانے کیلئے اُسے آوازیں دینے لگا۔

"رک جاؤ...... میرے بھائی...... مجھے پیاس لگی ہے...... ٹھہرو...... رکو...... میں کئی دنوں سے پیاسا ہوں۔" مگر وہ پکڑنے کیلئے بھاگتا گیا۔ پیچھے بھاگنے والے نے اپنا سانس درست کرنے کیلئے رُک کر ادھر ادھر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ مشکیزہ بردار کہیں گم ہو گیا تھا کیونکہ وہ ہر طرف سے خواتین و مرد کے جھرمٹ میں گھرا ہوا تھا مگر حیرت کی بات تھی کہ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا سبھی لوگ اپنے اپنے کام کے سلسلے میں آ جا رہے تھے۔ وہ اپنا سانس درست کر کے ایک سمت کو بڑھ گیا ادھر قدرے ہجوم زیادہ تھا۔

وہ بھوکا پیاسا چلتا ہوا گر جاتا تو خود ہی اُٹھ بھی جاتا ٹانگوں نے چلنے سے انکار کر دیا تھا پیٹ

میں پتھر پڑے ہوئے تھے۔ حلق کانٹوں سے بھی زیادہ خشک ہو گیا تھا وہ ایک بازار تھا جس میں طرح طرح کی چیزیں فروخت ہو رہی تھیں وہ ہر کھانے والی چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا اور دِل کرتا کہ اس کا مالک وہاں نہ ہو اور وہ تمام چیزیں کھا جائے مگر چیزیں بیچنے والے ان پر براجمان تھے اور اپنی دکانداریوں پر مسلسل نظریں جمائے ہوئے تھے۔

"عشق دی راہ بڑی اوکھی۔ جے کوئی ٹرے تے یار ملا دیندا"

اس کے کانوں میں آواز گونجی تو وہ صدا لگانے والے کو ڈھونڈنے لگا۔ اتنی بھیڑ میں اس کی نظروں کی داد دینی چاہئے کہ اس نے ایک شخص کو دیکھ لیا جو ان اشعار کو پڑھ رہا تھا وہ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ جیسے ہی ایک بازار کا موڑ مڑا اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ اپنے اردگرد سے بیگانہ ہو کر تھر تھر کانپنے لگا۔ جیسے کوئی مجرم "بڑے صاحب" کے سامنے کانپتا ہے۔ جیسے کوئی چور' خطا کار' سزاوار' گناہگار اپنے مالک کے سامنے کانپتا ہے۔ مگر اس کے سامنے نہ کوئی بڑا صاحب تھا اور نہ کوئی مالک تھا بس ایک گنبد تھا جس کا رنگ سبز تھا اس کی نورانی شعاعیں اردگرد کے تمام علاقہ کو منور کر رہی تھیں مگر وہ روشنی اس کے دِل کے خانوں میں اتر گئی تھی۔ اس کی بھوک پیاس یکدم ختم ہو گئی تھی۔ وہ گنبد خضریٰ کو روتی آنکھوں سے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی شہنشاہ کے دربار میں مجرم بن کر آ گیا ہو۔ مگر وہ کسی شہنشاہ کے سامنے نہیں بلکہ شاہوں کے شاہ۔ والیٔ کائنات' سرورِ جان' جانِ رحمت' شمعِ بزمِ ہدایت۔ مغربوں اور مشرقوں کے رب کے پیارے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہ میں کھڑا تھا۔ اس کا سر احترام میں جھک گیا تھا۔ دھڑکنیں باادب ہو گئیں۔ ناہموار سانسیں یکدم اعتدال پسند ہو گئیں۔ جسم کے بال احتراماً کھڑے ہو گئے تھے۔ کانپتی لرزتی ٹانگیں اپنی کم ہمتی اور کمزوری پر ماتم کرنے لگیں۔ دِل کی دھڑکن یکدم تیز ہوئی جیسے کوئی گاڑی پیچھے سے تیز آتی ہے اور اپنے ساتھ دھوڑ' دھواں اور مٹی کا گرد و غبار لاتی ہے بالکل دھڑکنوں کی رفتار یکدم تیز ہو گئی تھی دِل خون کا سمندر اپنے ساتھ لا کر سینے کی کمزور دیواریں توڑ کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے نذرانے قطار در قطار بہہ رہے تھے۔ گنبد خضریٰ کی طرف اس کی نگاہیں اُٹھیں اور یکدم جھک گئیں اس کی آنکھوں نے ایک بوسہ لینے کی جرات کی تھی کہ دل چیخ اُٹھا تھا روح پکار اُٹھی تھی۔

"صَلُّو عَلَیهِ و آلِہٖ . صَلُّو عَلَیهِ و آلِہٖ"

اُس نے اپنی چھید شدہ جھولی اُٹھا کر گنبد خضریٰ کی جانب دیکھنے کی جرات کی اور منہ سے

سسکیوں کی صورت میں الفاظ نکلنے لگے۔ ''شہنشاہوں کے شہنشاہ! میں حقیر پر تقصیر گناہگار ہوں گناہوں سے لتھڑا ہوا تیری بارگاہ میں کھڑا ہوں' میرے گناہوں کی فہرست طویل ہے مگر آپ رحمۃ للعلمین ہیں۔ آپ کو ان پتھروں اور کنکروں کا واسطہ جو آپ کی ذاتِ مقدس پر دن رات درود و سلام پڑھتے ہیں اور تا قیامت پڑھتے رہیں گے۔ میرے آقاؐ! شجر و حجر' دریا' پہاڑ' جاندار اور بے جان۔ غرض کہ کائنات کی ہر چیز آپ کی مقدس چوکھٹ کی سوالی ہے۔ مجھ گناہگار کو بھی نواز دیجئے۔ ہر کوئی جھولیاں بھر بھر کر لیجا رہا ہے...... میرے دِل کے کاسہ میں اپنا عشق ڈال دیجئے...... میری خالی جھولی کو اپنی حُب سے لبالب بھر دیجئے...... پیارے آقاؐ...... کیا کروں...... کیا کروں...... میری جھولی تو چھید شدہ ہے...... بس...... میرے دل کے کشکول کو اپنی محبت اور عشق سے بھر دیجئے۔'' اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ وہ دیوانہ وار رونے لگا۔ لوگ اس کی حالت کو دیکھ کر ترس کھانے لگے۔ اس کے منہ سے رالیں بہہ کر اس کے قمیض کو بھگونے لگی تھیں۔ آنسوؤں کی کوئی قیمت نہ تھی مگر جس چوکھٹ پر بہائے جا رہے تھے وہ ایسے ہی آنسوؤں کے قدردان تھے۔ تبھی تو اس کے پاس سے ہی ایک آواز اُبھری۔

''تاوانِ عشق ادا کر سکو گے؟''

وہ حیرت سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا مگر کوئی بھی اُس کے پاس نہ تھا۔ سبھی اپنی اپنی جگہ پر جھولیاں پھیلائے کھڑے تھے اور باری باری سب کو ہی مل رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہی صدا پھر گونجی۔ اس بار اُس نے آنکھیں نہ کھولیں اور اونچی آواز میں بولا۔ ''ہاں...... ہاں...... میں عشق کو سرخرو کروں گا۔ میں اپنی جان کا نذرانہ دے کر بھی عشق کا تاوان ادا کروں گا...... عشق کی فتح میری زندگی کی آخیر پر ہو گی۔ میرا عشق فتح حاصل کرے گا...... میں تاوانِ عشق ادا کروں گا۔''

وہ اپنی الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی تیورا کر گرا تو اس کا سر مسجد نبوی کے صحن میں لگے ہوئے خوبصورت سنگ مرمر کے پتھروں سے ٹکرایا تو میٹھی سی درد کی کراہ نکل گئی مگر وہ یکدم ہوش میں آ گیا۔

کلیم اللہ کی آنکھ کھلی تو وہ ایک ہسپتال میں اور اس کے گرد پوری چوپڑہ فیملی کھڑی تھی وہ حیرت سے ان سب کے چہروں کو باری باری دیکھنے لگا۔ پوجا بھابی۔ گنگنا۔ کاجل۔ موہن چند۔ مہارانی اور پھر اس کے قدموں کی طرح چہرے کے بالکل سامنے پرساد چوپڑہ خود کھڑا تھا کلیم اللہ کو سر کی چوٹ کی درد کا احساس ہوا تو اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سر پر گیا جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

اُسے تمام واقعات یاد آنے لگے وہ مسجد میں وضو کر کے آسمان کی جانب منہ اور شہادت کی انگلی کھڑی کر کے اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کی گواہی دے رہا تھا کہ آنکھوں نے دِل و جان کو تڑپا دینے والا منظر دِکھا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ بے ہوش کر گر پڑا تھا مگر وہ جیسے ہی دُنیا و مافیا سے بے خبر ہوا تھا اس کی سونے والی قیمت جاگ گئی تھی وہ ایک کھلے ہارے مسافر کے روپ میں پیدل مدینے شریف تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور وہ بھوک و پیاس سے نڈھال ہو گیا تھا مگر یونہی اُسے گنبد خضریٰ نظر آیا تو اس کی عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنی پھٹی ہوئی جھولی پھیلا کر آقائے تاجدار مدینہ سے اُن کی ذات مقدس کا عشق مانگنا شروع کر دیا تھا مگر آواز مسلسل نے اس سے حلف لیا تھا کہ وہ تاوانِ عشق ادا کرے گا۔

اُس نے بے اختیار ہو کر اپنی قمیض کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں یہ تو وہی قمیض تھی جو اس نے مدینہ شریف میں گنبد خضریٰ کے سائے تلے دُعا مانگتے ہوئے پہن رکھی تھی اس نے قمیض کو پھیلا کر دیکھا تو دِل کو دھڑکنیں درود شریف کے ورد کرنے لگیں کیونکہ جس جھولی کو جگہ جگہ سوراخوں نے بھدا کر دیا تھا اب وہاں وہاں سبز رنگ کے کپڑے سے پیوند لگے ہوئے تھے۔ اس کی جھولی سِل گئی تھی اُسے آقائے تاجدار مدینہ کے عشق کی رتی بھر بھیک مل گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے پانی جاری ہو گیا۔ آنسو پیہم بارش کی طرح بہنے لگے تو اردگرد کھڑا تمام ہندو خاندان پریشان ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔

''اب بھی تمہارا کیا خیال ہے کندن!؟'' پرساد چوپڑہ اپنے قیمتی وقت سے وقت نکال کر مہارانی کے اصرار پر ہسپتال پہنچا تھا۔

''جھولی ہی میری تنگ تھی کیا مانگتا اُنؐ سے
جھولی کو میری بھر بھر کے کہا اور بھی کچھ مانگ''

ان الفاظ کے ساتھ ہی کلیم اللہ کی کیفیت ہذیانی ہو گئی تھی وہ اونچی اونچی آواز میں رونے لگا تو پرساد چوپڑہ کے ہمراہ آیا ہوا تمام خاندان پریشان ہو گیا۔ چند منٹ بعد اس کی کیفیت نارمل ہوئی تو اس نے مہارانی سے پوچھا۔

''میں یہاں کیسے پہنچا؟'' مہارانی جواب دینا چاہتی تھی کہ چوپڑہ طنز کے نشتر برسانے لگا۔

''جس مسجد میں تم گھسے تھے اس کی انتظامیہ نے تمہیں مسلمان ماننے سے انکار کرتے ہوئے وہاں سے دھتکار دیا ہے اور تمہارے بے ہوش ہو کر گرنے کے بعد کسی جان پہچان والے شخص نے

تمہیں یہاں پہنچایا اور ہمیں اطلاع کر دی۔'' اس کی آنکھیں خوفناک حد تک پھیل گئیں تو کلیم اللہ کو چوپڑہ کی شکل میں شیطان نظر آنے لگا۔ ''اور تم جسے ہسپتال کا کمرہ سمجھ رہے ہو وہ تمہارے ہی گھر کا ایک حصہ ہے۔'' اس خوفناک خبر نے کلیم اللہ کو لرزا دیا وہ غور سے کمرے کے در و دیوار دیکھنے لگا تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ اپنے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں موجود ہے کیونکہ تمام فیملی کا موجود ہونا اور اس کے اونچی آواز میں رونے پر بھی کسی ڈاکٹر کا نہ آنا تو اس کی سمجھ میں آ رہا تھا مگر اس کمرے کو ہسپتال کا کمرہ ظاہر کرنے کا کیا مطلب تھا اور اس کا کیا مقصد تھا؟ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ پرساد چوپڑہ فون پر کسی سے بات کرتا ہوا باہر نکل گیا تو اس کے ذہن میں اُلجھنے والی گتھی کاجل نے سلجھا دی۔

''دراصل ڈاکٹرز نے تمہاری حالت دیکھی تو تم کچھ نہ کچھ منہ میں بڑبڑا رہے تھے گزشتہ تین دِنوں سے تم کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔ تمہیں کوئی ہوش نہ تھا۔'' وہ کاجل کے منہ سے حیرت انگیز انکشاف سن رہا تھا اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ''ڈاکٹرز نے بتایا کہ خطرہ ہے کہ تم کومہ میں نہ چلے جاؤ...... اور اگر تم ہوش میں آ کر فوراً اپنے گھر کو دیکھو گے تو تمہارے اب نارمل ہونے کے زیادہ چانسز ہیں...... انکل تمہیں تمہاری جان کے دشمن مسلمانوں کے پاس نہیں چھوڑ سکتے تھے اس لیے اس کمرے کو ہسپتال کا کمرہ بنانا پڑا۔'' کاجل کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو باہر نکل گئی۔

موہن چند اور کاجل بھابی بھی باہر نکل گئے تو کنگنا نے آگے بڑھ کر اس کے بازو پر راکھی باندھ دی اور باہر چلی گئی۔ مہارانی کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ''واپس لوٹ آؤ کندن...... یا پھر...... یا پھر پاکستان چلے جاؤ۔'' وہ یہ کہہ کر باہر گئی تو کندن (کلیم اللہ) حیرت و استعجاب میں مبتلا ان لوگوں کی باتوں پر غور کرنے لگا۔

اُس نے اپنی حالت پر غور کرنا شروع کر دیا۔ ''کیا وہ تین دن سے بے ہوش تھا۔ دُنیا و مافیا سے بے خبر ہو کر اس کے تین دِن گزر گئے۔'' وہ خود ہی سوچنے لگا۔ ''نہیں نہیں...... وہ بے ہوش نہیں تھا۔'' اس کے اندر سے آواز آئی۔ ''وہ تو عشق کی مستی اور سرور میں دیوانہ وار مرکزِ عشق کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ مگر شیطان ملعون اپنا وار کرتے پرساد چوپڑہ کی شکل میں آن پہنچا تھا۔

''کیا ملا تمہیں؟'' اس نے آتے ہی زہریلا لہجہ اختیار کیا اور بولنا شروع کر دیا۔ ''مسلمان [illegible] اوہ'' وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا اور اپنی بکواس بھی جاری رکھی ہوئی تھی۔ وہ جتنا بڑا

آدمی تھا اس کا ظرف اتنا ہی چھوٹا تھا۔ وہ کم ظرف اور چھوٹے دِل کا مالک تھا۔

کلیم اللہ اس کی طرف خاموشی سے دیکھے جا رہا تھا۔ کیونکہ اس کا سوچنا صحیح تھا اور پرساد چوپڑہ کا بھڑکنا صحیح تھا کیونکہ چوپڑہ کی پونچھ پر کلیم اللہ کا پاؤں آ گیا تھا۔ اور انسان کا پاؤں اگر جانور کی پونچھ پر آ جائے تو وہ تڑپنے لگتا ہے کاٹنے کو دوڑتا ہے اس لمحہ یہی پوزیشن اور حالت پرساد چوپڑہ کی تھی وہ غرانے والے لہجہ میں کلیم اللہ سے بات کر رہا تھا۔

''بڑا اتراتے تھے مسلمان بن کر۔ لیکن کیا کیا مسلمانوں نے تمہارے ساتھ مسجد سے باہر پھینک دیا۔ کیونکہ تم ان کی نظروں میں پروفیسر فائز احمد کے قاتل ہو...... میں تمہیں کبھی بھی زندہ نہ چھوڑتا مگر کیا کروں؟'' وہ کفِ افسوس ملنے لگا۔ ''تم سے میرا بہت قریبی رشتہ رہا ہے...... یہ سب ڈھکو سلے چھوڑ دو...... کوئی اللہ نہیں ہے (نعوذ باللہ) سب کچھ وہ ہے...... وہ جو ہمارے صحن میں ہمارے گھر میں...... ہماری آنکھوں کے سامنے...... مورتی کی صورت میں ہے۔'' وہ باہر کھڑی بھگوان کی مورتی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

''کبھی پاکستان گئے ہو چوپڑہ''؟ بالکل غیر متوقع سے سوال نے چوپڑہ کو مجبور کر دیا کہ وہ کلیم اللہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی بات کا جواب دے۔ ''نہیں...... کبھی نہیں...... اور نہ ہی میں اس ملک کو تسلیم کرتا ہوں جسے میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔'' وہ گردن اکڑا کر بولا۔ ''دیکھا تو میں نے بھی نہیں...... مگر سنا ہے کہ وہاں مساجد کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ پورے ہندوستان میں اتنی تعداد میں مندر نہیں ہونگے۔'' ایک اور دباؤ چوپڑہ کی پونچھ پر پڑا وہ درد کی شدت سے کراہ کر رہ گیا۔ ''میرا مشورہ مانو تو اس گھر کو ایک مسجد میں تبدیل کروا دو...... کیونکہ میں چاہتا ہوں...... تمہاری آخرت سنور جائے اور روزِ محشر جب تم اُٹھو تو جنت میں تمہارا گھر تمہارا منتظر ہو اور تمہارا سر فخر سے بلند ہو۔''

''اپنی بکواس بند رکھو...... میں پرساد چوپڑہ ہوں...... ایک پکا سچا ہندو۔ کوئی کم علم اور کمزور ایمان والا مسلمان نہیں ہوں کہ نہ ہونے والی جنت اور دوزخ کے بہکاوے میں آ کر اپنا دھرم چھوڑ دوں۔'' اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کلیم اللہ کو کچا چبا جائے۔ ''یہ تبلیغ اپنے پاس ہی رکھو...... اس گھر میں تمہیں رکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ تم کوئی بھی ایسا کام نہ کرو جو میرے اعلیٰ نام پر بدنامی کا داغ لگا سکے! میں مرنے کے بعد یقین نہیں رکھتا...... جب انسان مر جائے تو شمشان گھاٹ میں جلنے کے بعد کوئی طاقت ایسی نہیں جو اس کو دوبارہ زندہ

کر سکے۔بس قصہ ختم!''

''چوپڑہ صاحب!'' کلیم اللہ کا لہجہ بدستور تحمل اور پرسکون انداز اپنائے ہوئے تھا۔''اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔''ہم مریں گے اور جئیں گے۔''(جاثیہ 24) اللہ نے پیدا کیا زمین کو اور اونچے آسمانوں کو،اس اللہ نے پیدا کیا موت کو اور زندگی کو۔چوپڑہ صاحب مجھے آپ کی کم علمی اور جہالت پر حیرانگی ہوتی ہے...... جو پاک ذات پیدا کرسکتی ہے وہ مار بھی سکتی ہے اور پھر زندہ بھی کرسکتی ہے۔یہ سب کچھ اسی کا بنایا ہوا ہے۔کیا تم لوگ اپنی مرضی سے انڈہ بنا سکتے ہو...... اور پھر اس میں جان ڈال کر کسی جاندار کا وجود حاصل کرسکتے ہو...... اتنی ترقی...... اتنی بلندی کے دعوے...... چھی چھی چوپڑہ صاحب!اتنی ترقی اور جدت کے باوجود بھی تم لوگ مسلمانوں کے دِل اللہ کی طرف سے نہیں پھیر سکے۔تم جنہیں کمزور ایمان والے مسلمان کہتے یا سمجھتے ہو وہ آج بھی نماز فجر کے وقت اللہ کی حمد وثنا کرنے کیلئے اپنے گھر سے نکل کر مسجد تک آتا ہے۔کتنی دہشت گردی' کتنی تخریب کاری' کتنی مکارانہ چالیں...... افسوس کہ ان سب کے باوجود بھی آپ کسی مسلمان کو رب واحد کی ثنا بیان کرنے سے نہیں روک سکے۔'' وہ اپنا سانس درست کرنے کیلئے خاموش ہوا تو چوپڑہ کی رگیں تن گئیں۔''میری مانیے تو ایک بار ضرور اس ملک میں جائیے جہاں ہر لمحہ ہر سیکنڈ اور ہر وقت اللہ کی حمد وثنا ہوتی ہے۔خدا کی قسم تمہاری تقدیر بدل جائیگی اور تم نہ نظر آنے والے خدا کو ہر جگہ پاؤ گے۔'' چوپڑہ غصے اور نفرت سے منہ پھیرتا ہوا باہر نکل گیا تو کلیم اللہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گی۔

''اللہ اکبر۔اللہ اکبر۔اللہ اکبر۔اللہ اکبر۔اذان کی آواز نے کلیم اللہ کے دِل ودماغ میں روشنی کی کرنیں بکھیر دیں۔اس کے خون میں پارہ دوڑنے لگا اس نے اوپر چھت کی جانب منہ کر کے آنکھیں بند کرلیں اس کے ذہن کو سکون اور تسلی ملنے لگی اس نے محبت سے اذان سنی اور پھر بستر سے اُٹھ گیا اس نے سامنے لگے ہوئے آئینہ میں اپنا سراپا دیکھا تو سر پر بندھی پٹی اور بڑھی ہوئی شیو نے اُسے بتادیا کہ وہ واقعی تین دِن سے عشق ومعرفت کی مستی میں کھویا ہوا تھا۔وہ جیل سے نکل کر سیدھا مسجد پہنچا تھا۔چوپڑہ کو اس بات کا بھی افسوس ہوگا کہ وہ قیدیوں کے ظلم وتشدد کا نشانہ کیوں نہیں بن سکا۔اس نے غور کیا تو وہ چوپڑہ کی سکیم سمجھ گیا وہ اُسے پاگل بنانے پر تلا ہوا تھا۔ان خطرناک حالات میں کوئی بھی اس کا پرسانِ حال نہ تھا۔اُسے اس گھڑی خلیل احمد شدت سے یاد آیا جس نے اُسے حق ومعرفت کی راہوں کا مسافر بنایا تھا۔

اس نے آخری بار خلیل احمد کو پروفیسر فائز احمد کے گھر میں دیکھا تھا اُسے زنجیر سے باندھا ہوا تھا اور وہ اپنی امی اور ابو کو پکار رہا تھا وہ پاگل ہوگیا تھا۔اتنے بڑے المناک حادثے نے اس کا دماغ چھین لیا تھا وہ اگر نارمل ہوتا تو یقیناً پروفیسر فائز احمد کے بعد ان کی جگہ سنبھال لیتا۔اس نے جلتی ہوئی ٹرین کو دیکھا تھا۔جلتے ہوئے لوگوں کو دیکھا تھا۔اپنی پوری فیملی کی جلی ہوئی لاشوں کو دیکھا تھا۔بس وہی لمحہ تھا جب وہ اپنا توازن کھو بیٹھا تھا وہ امی ابو اور بہن بھائیوں کو دیوانوں کی طرح جگہ جگہ پکار رہا تھا کہ اُسے فائز احمد اپنے ساتھ لے گئے۔

اب نجانے خلیل احمد کہاں تھا اس کی کلیم اللہ کو کوئی خبر نہ تھا مگر دِل محسن اور جگر یار کی جدائی کے کچھ کے کو برداشت کر رہا تھا۔اُسے پروفیسر فائز احمد کی بات یاد آنے لگی کہ اس کی ملاقات خلیل احمد سے ہوتی رہے گی۔مگر کوئی ماہ گزر گئے تھے ملاقات تو دور کی بات خلیل احمد کی خبر بھی نہ تھی کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے۔لیکن وہ یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ فائز احمد کوئی بھی بات یونہی نہیں کیا کرتے تھے۔اُنہوں نے کہا تھا تو پھر اس کی ملاقات یقیناً خلیل احمد سے ہوگی۔مگر کب؟اس بات کا اُسے علم نہ تھا۔

اس نے آنکھوں کے گوشے انگلی کی پوروں سے صاف کیئے اور وضو کرنے کیلئے واش بیسن کی طرف بڑھ گیا۔

اللہ تعالیٰ نے اُسے توفیق دی تھی کہ وہ نماز عصر ادا کرنے لگا تھا وہ کمرے میں بچھے ہوئے کارپٹ پر نماز ادا کرنے لگا وہ جیسے ہی رکوع میں گیا اس کے آنکھوں کے بندھ ٹوٹ گئے وہ خانہ کعبہ اور گنبد خضریٰ کے پرنور مناظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا۔''تاوانِ عشق ادا کرسکو گے؟'' اس صدا نے اس کے جسم میں دوڑنے والے خون کی روانی کو تیز کردیا اس نے خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کی مگر وہ بھی تشہد کی حالت میں ہی تھا کہ کسی نے کیڑے مکوڑوں اور حشرات الارض کا تھیلا اس کے سجدہ کی جگہ پر لاکر ڈھیر کردیا۔

پہلے تو وہ سمجھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے مگر پرساد چوپڑہ اور موہن چند کی قہقہوں بھری آواز نے اس پر حقیقت آشکار کردی اس نے جلدی سے سلام پھیرا اور تڑپ کر ایک طرف کو ہوگیا۔حشرات الارض پورے کمرے میں پھیل چکے تھے ان میں خطرناک اور انسان دشمن کیڑے بھی تھے۔اللہ نے اپنا کرم کیا تھا کہ کسی بھی کیڑے نے اُسے کاٹنے کی جرات نہ کی تھی۔اس نے خوفزدہ نظروں سے چوپڑہ اور موہن کی طرف دیکھا جو قہقہے لگا رہے تھے۔کلیم اللہ کی آنکھیں آنسوؤں

سے تو بھری ہوئیں تھیں ہی مگر اس کے دِل کی صدا دردناک آہ کے ساتھ بلند ہوئی اور آنسوؤں بھری نگاہیں اوپر چھت کے جانب اُٹھ گئیں جو چھت کے پار نیلے آسمان تک ہواؤں اور خلاؤں کے ساتھ ساتھ فضاؤں کو بھی چیرتی ہوئی جا رہی تھیں۔

"میرے اللہ! میں گناہگار اور پر تقصیر ہوں لیکن تیری رحمت کا طلبگار ہوں۔ میرے مالک اپنے پیارے محبوب آقائے دو جہاں محمد مصطفیٰ ﷺ کے وسیلہ وجلیلہ سے اس بے بس کی مدد فرما!" چوپڑہ اور موہن کے قہقہے یکدم تھم گئے۔ وہ کلیم اللہ کی طرف بغور دیکھنے لگے۔ "میرے مالک مجھ پر رحم فرما۔ ان بے ہدایت لوگوں کو ہدایت عطا فرما اگر ان کے نصیب میں ہدایت نہیں ہے تو انہیں نیست ونابود کر دے...... انہوں نے تیرے اور تیرے بندے کے درمیان ایک ایسے رابطے کو توڑا ہے جو دین اسلام کا اہم رکن ہے...... انہیں غرق کر دے میرے مالک انہیں تباہ وبرباد کر دے...... اگر تیری وسیع رحمت کو ان کی تباہی منظور نہیں تو میرے اللہ:۔ ان پر اپنا رحم فرما کر انہیں راہِ حق پر چلنے کی توفیق عطا فرما!" کلیم اللہ کی دردناک آواز نے دونوں باپ بیٹے کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ پرساد چوپڑہ آگے بڑھا اور کلیم اللہ کو گریبان سے پکڑ لیا اور اس کے منہ پر تھپڑوں کی برسات شروع کر دی۔

"کتے کے بچے!" وہ غصے میں سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی تھی۔ "میں نے تمہیں جیل سے اس لیئے رہا کروایا تھا کہ تم میری قید میں رہ کر اپنے اس اللہ کو بھول جاؤ گے۔" کلیم اللہ پر یہ انکشاف بھی بم بن کر گرا وہ جیلر دھرم سنگھ کو اپنا محسن سمجھ رہا تھا۔ "میرے گھر میں رہ کر تم دکھائی نہ دینے والے اللہ کا ذکر نہیں کر سکتے...... یہ ہندوؤں کا گھر ہے مسلمانوں کی مسجد نہیں...... اپنی زبان کو لگام دیکر رکھو...... ورنہ......" اس نے گرے ہوئے کلیم اللہ پر ٹھڈوں کی بارش کرتے ہوئے موہن چند کو آواز دی۔ "گھبرو کو بلاؤ اور اس سؤر کو اس جگہ قید کر دو جہاں سے یہ گنپتی کی پوجا دیکھ دیکھ کر اپنے اللہ کو بھول جائے...... اسے گنپتی کی پوجا کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک منظر بخوبی دکھاؤ۔" وہ کلیم اللہ کو چھوڑ کر موہن کی طرف متوجہ ہوا۔ "اسے سنگلوں سے باندھ کر کھڑکی کے ساتھ کھڑا کر دو تاکہ یہ اس گھر میں سؤرگ محل میں ہونے والی گنپتی دیوتا کی پوجا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے......" وہ پھر کلیم اللہ کی طرف مڑا اس کی آنکھوں سے غصے اور نفرت کی شدت سے چنگاریاں نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اور کلیم اللہ کے ہونٹ پھٹ گئے تھے ان سے خون بہہ رہا تھا۔ "سنو کندن!" پرساد چوپڑہ اپنا سانس درست کر چکا تھا۔ "یہ وہی پوجا ہے جس کا

اہتمام تم سال بعد بڑی گرم جوشی سے کیا کرتے تھے...... اب اس پوجا میں آنے والا ہر مہمان تمہاری کھڑکی کے سامنے سے گزرے گا اور تمہیں ایک کنکر مارتا جائے گا...... جس طرح وہ...... کیا کہتے ہیں تمہارے نام نہاد مذہب میں...... وہ حاجی لوگ شیطان کو کنکر مارتے ہیں۔ اسی طرح گنپتی بھگوان ہمارا دیوتا ہوگا۔ پوجا کرنے والے مہمان حاجی ہونگے اور تم......" وہ قہقہہ لگانے لگا۔ "اور تم شیطان کی طرح ان حاجیوں کی کنکروں کا نشانہ بنو گے! ھا ھا ھا ھا......" وہ کلیم اللہ کو حیران و پریشان چھوڑ کر باپ بیٹا اس کمرے سے نکل گئے۔ کلیم اللہ ان کی شیطانی پلاننگ سن کر لرز گیا تھا وہ دِل کی گہرائیوں سے کانپ اُٹھا تھا وہ جانتا تھا کہ پرساد چوپڑہ بہت بڑا کھلاڑی ہے وہ دولت کے بل بوتے پر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنیوالے وقت کا تصور کر کے نمی تیرنے لگی تو اس صدا کو سن کر وہ حیر تو استعجاب سے اپنے اردگرد دیکھنے لگا۔

"عشق دی راہ بڑی اوکھی...... جے کوئی ٹُرے تے یار ملا دیندا"

اس نے بالکل ایسے ہی آواز سنی تھی جیسے کہ کہنے والا بالکل اس کے سامنے کہہ رہا ہو لیکن دکھائی کوئی نہ دے رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر چونک پڑا...... "تاوانِ عشق ادا کر سکے گا تو صبر کر...... ورنہ...... مل جا ان کے ساتھ اور اپنے گھر والوں کا ساتھ دے۔" اس کی آنکھیں برسنے لگیں تھیں۔ یہ آواز اس نے تب سنی تھی جب وہ عشق وسرور کی مستی میں ڈوبا ہوا گنبد خضریٰ کے سائے تلے اپنی چھید شدہ جھولی کو پھیلائے آقائے تاجدار مدینہ کا عشق طلب کر رہا تھا۔ اس آواز نے اُسے حوصلہ دیا تھا کہ اس پر اللہ کے حکم سے اللہ والے کی نظر ضرور ہے اور اس کا مطلب تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہے اور یہ اس کے لیئے بہت بڑی خوش بختی تھی وہ زار وزار رونے لگا تھا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

☆☆☆

وہ پہلی بار اپنے ملک سے باہر نکلے تھے ان کے عزائم اور حوصلے جواں تھے وہ تینوں نوجوان جن کا لیڈر عفی تھا وہ ہندوستان کے مشہور شہروں کا چکر لگاتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے تھے اس بات کا اُنہوں نے خاص خیال رکھا تھا کہ ان کا تعاقب نہ ہو رہا ہو۔ اُنہوں نے اپنا مختصر سامان اپنے کندھوں پر اُٹھایا ہوا تھا اور وہ سکھوں کے بہروپ میں ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ عفی نے کاؤنٹر پر کھڑے بزرگ آدمی سے جا کر ایک آدمی کا نام "کرشن بابو" لیا تو وہ چونک کر ان تینوں کی طرف دیکھنے لگا اس نے طے شدہ کوڈ پوچھنے کے بعد ایک کمرے کی چابی عفی کو تھما دی اور بولا۔ "کمرے

سے باہر نہیں نکلنا چاہے کتنے ہی دِن کیوں نہ گزر جائیں۔'' وہ اس ہدایت پر حیران ضرور ہوئے مگر فی الحال مسئلہ اپنے آپ کو پرسکون جگہ پر محفوظ کرنا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچے تو اُنہوں نے سکون کا سانس لیا۔ عفی کے ساتھی نے پہلی بار زبان کھولی۔

''شکر ہے اللہ کا کہ کام خیریت سے ہوگیا!'' مگر وہ عفی کی طرف دیکھ کر حیران رہ گیا جواُسے خاموش رہنے کا اشارہ کرر ہا تھا۔ باقی دونوں کے بھی کان کھڑے ہو گئے یوں لگتا تھا کہ کئی مرد و خواتین ایک ساتھ ہلاّ گلا کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے محتاط انداز سے اپنے کمرے کی تلاشی لینا شروع کردی مگر ٹی وی وغیرہ بند تھا۔ یونہی عفی نے بڑی سی کھڑکی کا پردہ اُٹھایا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کیونکہ ان سے صرف پچاس گز کے فاصلے پر دوسرے ہوٹل کی چھت تھی جس پر سوئمنگ پول بنا ہوا تھا۔ شیشے والا حصہ کھلا رہنے کی وجہ سے سوئمنگ کرنے والوں کی آوازیں ان کے کمرے تک پہنچ رہی تھیں۔

''دیکھو رحمٰن! ہمیں یہاں محتاط رہنے کی تلقین کی گئی ہے اس کا مطلب ہے کہ ہمارے لیئے یہاں خطرہ ہی خطرہ ہے۔'' عفی نے اپنے ساتھی کو سمجھاتے ہوئے کہا تو رحمٰن اور دوسرا ساتھی عبداللہ بھی مسکرانے لگے۔ رحمٰن بولا۔

''عفی بھائی! جنگ اور جہاد کی راہ پر نکلنے والوں کیلئے ہر قدم پر خطر ہوتا ہے۔ ویسے جو بھی صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کا پروگرام کیا ہے؟'' عبداللہ نے بھی اثبات میں سر ہلایا تو عفی نے کھڑکی بند کر کے آگے پردے سرکاتے ہوئے رحمٰن کی بات کا جواب دیا۔ ''ہمیں جہاں کا پارلیمنٹ ھاؤس اڑانا ہے۔'' عفی کی بے نیازی دیکھ کر وہ دونوں ہی لرز کر رہ گئے۔ اصل میں ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اُنہیں اتنے بڑے پلان کی اطلاع نہ تھی اور نہ ہی وہ کوئی سیکرٹ سروس کے ایجنٹ تھے وہ تو سیدھے سادھے مسلمان تھے جن کے ذہنوں میں اللہ تعالٰی کی وحدانیت اور حبِ رسول کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کا مقصد مسلمانوں کے خلاف ہونے والی سازشوں اور عالم اسلام کے خلاف ہونیوالی عام سازشوں کو نیست و نابود کرنا تھا اور یہ سب کچھ اس ملک کی اسمبلی میں ہوتا تھا۔

''مم مگر......'' عبداللہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''جو کوئی بھی ہم سے ملنے والا ہے اُسے اس چیز کا فائدہ کیا پہنچے گا؟''

''ہمیں دوسروں کے نفع نقصان کی پرواہ نہیں ہے بلکہ اپنا اور دین اسلام کا نفع بڑھانے کیلئے

کام کرنا ہوگا۔'' عفی نے اُنہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اس ہوٹل میں یہ کمرہ اس شخص نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی بک کیا ہوگا کیونکہ تم نے شاید غور نہیں کیا...... پارلیمنٹ ہاؤس یہاں سے کافی دور ہے اور اتنی دور تک کسی بھی ہوٹل میں سیکورٹی کیمرے اور پھر سپیشل کمروں میں مائیک وغیرہ نہیں لگائے جاتے۔''

''کیا وہ ہندو ہے؟'' رحمٰن کا سوال بہت وزنی تھا۔

''نہیں...... پہلے ہندو تھا...... مگر اس کے دِل میں اسلام اور رب واحد کی واحدانیت کی شمع ایک شخص نے جلادی اب وہ بظاہر ہندو ہے لیکن پکا اور سچا مسلمان ہے۔'' عفی کے جوابات حیران کن تھے۔ اتنی دیر میں ان کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک گئے۔ عفی نے اُنہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے کے پاس جا کر پوچھا! ''کون؟'' تو دوسری بار پھر دستک ہی ہوئی کوئی جواب نہ آیا تو عفی نے دروازہ کھول دیا یہ اس پارٹی سے طے شدہ کوڈ ورڈ تھا اندر داخل ہونے والا تقریباً بتیس تینتیس سالہ شخص تھا جسے نوجوان بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ بالکل اکیلا تھا مگر اس کے کندھے پر ایک بیگ تھا جو کافی بڑا تھا اور بھرا ہوا بھی لگ رہا تھا۔ اس نے کمرے میں آتے ہی ان تینوں کی جانب دیکھا اور بولا۔

''السلام علیکم'' جواب ملنے پر وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ تینوں اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات دیکھ رہے تھے مگر وہ بالکل سنجیدہ اور ہر قسم کے ہیجان انگیز تاثرات سے بے نیاز تھا۔ اس نے چند منٹ کی جان لیوا خاموشی کے بعد کمرے میں طاری خاموشی کا سینہ چاک کرنے کیلئے اپنے لب کھولے تو وہ تینوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ہماری یہ پہلی اور آخری ملاقات ہے۔''

وہ تینوں ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے وہ اسلام کی راہوں پر قربان ہونے کیلئے نکل پڑے تھے۔ ان کے اپنے ملک میں جو حالات تھے وہ اس قدر بُرے اور تاریک تھے کہ انسانیت بھی شرماتی تھی بے ننگ و نام حکومت نے آٹا بند کر کے عوام کو لائنوں میں کھڑا کر دیا تھا اور تیس روپے کلو تک آٹا فروخت ہونے لگا تھا۔ بچوں اور گھر والوں کی بھوک دیکھ کر اُنہیں حکمرانوں کے خلاف جہاد کرنے کی سوجھی مگر حالات و واقعات اتنی تیزی سے بدلے کہ وہ منفی سوچ ختم کر کے راہِ اسلام پر چلنے لگے اور ان میں جہاد کی طلب اور شدت بڑھنے لگی۔

وہ ایک گروپ کی شکل میں کام کرتے تھے اور ان کا لیڈر اُنہیں کہیں بھی بھیجتا تو وہ گھر والوں

کیلئے وافر روپیہ مانگ کر اس لیڈر کی بات کو مانتے اور اسلام کے خلاف ہونیوالی سازشوں کا جواب اپنے جذبے اور ہمت سے دینے کیلئے پہنچ جاتے تھے۔ اب بھی وہ اپنے لیڈر کی ہدایت پر دوسرے ملک میں صرف اسی لیئے کارروائی پر آمادہ ہوئے تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ناموس کی بے حرمتی کر کے ان کے خاکے نعوذ باللہ کارٹونوں کی شکل میں بنانے والا اس ملک میں پناہ گزین تھا اور مزے کی بات کہ وہ پارلیمنٹ کا ممبر بھی تھا اور حبِ رسولؐ پر تو مسلمان کروڑوں جانیں بھی قربان کر دیتے تھے اس بار انہوں نے رضامندی سے اس مشن کو پورا کرنے کی ٹھانی تھی اور کسی بھی قسم کا کائی بھی پیسہ مانگنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ معاملہ جنت کی طلب کا تھا۔ اسی لیئے ان کے جذبے اور حوصلے جوان تھے۔

''آج کے بعد ہم کبھی بھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے۔ تم مجھ سے یقیناً خوش قسمت ہو جو اس کام کو چنا ہے۔ اس بیگ میں جدید اسلحہ ہے وہ ممبر اسمبلی کل کے اجلاس میں شرکت کرے گا۔ یہ اس کی تصویر ہے۔'' آنے والے نے کوٹ کی جیب سے ایک تصویر نکال کر ان کی طرف بڑھا دی وہ کوئی پچپن سالہ خبیث صورت ہندو تھا۔ رحمٰن نے تو نفرت سے اس کی تصویر پر تھوک دیا تھا۔

''یاد رکھو! اس شخص کے زندہ بچ جانے کا مطلب ہے تم تینوں کی موت' تمہارے نام جو کہ پاسپورٹس اور شناختی کارڈ کے مطابق ہندوستان کے ہیں۔ انور علی! منور حسین اور فرمان علی۔ ان پاسپورٹس اور شناختی کارڈ پر جو پتے درج ہیں وہ ہندوستان کی ایک دور کی ریاست کے ہیں مگر یہ گلیاں اور مکان اس ریاست میں موجود ہی نہیں ہیں۔ انہیں اپنی پاکٹوں میں رکھنا تا کہ پکڑے جانے یا پھر شہید ہو جانے کی صورت میں تمہاری اصلیت کسی پر بھی نہ کھل سکے اور تم مکمل ہندوستانی ہی لگو!'' یہ کہہ کر اس شخص کی آواز بھرا گئی تو ان کی آنکھیں بھی فرطِ جذبات سے جگنے لگیں!

''میں ایک ہندو تھا'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''مگر قرآن کریم کی تعلیم اور اسلام کے فروغ نے میرا ایمان بدلا۔ میں ان دیکھے خدا پر دل سے یقین لایا ہوں اور الحمدللہ ایک بار حج بھی کر چکا ہوں...... مگر آج تک مدینے کی وہ گلیاں نہیں بھولا جن میں ہم سب کے آقا چہل قدمی فرمایا کرتے تھے...... میری تم سے درخواست ہے اگر تم شہید ہو جاؤ تو استقبال کرنے والی حوروں کو میرا نام ضرور بتانا......'' وہ رونے لگا تھا۔ ''ان سے کہنا کہ آقا کا ادنیٰ سے ادنیٰ غلام بھی اس شہادت اور استقبال کا منتظر ہے...... باقی پلاننگ خود کر لینا۔'' اس آدمی سے زیادہ بات نہیں ہو رہی تھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

''اس بیگ میں پارلیمنٹ اور اس ممبر کے گھر کے نقشے ہیں...... اللہ رسولؐ تمہارا حامی و ناصر ہو!'' وہ یہ کہہ کر ان سب کو باری باری گلے ملا اور روتی ہوئی آنکھوں سے باہر نکل گیا۔

کمرے میں عجیب سی سوگواریت چھائی ہوئی تھی انہوں نے متحرک ہونٹوں سے اور جلتی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو عفی نے بیگ کھول کر اس میں سے سامان باہر نکالنا شروع کر دیا۔ تین پلاسٹک کے بیگ تھے جن میں ہندوستان کی فوج کے یونیفارم تھے۔ اور بم بارود اور جدید اسلحہ تھا۔ نقشے کے مطابق انہوں نے پلاننگ شروع کر دی تھی۔ کمرے میں نصب فون کی گھنٹی پر وہ چونک گئے تو عفی نے فون ریسیو کیا۔

''ایک فوجی جیپ کل صبح ہوٹل کے باہر کھڑی مل جائیگی! اللہ حافظ!'' یہ اس کی آواز تھی جو ابھی ابھی کمرے سے گیا تھا۔

نقشے اور پلاننگ کے مطابق ان کو جیپ میں ہی پارلیمنٹ لاجز میں پہنچنا تھا۔ ایک میجر جو کہ گیٹ پر موجود ہوگا اکبر علی کے نام سے اس سے تعارف ہوگا وہ ان کی جیپ کو اندر داخل ہونے دے گا اور بعد میں جب مطلوبہ ہندو رکن جیسے ہی اپنی گاڑی سے اترے گا تینوں نے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنی تھی اور پھر اسلحہ و بارود کی بھری ہوئی جیپ پارلیمنٹ کے مین گیٹ یعنی عمارت کے بڑے دروازے سے اندر داخل کر کے ایک دھماکے سے اڑانا تھی اور خود بھی وہاں سے فرار ہونا تھا۔

ہندوستانی فوج کی یونیفارم نے ان کے کام کو آسان کر دیا تھا۔ اگلی صبح انہوں نے فجر کی نماز ادا کی اور سجدے میں پڑ کر اپنے دل بارگاہِ خدا میں جھکا دیئے یہ ان کی زندگیوں کا آخری مشن بھی ہو سکتا تھا بلکہ وہ خود چاہتے تھے کہ ناموسِ رسالت پر قربان ہو کر اس جھوٹی دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ ایک بار تو تمام گھر والوں کے چہرے ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ انہوں نے روئی اور سوجی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اپنا قومی لباس اتار کر ہندوستانی فوج کی یونیفارم پہن لی یہ ان کے مشن کی مجبوری اور ان کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے ضروری تھی۔

دلوں میں حبِ رسولؐ کو بھرتے ہوئے انہوں نے کمرے سے تمام سامان سمیت کر اس کو باتھ روم میں آگ لگا دی اور ہر ایک ثبوت مٹا کر ہوٹل سے باہر نکل آئے بیگ جس میں اسلحہ تھا ان کے ہاتھوں میں تھا ہوٹل سے فوج کو نکلتے ہوئے لوگوں نے حیران ہو کر دیکھا مگر وہ اپنی لگن میں مگن جیپ میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک ویران جگہ پر رک کر انہوں نے تمام

اسلحہ اور بارود جیپ میں خفیہ جگہوں پر چھپا دیا اور ایک ایک سٹین گن پکڑ کر رحمٰن اور عبداللہ کھڑے ہو گئے جبکہ عفی جو کہ ایک میجر کے روپ میں تھا وہ جیپ ڈرائیو کرتا ہوا پارلیمنٹ کی وسیع و عریض بلڈنگ کے گیٹ پر پہنچا تو وہاں کیفول پروف سکیورٹی دیکھ کر حیران و پریشان ہو گیا۔ اب تک تمام کام ان کی منشاء کے مطابق ہوا تھا ان کے متحرک ہونٹ اور دھڑکتے دِل درود شریف اور کلمہ طیبہ کا وِرد کر رہے تھے۔

گیٹ پر پہنچ کر عفی نیچے اترا اور گیٹ پر کھڑے ہوئے میجر سے جا کر ہاتھ ملایا اور بولا ''اکبر علی!'' تو وہ چونک کر ان تینوں کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں مسکرانے لگیں اس نے عفی سے ہاتھ ملایا اور گیٹ کھول دیا۔ ابھی ممبران کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا اسی لیئے عمارت میں کوئی اتنی چہل پہل نہ تھی۔

''مبارک ہو انور علی!'' اکبر علی نے عفی سے کہا تو ان کی آنکھیں فرطِ جذبات سے چھلکنے لگیں تھیں یہ لمحہ خود پر قابو رکھنے کا تھا ورنہ وہ دوسرے گیٹ پر کھڑے فوجیوں کی نظروں میں بھی آ سکتے تھے۔ ''وہ حرمزادہ بچنا نہیں چاہیئے۔'' اس نے یہ کہہ کر گاڑی کو اندر داخل ہونے کا پاس کارڈ دے دیا۔ عفی نے اس کی بات اچھی طرح سن لی تھی اور نامحسوس طریقے سے اُسے سر کے خفیف اشارے سے بتا دیا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اکبر علی نے اُنہیں اشارہ کرنا تھا کہ یہی وہ گستاخِ رسولؐ ہے۔ بس پھر ان کا کام شروع تقریباً ایک گھنٹے بعد ممبران کی قیمتی گاڑیاں پارلیمنٹ کی عمارت کے اندر آ کر مرکزی دروازے کے سامنے رکتی ہیں اور وہ اپنی ڈیوٹی کے مطابق ان کو سیلوٹ کرتے رہے۔ ہر لمحہ ان پر قیامت کی گھڑی بن کر نازل ہو رہا تھا۔ ان کی خود اعتمادی میں ذرہ برابر بھی لچک ان کو کام سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

پندرہ منٹ مزید گزر گئے تو عفی کی چھٹی حس پھڑکنے لگی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جو بظاہر مطمئن تھے مگر وہ بھی اندرونی کشمکش کا شکار ہو رہے تھے۔

''نوجوان! تم ادھر آؤ ذرا!'' اس آواز کو سن کر وہ تینوں چونک پڑے کیونکہ وہ کوئی کرنل رینک کا فوجی افسر تھا جو ان تینوں کی طرف بڑھتا ہوا آ رہا تھا۔ عفی، رحمٰن اور عبداللہ کے چہروں کی رنگت زرد ہونے لگی تھی انہیں اپنا مشن ادھورا ابھی لگنے لگا تھا اور بے بسی کی موت بھی نظر آنے لگی تھی۔

☆☆☆

''مجھے تو یہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب کی مانند لگتا ہے۔'' ابراہیم نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تو آمنہ اور عائشہ بی بی کے ہاتھ بھی رک گئے۔ ''احتل کا معافی مانگنا اور فریحہ کا رشتہ دینا...... بات کچھ حلق سے اتر نہیں رہی۔'' موسم سرما کی جاتی ہوئی سرد شام اپنا دم توڑ رہی تھی کیونکہ موسم یکدم تبدیل ہو گیا تھا اور اب خنکی کم ہو گئی تھی مگر ابراہیم آنیوالے وقت سے اس طرح لرز رہا تھا جیسے کہ اس کا انگ انگ کسی نے سرد ہوا سے چیر دیا ہو۔

''آپ یونہی پریشان ہو جاتے ہیں ابا جی۔'' آمنہ نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''ہوسکتا ہے کہ ممانی کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو ہی گیا ہو۔'' ابراہیم پڑھی لکھی بیٹی کی طرف دیکھ کر لبوں پر مسکان لاتا ہوا بولا۔

''میری ان آنکھوں نے اس زمانے کی جتنی اونچ نیچ دیکھی ہے تمہاری اتنی عمر نہیں ہے۔'' وہ ایک اور نوالہ لیتا ہوا بولا۔ وہ اس وقت شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ جگنو حسبِ معمول غائب تھا۔ ''میرے بالوں کی چاندی اس بات کی گواہ ہے کہ دریا جب اُلٹا چلنا شروع ہو جائے تو وہ چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کا رخ کرتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کا اپنا وجود ختم ہو کر رہ جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ بھی دریا میں مل کر اس کا حصہ کہلانے لگتے ہیں۔''

آمنہ کے پاس اپنے ان پڑھ مگر ذہین باپ کی بات کا کوئی جواب نہ تھا لیکن اُسے مطمئن بھی تو کرنا تھا۔

''میں آپ کے تجربے کو چیلنج نہیں کرتی ابا جی...... لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ نہ نظر آنے والا دیمک کا کیڑا پتھر میں بھی سوراخ کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح وقت کی دیمک نے بھی احتل مامی کے غرور کے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا ہو...... کیا یہ ممکن نہیں ہے؟'' وہ اپنی بات کی تصدیق کیلئے ابراہیم اور عائشہ بی بی کی طرف دیکھنے لگی۔

''آپ تو خواہ مخواہ ہی وہم میں مبتلا ہو گئے ہیں۔'' عائشہ بی بی آمنہ کی بات کی تائید کر رہی تھیں۔ ''آمنہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے آخر احتل بھی انسان ہے...... وہ اگر جھک گئی ہے تو حیرت کیسی۔''

ابراہیم خاموشی سے بیوی اور بیٹی کی شکلیں دیکھتا رہا۔

اگلے ہفتہ جگنو کی بارات سادگی سے چند معززین علاقہ کی شمولیت کے ساتھ اختر علی کی عالیشان کوٹھی پہنچی تو احمد اور عاصم نے ان کا استقبال کیا۔ احمد نے یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ اس رشتے

سے خوش نہیں ہے لیکن اجتل کی رضامندی ہے تو بس پھر سب کچھ ٹھیک ہے جبکہ وہ اختر علی کے ساتھ مل کر آمنہ کی پسند سے فریحہ کیلئے بہترین کپڑوں کی خریداری کر کے آئے تھے۔ آمنہ اس گھر کی بہو تھی اور آج انوکھے اور مختلف طریقے سے گھر میں داخل ہوئی تھی اختر علی نے اُسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''اپنے گھر میں آنا مبارک ہو آمنہ!'' وہ ہنس کر رہ گئی اور احمد کی طرف دیکھنے لگی جس نے کندھے اچکاتے ہوئے لاعلمی ظاہر کی۔ جگنو خلاف توقع بہت سنجیدہ تھا اس نے کریم کلر کی شیروانی اور سر پر کُلاہ پہنا ہوا تھا اس کا روپ نکھرا نکھرا الگ رہا تھا۔ ابراہیم کو لوگ مبارکیں دے رہے تھے۔ اختر علی نے بھی اپنے چند ایک ملنے والوں کو بلایا ہوا تھا۔

نور شاہ ولیؒ مزار کے متولی حافظ جی بھی باراتیوں میں شریک تھے وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے ان کے خاص دوست کی شادی ہو رہی تھی وہ دِل کی آنکھوں سے اس تمام ماحول اور منظر کو دیکھ رہے تھے۔

نکاح کے بعد اچھے کھانے سے مہمانوں کی تواضع کی گئی...... اجتل کے چہرے پر اس بات کا سکوت چھایا ہوا تھا کہ عائشہ بی بی نے اس گھر میں بیٹھ کر کہا تھا کہ ایک وقت آئے گا اس وقت کا بادشاہ جگنو ہوگا اور اجتل اس کی چوکھٹ پر کھڑی باندی ہوگی۔ آج وہ وقت آ گیا تھا جگنو بادشاہ کے روپ میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور فریحہ نے اجتل کی ناک کٹوادی تھی اور سر بھی جگنو کی چوکھٹ پر جھکا دیا تھا۔ بظاہر ہر کسی سے ہنس ہنس کر ملنے والی اجتل اس لمحہ فریحہ کے کمرے میں موجود تھی جو دُلہن کے لباس میں کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔

''اس دو ٹکے کے شوہر سے کل ہی طلاق لے لینا۔'' اجتل کے پُرغرور الفاظ اس بات کی غمازی کرتے تھے کہ وہ فریحہ اور اختر علی کی پلاننگ سے خوش نہیں ہے۔'' کیا اندھوں اور لُولے لنگڑوں لوگوں کی بارات لے کر عائشہ بی بی یہ سمجھتی ہے کہ اس نے مجھے جھکا لیا ہے...... یہ اس کی بھول ہے۔''

''مما پلیز!'' فریحہ نے اس کے کندھے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''اپنے آپ کو ری لیکس رکھیں۔'' اس نے فریحہ کی جانب انتہائی غصے سے دیکھا اور اس کے ہاتھ جھٹکتی ہوئی بولی۔

''تم نے بھی اپنے باپ کے ساتھ مل کر مجھے بلیک میل کیا ہے فری...... یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔''

''کم اِن مما!'' فریحہ کمرے کے ایک طرف بنی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گئی اور وہی البم نکال کر لے آئی جس میں اس کے کہنے کے مطابق اجتل کی کلب ڈانس کی تصاویر تھیں۔ اس نے وہ البم لاکر اجتل کو پکڑا دیا اور بولی۔ ''آپ غصے میں بہت اچھی لگتی ہیں لیکن اردگرد کو ہمیشہ بھول جاتی ہیں...... میرا مقصد آپ کو بلیک میل کرنا یا ڈرانا دھمکانا نہیں تھا بلکہ میں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ جگنو حلالہ کیلئے ہر طرح سے مناسب ہے...... ہماری راہ میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔'' اجتل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر البم کی طرف تو فریحہ کی آواز نے اُسے ایک بار پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''جی ہاں مما! یہ البم ویسا ضرور ہے مگر وہ نہیں ہے۔'' اس فقرے نے اجتل کو منوں مٹی تلے دفن کر دیا تھا وہ اپنے آپ کو انتہائی بیوقوف اور چغد سمجھنے لگی تھی اس کی بیٹی نے ہی اس کی لٹیا ڈبو دی تھی وہ شرم اور غصے سے زمین میں گھڑی جا رہی تھی۔ یکدم ایک اور آواز نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''اور آمنہ اس گھر کی بڑی بہو ہے یعنی مسز احمد!'' یہ آواز اختر علی کی تھی جو آمنہ اور احمد کے ساتھ دروازے میں کھڑا تھا۔ اجتل کو زمین آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ پاگلوں اور ہونقوں کی طرح ان لوگوں کے منہ دیکھے جا رہی تھی۔ اُسے لگتا تھا کہ وہ سکتے کی کیفیت میں ہے۔ اگر کوئی دُور سے دیکھتا تو لگتا کہ جاندار اجتل کی جگہ کوئی مجسمہ کھڑا ہے اور لوگ اس کو دیکھنے کیلئے جمع ہیں۔ احمد آگے بڑھا اور اس نے اجتل کو کندھوں سے پکڑ کر چھوا تو وہ سکتے کی کیفیت سے نکل آئی اس نے غصے سے احمد کی طرف دیکھا اور پھنکارتی ہوئی بولی۔

''تم نے نالی کی اینٹ اس محل کو لگا کر اس کا حُسن داغدار کر دیا ہے احمد!'' آمنہ ان سخت الفاظ کو سننے کیلئے ذہنی طور پر تیار تھی۔ ''اور عائشہ آپا...... عائشہ آپا...... تمہاری اس معصوم سی دشمنی کا تم سے اتنا خطرناک بدلہ لوں گی کہ تم اپنی اوقات اور حیثیت بھولنے کی کبھی کوشش نہیں کرو گی۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکلنے لگی تو ابراہیم اور عائشہ بی بی اندر داخل ہو رہے تھے وہ ان دونوں کو دیکھ کر رک گئی تو عائشہ بی بی بولیں۔

''مبارک ہو اجتل! اتنی تیزی میں کہاں جا رہی تھی؟''

''جہنم میں'' مگر وہ منہ سے نہ بول سکی کیونکہ اس کے دِل میں ابھرنے والی صدا اس وقت صرف اختر علی ہی جان اور سن سکتا تھا وہ فوراً بولا۔ ''آپ کو مبارک دینے ہی جا رہی تھی......

کیونکہ ..... فریحہ اور جگنو کی شادی تو امتل کی پسند اور مرضی سے ہی ہو رہی ہے نا۔'' امتل جل بھن کر کباب ہو رہی تھی کیونکہ گھر کے تمام ووٹ اس کے مخالف تھے۔ عائشہ بی بی کی مسکان اُسے زہر میں بجھا ہوا تیر لگ رہی تھی مگر جو ماحول اور جن الفاظ کا سہارا لے کر اختر علی نے بات کو سنبھالا تھا اُسے امتل کو بھی سنبھالنا پڑا۔ وہ بھی مصنوعی مسکراہٹ سے بولی۔

''جی ..... جی ..... آپ کو بھی مبارک ہو۔''

''بہت بڑی اداکارہ ہے تمہاری ماں!'' اختر علی نے احمد کے کان میں کہا تو آمنہ نے بھی سن لیا اور تینوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ امتل کے چہرے پر ایک بار پھر سنجیدگی کی چادر تن گئی۔

''چلو بھئی ..... ہماری بیٹی ہمیں دے دو۔'' ابراہیم نے یہ کہہ کر فریحہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اُسے ساتھ لے کر کمرے سے باہر کی جانب چل پڑا۔ اختر علی نے فریحہ کے سر پر پیار دیا وہ جب امتل کے پاس پہنچی تو اس کی چنگاریاں برساتی آنکھیں ایک ہی پیغام دے رہی تھیں کہ ''اس دو ٹکے کے آدمی سے صبح ہی طلاق لے لینا۔'' امتل نے واجبی سا پیار دے کر فریحہ کو رخصت کیا۔ وہ تمام لوگ جیسے ہی نیچے پہنچے تو جگنو کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ اس نے پہلی بار فریحہ کو اس طرح دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ وہ ابراہیم اور عائشہ بی بی کے ساتھ آتی ہوئی آمنہ۔ عاصم۔ احمد اور دیگر لوگوں کو نظر انداز کر چکا تھا وہ اس قدر فریحہ کو دیکھنے میں محو تھا کہ اُسے اردگرد کی خبر بھی نہ رہی۔ حافظ جی اس کے ساتھ صوفے پر تشریف فرما تھے مگر جگنو سب کچھ بھول چکا تھا۔

''تاوانِ عشق ادا کرنا پڑتا ہے جگنو میاں .....'' یکدم حافظ جی کی آواز اس کے ذہن میں بم کی طرح گونجی تو اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا مگر ان کے ہونٹ تو بالکل ساکت تھے۔ وہ لرز گیا تھا۔ اس کے ذہن میں حافظ جی کی مزید نصیحتیں گھومنے لگیں۔ ''دُنیا بہت بڑا فراڈ ہے اسی لیئے حسین لگتی ہے۔ اس کی چال اور رنگ ڈھنگ دِل فریب ہوتے ہیں۔ ان سے بچنا چاہیئے۔'' اس وقت تک فریحہ سٹیج پر پہنچ چکی تھی باراتی جو کہ ابراہیم کے محلّے دار ہی تھے وہ جگنو کی دُلہن دیکھ کر عش عش کر رہے تھے اُنہیں جگنو کی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔

اختر علی اور احمد نے فریحہ کو رُخصت کیا تو امتل دور کھڑی دیکھتی رہی ابراہیم کو یہ بات کھٹک رہی تھی وہ دِل کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتا تھا مگر بے ترتیب دھڑکنیں اس کے وسوسوں اور خدشوں کو تقویت بخش رہی تھیں۔

امتل کو اس بات کا قلق تھا کہ اختر علی نے آمنہ کو اس گھر کی بہو بنا کر اس کے منہ پر طمانچہ مارا

ہے۔ شادی کب اور کہاں ہوئی اس بات سے اُسے بالکل ہی لاتعلق اور بے خبر رکھا گیا تھا۔ وہ ابراہیم اور عائشہ بی بی سے کیا ان کی نسل سے بھی نفرت کرتی تھی مگر تقدیر کی ستم ظریفی تھی کہ وہ اس چوکھٹ پر جھک گئی تھی مگر اس کے ماتھے پر پڑنے والی گہری تیوریاں اس بات کی علامت تھی کہ وہ آمنہ کو کبھی بھی بہو کے روپ میں تسلیم نہیں کرے گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

فریحہ کی رخصتی ہو چکی تھی وہ دُلہن بن کر ہی پہلی مرتبہ پھوپھو کے غریب خانہ پر آئی تھی ورنہ وہ ان کے نام اور پھوپھا جی کے کام سے سخت نفرت کرتی تھی۔ دانیال کو موبائل پر اس نے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنے کیلئے اپنے کام کی پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھ چکی ہے۔

عائشہ بی بی نے دہلیز پر تیل گرا کر اس کا استقبال کیا تو اس نے دُلہنوں کی طرح شرمانے کی بجائے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نئے ماحول کو دیکھا۔ دیواروں پر سے جگہ جگہ سے پلستر اُکھڑا ہوا تھا۔ اینٹوں والا صحن اور اس سے نکلتی ہوئی مٹی اُسے کراہت ہونے لگی تھی۔ اس نے جگنو کی طرف دیکھا جو خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ آمنہ اور احمد بھی اس شادی سے خوش تھے اب تو احمد کو امتل سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس نے ایسے وقت میں اپنی اور آمنہ کی شادی کو ڈیکلیئر کیا تھا جب امتل بُری طرح عائشہ اور ابراہیم کے خاندان میں پھنس چکی تھی اور اس بازی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے فریحہ نے ان کی بہت مدد کی تھی حالانکہ وہ اپنی مدد آپ کر رہی تھی۔

جگنو رسومات سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو ابراہیم نے روک لیا۔

''کہاں جا رہے ہو بیٹا؟''

''شرکار کو شلام کرنے۔'' وہ بہت خوش تھا۔ ''وہ کیا کہیں گے کہ جگنو صاحب نے شادی کر لی اور ہمیں بھول گئے ..... میں کتنا بھی بڑا آدمی بن جاؤں مگر شرکار کو نہیں بھول شکتا۔ ان کی چوکھٹ شے تو شب کچھ ملا ہے۔'' ابراہیم اس کی بات سن کر مسکرانے لگا۔ جگنو کے ذہن میں یہ بات سما گئی تھی کہ آدمی شادی شدہ ہو جائے تو وہ بڑا آدمی بن جاتا ہے۔

''جلدی آنا ..... فریحہ تمہارا انتظار نہ کرتی رہے۔''

جگنو نور شاہ ولی سرکار کی درگاہ پر حاضر ہوا تو خوشی کے آنسوؤں نے اس کی آنکھوں سے نکل نکل کر اس کے جھولی کو بھرنا شروع کر دیا۔ وہ دِل کھول کر رو لیا تو جھکے ہوئے سر کو اُٹھایا اور سامنے بیٹھے حافظ جی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تسبیح کر رہے تھے ان کے متحرک ہونٹ اس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ وہ رب تعالیٰ کی حمد و ثنا میں اس قدر محو ہیں کہ اُنہیں جگنو کی آمد کا پتہ بھی نہیں چل سکا۔

جگنو نے حسبِ معمول جا کر ان کی گود میں اپنا سر رکھ دیا...... مگر ان کا ورد کرنے کا تسلسل نہ ختم ہوا۔ چند منٹ یونہی گزر گئے تو اُنہوں نے تسبیح پر پھونک مار کر اپنی آنکھوں سے لگائی اور جگنو کے چہرے پر پھونک مارنے کیلئے گردن جھکائی تو جگنو کو محبت و عشق بھرا احساس ہوا۔

"جگنو میاں!" حافظ جی گویا ہوئے تو جگنو دِل سے متوجہ ہو گیا۔ "شام ڈھل رہی ہے...... ہر ایک چیز...... خواہ وہ جاندار ہے یا بے جان اپنے اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے اور کالی سیاہ رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے اپنے ٹھکانے اور مقام پر پہنچ کر دِن بھر کی تھکان اتارنے کیلئے محوِ آرام ہونے کی کوشش کرتی ہے۔" آج جگنو حافظ جی کا اداسی سے بھرا لہجہ سن کر پریشان ہو گیا تھا حالانکہ اُنہیں تو خوش ہونا چاہیئے تھا کہ جگنو کی شادی ہو گئی ہے۔ مگر حافظ جی کی اداسی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

"کبھی سمندر کی بے رحم موجوں کو دیکھا ہے؟ جو اپنی سطح پر بہتی ہوئی لکڑی کے دو ٹکڑوں کو کبھی آپس میں ملا دیتی ہیں اور کبھی تھوڑی دیر کیلئے ایک دوسرے سے الگ کر دیتی ہیں۔ بالکل اسی طرح بیوی، اولاد، کنبہ اور دولت بھی مل کر الگ ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی جدائی ناگزیر ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح اپنے آپ کو تقدیر اور حالات کی بے رحم موجوں اور گردشِ دوراں کی سختیوں کے مقابل خود کو لکڑی کے دو ٹکڑے تصور کرنا زندگی آسان اور سہل ہو جائے گی۔ جو لوگ جدائی کو بڑا تصور کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ جدائی محبت اور عشق کی میراث ہے اس میں مٹھاس ہوتی ہے۔" حافظ جی چند لمحے خاموش ہوئے تو جگنو کے چہرے پر ان کے دو آنسو گر گئے جو جگنو کو حیران کر گئے لیکن وہ کچھ نہ بولا وہ چاہتا تھا کہ حافظ جی بولیں اور وہ سُنے۔

"جگنو میاں! تم حق و معرفت کی بہت سی منازل طے کر چکے ہو۔ میں نے تمہیں اللہ کی رحمت اور مرشد کے حکم پر بہت کچھ سکھایا ہے اور تم نے ہونہار اور اچھے شاگرد کی طرح ہر بات کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے اور بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔ دُنیا کی نظروں میں تم جو کچھ بھی ہو۔ جیسے بھی ہو بالکل ویسے ہی رہنا۔ حالات تمہیں بہترین استاد کی طرح تعلیم و تربیت دیتے رہیں گے۔" حافظ جی خاموش ہو گئے تو جگنو اُٹھ کر ان کے سامنے دو زانو بیٹھتا ہوا بولا۔

"آپ کہیں جا رہے ہیں؟" ان کے لبوں پر ہلکا سا تبسم پھیلا۔

"میں کہاں جاؤں گا...... ابھی تمہارے پاس ہی ہوں...... تم اب گھر جاؤ...... دُلہن تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔" حافظ جی کے یاد دلانے پر اُسے یاد آیا کہ گھر میں اب والدین کے علاوہ کوئی

اور بھی ہے جو اس کا منتظر ہے۔ وہ ڈرتا ڈرتا بولا۔

"حافظ جی!...... میں اُسے چھو سکتا ہوں؟" شرم سے اس کی نگاہیں مزار شریف کے فرش پر گڑھ گئی تھیں۔ حافظ جی مسکراتے ہوئے بولے۔ "آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث اور قرآن کریم کا فرمان ہے کہ "ان عورتوں کے جسم تمہاری ملکیت ہیں یا تم ان عورتوں کے جسموں کے مالک ہو جو تمہارے نکاح میں آ چکی ہیں...... تم گھر جاؤ' دُلہن تمہاری منتظر ہے......" حافظ جی اُٹھ کر اندر کی طرف بڑھ گئے تو جگنو پرکشش خیالات کی یلغار میں کھویا ہوا گھر کی جانب چل پڑا۔ وہ حافظ جی کے اداس لہجے میں متفکر ہو جاتا اور شائد ہمیشہ کی طرح گھر ہی جاتا اگر اس کی شادی نہ ہو چکی ہوتی یا حافظ جی اُسے گھر نہ بھیجتے۔

شرماتے لجاتے جگنو کو آمنہ اور عائشہ بی بی نے اس کے کمرے میں دھکیل دیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جو کبھی آمنہ کے مصرف میں تھا۔ تبھی تو اس کی حالت کچھ بہتر تھی۔

سامنے پلنگ پر فریحہ دُلہن کے رُوپ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جگنو کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ اس نے فریحہ کو تصور ہی تصور میں کئی بار چوما تھا دِل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ وہ اس بات کا اظہار فریحہ سے کبھی بھی نہ کر پایا تھا۔ یا تو اُسے موقع نہ ملا تھا یا پھر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ یا پھر اُسے اظہار کیلئے الفاظ کی ضرورت تھی۔ یا پھر فریحہ نے اُسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا بہتر سمجھا تھا۔ وہ زندگی گزارنے کیلئے جن حسین سپنوں کا تاج محل سنوارا کرتا تھا اس میں فریحہ کو مہارانی بنا کر اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی گھتلیاں سلجھاتا رہتا تھا مگر ہر بار سرا اُلجھ جاتا تھا وہ دولت امارت اور غربت کی جمع تفریق میں اس قدر اُلجھتا تھا کہ اس کی ذات نفی ہو کر زندگی کی گھنجلوں میں اُلجھ جاتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ڈھونڈتا ہوا جب ایک سرے کو پکڑتا تو زندگی کی بھول بھلیوں اور حالات کی تجھل میں فریحہ اُسے دوسرے پر کھڑی ملتی تھی۔ اس نے بہت سی راتیں فریحہ کی یاد میں جاگ کر گزاری تھیں۔ مگر آج اس کے تمام خواب حقیقت بن کر فریحہ کی شکل میں اس کے سامنے تھے۔

اس نے حالات اور زندگی کے ساتھ ساتھ گردشِ ایام کی اُلجھی ہوئی ڈور کو بھی اپنی قسمت سے شکست دیکر سلجھا لیا تھا اس کے ہاتھ میں وقت کی رفتار کے دونوں سرے آ گئے تھے۔ اس کے سپنوں کے تاج محل کو مہارانی مل گئی تھی۔ اس کی برسوں کی محبت اور بچپن کی منگیتر فریحہ حقیقت میں اس کے سامنے تھی۔ اس کی دسترس میں تھی وہ اُسے چھو سکتا تھا۔ چوم سکتا تھا اس کی داسی کی طرح پرستش کر سکتا تھا۔ دِل کے آئینے میں جمی ہوئی اس کی تصویر پر جو گرد تھی وہ صاف ہو گئی تھی۔ وہ کئی

لمحات تک اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بھولا بھالا اور جھلا تھا مگر اس بات کی اُسے بہت خوشی تھی کہ اس کمرے میں جو بھی اس کے علاوہ جاندار وجود ہے وہ اس کی ملکیت ہے اور پھر فریحہ تو اس کا سپنا تھی۔

فریحہ نے اندر داخل ہونے پر جگنو کی طرف دیکھا تو وہ اُسے معصوم اور بھولا بھالا نظر آیا۔ مگر فریحہ کی نظریں قصائی کی طرح بے رحم اور دل کی چھریاں بہت تیز تھیں جو جگنو کے جذبات اور ارمان کو ذبح کرنے کیلئے بالکل تیار تھیں۔

”وہ سہما ہوا چلتا ہوا جب فریحہ کے پاس پہنچا تو وہ اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی جگنو اس کی اس ادا پر شرما کر بی اور سہم کر رہ گیا تو وہ چارپائی سے نیچے اس طرح بیٹھ گیا جیسے کوئی بیمار کی پُرسی کیلئے آیا ہو۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ فریحہ کے ہاتھ پر رکھا تو جگنو کے پورے وجود میں حرارت دوڑنے لگی۔ اُسے یوں لگا جیسے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ اس کے جسم کی نسوں میں بجلی کی مانند دوڑ گیا ہو۔ جب فریحہ نے اُس کی اس حرکت کا بُرا نہ منایا تو جگنو کو کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ الفاظ جمع کرتا ہوا بولا۔

”وہ جی.....!“ فریحہ اس کی طرف دیکھنے لگی کہ یہ کملا جھلا کیا کہنے والا ہے۔ ”میں آج بہت خوش ہوں جی۔“

”کیوں؟“ فریحہ نے مختصر جواب اور سوال پوچھا۔ جگنو کو بات بڑھتی ہوئی نظر آئی تو وہ ہمت کر کے بولا۔

”وہ جی..... اَشل میں..... بات یہ ہے کہ..... میں آپ شے بہت پیار کرتا ہوں جی۔“ فریحہ اس کے پیار پر لعنت بھیجتی ہوئی بولی۔ ”لیکن کیوں؟“ اس کے لہجہ کی تلخی کو جگنو نے محسوس نہ کیا یا پھر وہ محسوس نہ کرنا چاہتا تھا۔

”آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ اِش لیئے۔“ فریحہ کو اپنے مقصد کی غرض تھی اُس نے دانیال اور احسن کے کہنے کے مطابق جگنو سے تلخ رویہ ختم کر کے پیار کی پالیسی اپنائی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ایک رات کی دُلہن ہے اور پھر ازدواجی تعلقات کے بعد وہ اس کملے اور جھلے سے طلاق لے کر عدت کے دن پورے کرے گی اور پھر دانیال کی سیج سجائے گی۔

”جگنو! تم بھی مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔“ جگنو کی باچھیں کھل گئیں وہ حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو گیا تھا اُسے اپنی سماعت پر یقین نہ ہو رہا تھا وہ بار بار فریحہ کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا ان ہونٹوں کو چومنے کی جرات کرنا چاہتا تھا جن سے یہ بات نکلی تھی۔ ”نیچے کیوں بیٹھے ہو..... اِدھر آؤ نا..... میرے پاس بیٹھو۔“ اس نے کھینچ کر جگنو کو اوپر اپنے پاس بٹھا لیا۔ ”مجھ سے کتنا پیار کرتے ہو جگنو؟“ فریحہ اس کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اس کے ہاتھ کو سہلانے لگی تھی۔ جگنو کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس کی جان اس کی چاہت اُسے پیار کر رہی تھی وہ بھی خوابوں میں نہیں بلکہ حقیقت میں۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ وہ فریحہ کے ساتھ بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا دِل کی تمام باتوں کو وہ اس حسین اور خوبصورت رات میں ہی کر لینا چاہتا تھا مگر فریحہ اس گھر میں دوسری رات گزارنے کو تیار نہ تھی۔ اس کا انداز خود سپردگی کا تھا۔ اُس نے جگنو کو چادر کی طرح اپنے اوپر اوڑھا لیا تھا۔

اس کاروباری اور سوداگری کی رات کو بیت جانا چاہیئے تھا کیونکہ محبت اور عشق کی معراج کو بلند رکھنے والے ایسی حسین راتوں کے ٹھہر جانے کی دُعائیں مانگا کرتے تھے۔ سجدوں میں گر کر اس رات کی قربت اور محبوب کا وصل مانگا جاتا ہے۔ لیکن یہ رات تو اماوس کی رات تھی۔ جگنو کے دِل میں ناچنے والی خوشیاں صبح پڑتے ہی اس طرح ماند ہونے والی تھیں جس طرح کوئلوں پر کوئی پانی پھینک دیتا ہے۔

یہ رات کا پچھلا پہر تھا جگنو تھکاوٹ اور رت جگے کی وجہ سے سو گیا تھا۔ فریحہ نے موبائل پر دانیال سے رابطہ کیا اور اسے تمام حالات و واقعات سنانے لگی۔ ان کا مقصد اور خواب پورا ہو گیا تھا۔ جگنو قربانی کا بکرا بن گیا تھا۔ ایسا بکرا جس کا دِل کلیجی بے رحم قصائی نے کھا لیا تھا اور اس میں بکرے کی مرضی بھی شامل تھی مگر اتنی بے دردی اور بے رحمی سے قصائی اپنا چھرا استعمال کرے گا یہ بکرے کو توقع نہ تھی۔

اگلی صبح ابراہیم' عائشہ بی بی اور آمنہ کے ساتھ ساتھ جگنو کیلئے بھی حیران کن تھی۔ فریحہ نے ان سب کو جگنو کے ذریعے اپنے کمرے میں بلوایا تھا وہ بالکل تیار کھڑی تھی۔ جگنو رات کی خوش نصیبی پر رقصاں تھا اس کا رواں رواں خوشی سے ناچنے لگا تھا مگر آمنہ اور عائشہ بی بی کے چہروں پر حیرت قائم تھی جبکہ ابراہیم ہر قسم کے فیصلے اور حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے ذہنی طور پر تیار کھڑا تھا۔

”کیا بات ہے بیٹی؟“ ابراہیم نے اشارہ کیا تو عائشہ بی بی نے پوچھا۔ ”اُٹھ کر فریش ہو جاؤ۔ میں تمہارے اور جگنو کیلئے ناشتہ بھجواتی ہوں۔“ مگر فریحہ پلنگ سے نیچے اتر آئی اس نے اپنی جوتی پہنی اور ان لوگوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر باہر صحن میں آ گئی وہ تمام لوگ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے آئے تو وہ حیرانگی سے بولی۔

''آپ لوگ حیران کیوں ہیں؟'' اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ ''معاہدے کے مطابق ہر کام تو اچھے طریقے سے ہو گیا ہے۔'' ابراہیم اور دوسرے معاہدے کا سن کر حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

''معاہدہ؟...... کیسا معاہدہ فریحہ بیٹی؟'' ابراہیم نے دِل کے خدشات کو زبان سے ادا کیا تو وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی اور بولی۔ ''احکامِ شریعت کی ادائیگی کا...... اور کیسا معاہدہ؟'' وہ بھی حیران تھی مگر ابراہیم اور عائشہ بی بی کی نظریں اس کے الفاظ پر جھک گئیں۔ ''کیا ممّا اور پاپا نے آپ کو نہیں بتایا؟''

''جو بھی بات ہے فریحہ کھل کر کہو...... دیکھ میں تمہاری بھابی بھی ہوں اور دوست بھی۔'' اس بار آمنہ بولی تو وہ اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولی۔

''بھابی...... مما آپ کو بہو قبول کریں گی تو رشتہ جتانا...... اور ویسے بھی ہم کمی کمین لوگوں سے رشتہ نہیں جوڑتے۔'' اس کے فقرے نے ابراہیم کے خدشات اور خوف کی تقویت بخش دی تھی۔ ابھی شادی کی پہلی رات ہی گزری تھی کہ اس کی بہو نے اُن لوگوں کو کمی کمین کہہ دیا تھا اور اب آگے آگے پتہ نہیں کیا ہونے والا تھا۔

''تو پھر جگنو پر مہربانی کیسے ہو گئی...... وہ بھی تو اس گھر کا اہم فرد ہے۔'' آمنہ نے جواب دیا تو وہ نفرت سے جگنو کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''کبھی کبھی گندا خون چوسنے کیلئے انسان اپنی خوشی سے بھی اپنے زخموں پر جونکیں بٹھا لیتا ہے۔'' اس نے جگنو کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ ''یہ تو وہ گندا کیڑا ہے جو کسی انسان کے کپڑوں کو چھو جائے تو اُس پر غسل واجب ہو جاتا ہے۔''

''فریحہ!'' جگنو کی زوردار گونج بھری آواز کے ساتھ ہی ایک زوردار تھپڑ نے فریحہ کا گال سُرخ کر دیا وہ تو حیرانگی سے اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر اُسے دیکھتی رہی مگر گھر والے تینوں افراد ہی جگنو کا یہ روپ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ ابراہیم نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ کی طرف، حیرت سے دیکھتے ہوئے جگنو کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُسے پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا۔

''آپ خاموش رہیئے ابا جی!'' وہ نرمی اور متانت سے بولا۔ ''اِس نے مجھے گندہ کیڑا کہا...... ٹھیک ہے...... میں مانتا ہوں...... کہ غربت کی گود میں پل کر جوان ہوئے اِنسان گندے کیڑے ہونگے...... لیکن اِس سے میرے خاندان کو آپ کو...... اماں اور آمنہ باجی کو کمی کمین اور خون چوسنے والی جونکیں کہا...... میں اِس کی زبان کھینچ لوں گا۔'' وہ ایک بار پھر فریحہ کی طرف بڑھا تو

ابراہیم نے اُسے جھپٹ ڈال کر پیچھے کی طرف دھکیلا۔ فریحہ ایک تھپڑ کھا کر ہی سہم گئی اس کی زبان کو تالا تو نہ لگا لیکن پہلے جیسی اکڑفوں نہ تھی۔

''میں دانیال سے دوبارہ شادی کرنے کیلئے حلالہ کی شرعی رسم پوری کرنے آئی تھی۔'' اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر تو ابراہیم دِل تھام کر بیٹھ گیا۔ آمنہ اور عائشہ بی بی اتنی بڑی جھوٹی کہانی اور اصل کے جھک جانے کو سمجھ ہی نہ سکیں تھیں وہ حیرت سے گنگ ہو کر رہ گئیں تو فریحہ کی آواز نے اُنہیں مزید جھنجوڑا۔

''دانیال مجھے لینے آ گیا ہے...... میں جا رہی ہوں اور تم......'' وہ جگنو کی طرف مڑی۔ ''تم میری نظر میں اُتنے ہی حقیر اور نیچ ہو جتنے پہلے دِن تھے...... مجھے طلاق بھیج دینا...... ابھی اور آج ہی......'' وہ جگنو کے سپنوں کا تاج محل چکنا چور کر کے باہر نکل گئی تھی۔

یہ سب کچھ تو نہ سوچا تھا جگنو کی آنکھیں برسات بننے لگیں تھیں وہ فوراً باہر نکل گیا اس نے دیکھا کہ فریحہ دانیال کے ساتھ گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور محلہ بھر کے مرد و خواتین گلی میں کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جگنو نے آگے بڑھ کر گاڑی کے بونٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ گاڑی کے آگے کھڑا تھا اس کے ہونٹ لرز رہے تھے ہاتھ اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں وحشت چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر محلّہ بھر کی عورتوں اور مرد حضرات کی طرف دیکھا اور پھر اپنے والدین کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

اس نے حسرت سے گلی میں گھر کے آگے لگائی جھنڈیوں اور مکان کے ماتھے پر لگائی گئی عارضی لائٹنگ کی طرف دیکھا تو دِل مسوس کر رہ گیا۔ وہ گاڑی کے بونٹ پر زور سے ہاتھ مارتا ہوا بولا۔

''تم نے مجھے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینکا ہے......'' دانیال اس کملے اور جھلے کے غصے سے واقف نہ تھا وہ پریشان ہو کر فریحہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ''میری محبت اور میرے عشق کا مذاق اُڑایا ہے...... تم تو جلاد سے بھی ظالم نکلی ہو......'' اس کی سسکیوں اور آہوں میں اضافہ ہو گیا تھا ابراہیم اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے جگنو کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ ہاتھ نہ آ رہا تھا اس کے ارمانوں کا خون ہو گیا تھا اِس کا دِل کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ دِل کے مندر میں بیٹھی ہوئی پوجا کی دیوی کسی اور کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ زخمی شیر کی طرح گاڑی کے سامنے غرا رہا تھا۔

''ایک بات یاد رکھو فریحہ! تم نے میرے ماں باپ کے جذبات سے کھیلا ہے۔ میرے دِل کو توڑا ہے...... تم نے مجھے اپنے مقصد کے لیئے استعمال کیا ہے نا...... یاد رکھنا...... تم اِس کی کبھی نہیں ہو سکو گی...... کبھی بھی نہیں...... میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا...... کبھی نہیں......'' وہ غش کھا کر

گر پڑا تو محلہ دار تماشائی آگے بڑھے تو دانیال کو موقع مل گیا وہ گاڑی ریورس گیئر میں وہاں سے نکال لے گیا۔

☆☆☆

عفی اور اکبر علی کے ساتھ ساتھ رحمٰن اور عبداللہ کا رنگ بھی زرد ہو چکا تھا۔ بریگیڈیر ان کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہ اپنی اپنی جگہوں پر چوکس ہو کر رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی اسی لمحہ شاتمِ رسول' گستاخِ رسول کارٹونسٹ ممبر کی گاڑی پارلیمنٹ کے مرکزی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ بریگیڈیئر کی چند لمحوں کیلئے توجہ اس جانب مبذول ہوئی تو ان کی سانسوں کی روانی بحال ہوگئی۔ اُنہوں نے اس ممبر کو گاڑی سے باہر نکلتے دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ اور پھر اکبر علی کی گونج دار آواز نے بھی ان کو گرما دیا۔

''نعرۂ تکبیر'' اکبر علی کی اس آواز کے ساتھ ہی عفی کی کلاشنکوف نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جو شاتم رسول کے غلیظ وجود کو روشندان میں تبدیل کر گئی۔ اکبر علی اور رحمٰن نے چاروں طرف گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جس سے بہت سارے ملعون جہنم واصل ہو گئے۔ عبداللہ نے جیپ پارلیمنٹ کی بلڈنگ کی طرف دوڑا کر چھلانگ لگا دی۔ اسی لمحہ چھت پر سے ان پر گولیاں بارش کی طرح برسنے لگیں۔ وہ کھلے صحن میں تھے سب سے پہلے اکبر علی گولیوں کا نشانہ بنا وہ تڑپ کر گرا اور جامِ شہادت نوش کر گیا۔

یکدم کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور جیپ میں پڑا ہوا اسلحہ بارود دھماکے سے پھٹ گیا اور پارلیمنٹ کی بیرونی دیوار تنکوں کی طرح ہوا میں بکھر گئی۔ گیٹ اور چھت پر سے ان پر فائرنگ میں تیزی آ گئی تھی۔ گولیوں نے ان کا مقصد پورا کر دیا تھا وہ باری باری کلمۂ حق بلند کرتے ہوئے جنت کی ٹکٹیں لیکر اس کے حقدار بن گئے تھے۔ حورانِ جنت ہاتھوں میں تازہ اور جنت کے گلابوں سے بنے ہوئے ہار لیکر آسمان پر ان کی منتظر تھیں۔ اُنہوں نے آخری لمحہ بارود اور دھوئیں کی بارش میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا ان کی آنکھوں میں خوشی ناچ رہی تھی ہونٹوں پر اللہ اور اس کے رسول کا ذکر تھا اور دِل بارگاہِ الٰہی میں شکرانے کے طور پر جھکا ہوا تھا۔

☆☆☆

کلیم اللہ نے زندان میں وہ رات اللہ تعالیٰ کو مناتے ہوئے گزار دی تھی۔ اس نے رو رو کر رب تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا بندہ بننے پر شکر ادا کیا تھا اور اپنے عشق کو لازوال بنانے کیلئے اس کے محبوب اور کائنات کی جان شمع رسالت پر لاتعداد درود شریف پڑھا تھا۔ اس کی آنکھ لگ گئی مگر

قسمت جاگ اُٹھی تھی۔

انجان اور نہ سمجھ آنیوالی جگہ۔ پر وہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد نورانی نور کا ہیولہ بن گیا تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں انتہائی خوبصورت عورتیں پنکھے سے اُسے دھیرے دھیرے ہوا دے رہی تھیں۔ تاحدِ نگاہ دودھ اور شہد کی بہتی ہوئی نہریں اور درختوں پر لگے ہوئے لذیذ اور شیریں سے بھرپور پھل اس کی دسترس میں تھے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر کسی نہ کسی پھل کی طلب کرتا تو وہ اس کے ہاتھ میں پہنچ جاتا تھا۔ خوبصورت عورتوں نے اُسے زرق برق لباس زیب تن کروایا اس کے بال سنوارے اور اس کے سر پر حسین اور قیمتی پتھروں سے جڑا ہوا تاج پہنا دیا۔ اس کے اردگرد پھیلے ہوئے نورانی ہیولے انسانوں کی شکلیں اختیار کرنے لگے تھے۔ یکدم ایسا ماحول بن گیا کہ وہ ایک سلطنت کا بادشاہ تھا اور باقی تمام رعایا۔ وہ تخت نشین تھا اور اس کے سامنے قطار در قطار غلاموں کی تعداد تھیں۔

اس کے کانوں میں ایک غلام کی آواز گونجی جو دوسرے سے پوچھ رہا تھا۔ ''یہ کون ہے...... اور ہمیں اس کی غلامی میں کیوں دیا گیا ہے۔ اس نے کون سا ایسا کام کیا ہے کہ ہم پانچ وقت کے نمازی اس تخت تک نہیں پہنچ سکے۔'' وہ خود غلام کی بات سن کر پریشان ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحہ اس سمجھدار غلام کا جواب اس کی سماعت سے ٹکرایا۔

''ہم لوگوں نے نمازیں پڑھیں مگر دُنیا کو دکھانے کیلئے ہم نے اللہ اللہ کیا مگر ریاکاری کے ساتھ۔ اگر ہماری بخشش ہوئی ہے تو صرف اس شخص کی بدولت جس نے اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب کی حفاظت کیلئے اپنی جان کی بازی لگا دی۔ اس نے کوئی دکھاوا نہ دِکھایا تھا یہ اس وقت مسلمان بھی نہ تھا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے عشق میں جو تاوان ادا کیا ہے رب تعالیٰ کو اس کا تاوان پسند آ گیا ہے۔ اس کے امتحانوں میں سے چند ایک امتحان باقی ہیں مگر جو ہو چکے ہیں یہ ان میں بخوبی کامیاب ہوا ہے۔ اس نے محبوب خدا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ مقدس پر نازل ہونے والی مقدس کتاب کی اچھی طرح حفاظت کی ہے۔ اپنے پرکھوں کے مذہب سے ٹکر لے کر دین اسلام کی شمع روشن کی ہے۔ اب اس کی قبر بھی تا قیامت روشن ہی رہے گی۔'' وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا تو کلیم اللہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ زارو زار رونے لگا۔ یکدم اُسے اپنی پسلی میں شدید تکلیف کا احساس ہوا وہ کراہ کر رہ گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ تمام منظر یکدم غائب ہو گیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں ہی زندان میں قید تھا۔ اس کی پسلیوں پر ٹھوکر مارنے والا اس کے باپ چوپڑہ کا پالتو کتا تھا جسے خاص کلیم اللہ کے لیے

ہی رکھا گیا تھا۔ وہ ہٹا کٹا ہندو نوجوان تھا۔ اس کی پھڑکتی ہوئی بازوؤں کی مچھلیاں اور چہرے پر برسنے والی خباثت اس بات کا عندیہ دے رہی تھی کہ وہ کلیم اللہ کو عنقریب جان سے مار دے گا۔

اس کو اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ وہ کھڑا تھا اور اس کے قدموں کے نیچے ایک بڑی سی کرسی نما میز رکھی ہوئی تھی جس کے پائے لرز رہے تھے عنقریب ٹوٹنے ہی والے تھے۔ اس کا منہ ایک روشندان نما کھڑکی سے باہر تھا جس سے وہ صحن میں ہونیوالی پوجا پاٹ کا نظارہ کر رہا تھا یا پھر یوں کہیئے کہ اُسے نظارہ کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ محل کا صحن جو کہ بہت بڑا لان تھا اس میں کنپتی بھگوان کی مورتی پہلے سے بھی بڑی کر کے ایک چبوترے پر ٹکا دی گئی تھی۔ یاتری لوگ اس کے اردگرد خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور ایک ہندو جوگی اور پنڈت کچھ راگ الاپنے میں مصروف تھے۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے کنکروں کا بہت بڑا ڈھیر تھا جو چوپڑہ نے کلیم اللہ کو مروانے کیلئے منگوایا ہوا تھا۔ سینکڑوں لوگ موجود تھے۔ ہر نسل اور رنگ کا ہندو موجود تھا مگر وہ سبھی امیر کبیر لوگ تھے۔

یکدم زندان کا دروازہ کھلا تو اس کی ڈیوٹی پر مامور غلام چوکس ہو گیا۔ کلیم اللہ دیکھ نہ سکتا تھا کہ آنیوالا کون ہے اُسے دوسرے ہی لمحہ پرساد چوپڑہ کی کمینگی بھری آواز سنائی دی۔

''اپنے اللہ کو آواز دے لو کندن...... لاکھوں پتھروں سے اگر وہ تمہیں آ کر بچا سکتا ہے تو بچا لے۔'' اس کی زبان زہر فشانی کرنے لگی تھی۔ کلیم اللہ کے وجود میں خون پارہ بن کر دوڑنے لگا تھا۔ وہ خاموش ہو کر اس کی بکواس سننے لگا کیونکہ وہ اس کا منہ نہ دیکھ سکتا تھا اور چوپڑہ اس کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ پھر زہر اگلنے لگا۔

''مسٹر کلیم اللہ!'' اس نے پہلی بار کندن کو اس کے مسلم نام سے پکارا تھا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تمہارا نام جس کا معنی ہے اللہ سے کلام کرنے والا...... تمہیں تو کوئی دقت نہیں ہوتی ہوگی...... ان دیکھے اللہ سے بات کرتے ہوئے...... یہ تو بالکل ویسی ہی بات ہوگئی کہ دیواروں سے باتیں کر لو۔ یا پھر آسمان کی جانب منہ کر کے اپنے دل کی تسلی کیلئے بس اللہ اللہ کر لی۔'' وہ بے غیرتی کی حدیں عبور کر رہا تھا۔ اور کلیم اللہ کو صبر کرنا تھا۔ ''آج تمہاری اور میری آخری ملاقات ہوگی۔ آج کے بعد تم اس دُنیا کو نہیں دیکھ سکو گے۔ کیونکہ بھگوان سے محبت کرنے والے تمہیں پتھر مار مار کر پہلے اندھا کریں گے اور پھر بعد میں تمہاری موت کا تماشہ دیکھیں گے۔'' وہ اس کے خوفناک پلان کو سُن کر لرز گیا تھا اس کی ٹانگوں میں ہلچل ہوئی تو میز لرزنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی پرساد چوپڑہ کا قہقہہ گونجا۔

''چچ چچ چچ...... بے بسی کی موت بہت بُری ہوتی ہے...... جب کوئی بھی نہ بچانے آئے تو

پھر ان دیکھے اللہ پر بہت غصہ آتا ہے...... تمہاری ماتا اور ہمدرد کاجل...... وہ سامنے والی بالکنی میں تمہارا تماشہ دیکھنے کیلئے بے تاب و بے قرار ہیں۔'' کلیم اللہ نے سینکڑوں لوگوں سے دور بالکنی میں دیکھا۔ مہارانی اور کاجل اس کے کمرہ کے باہر آنکھوں میں آنسو لیے اداس اور پریشان کھڑی تھیں۔

''او کے مسٹر کلیم'' اس نے جان بوجھ کر اس کا پورا نام نہ لیا تھا یا پھر وہ اپنی زبان سے اللہ کا نام ادا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ سوہنا اللہ یہ چاہتا تھا کہ اس کافر کی زبان سے اللہ کا پاک نام نہ ہی نکلے۔ ''مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ مرو گے تم مسلمان ہو کر...... مگر دُکھ اس بات کا ہے کہ تمہاری چتا کو آگ مجھے ہی لگانا پڑے گی...... او کے...... آخری ملاقات پر میں تمہیں گڈ بائے کہتا ہوں۔'' وہ جانے کیلئے مڑا ہی تھا کہ کلیم اللہ کی پرجوش آواز نے اس کے پاؤں جکڑ لیئے۔

''سنو مسٹر چوپڑہ!'' یہ اپنی آخری ملاقات ہرگز نہیں ہے۔'' اس کے فقرے اور لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ تھوڑی دیر تک تو چوپڑہ بھی ہل کر رہ گیا۔ ''اس ملاقات میں تم بولے ہو اور میں نے سنا ہے...... لیکن اگلی ملاقات میں صرف میں بولوں گا اور تم سنو گے...... تم کچھ بھی نہیں کہہ سکو گے...... کیونکہ تم نے اللہ کی شان میں جو گستاخ زبان استعمال کرنی تھی وہ کر لی...... مجھے اس طرح تماشہ بنا کر تم اللہ کی ذات کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے ہو...... مگر یاد رکھو...... فرعون، شداد، شمر اور نمرود سے بھی بڑے بڑے جابر اور ظالم لوگ اس کے نام کا ''الف'' بھی نہ مٹا سکے...... تم کس کھیت کی مولی ہو۔'' پرساد چوپڑہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کا سُرخ چہرہ اس کی رگوں میں دوڑنے والے گندے خون کا پتہ دے رہا تھا۔

''تم اللہ کو دیکھنا چاہتے ہو تو آج دیکھ لینا چوپڑہ...... میری خوش قسمتی ہے کہ اس کے نام پر جان دے رہا ہوں...... تم شائد جانتے نہیں ہو کہ میری طرح کتنے ہی رب تعالیٰ اور اس کے محبوبؐ کے عاشق ہر روز ان ناموں کی حُرمت اور عظمت پر قربان ہوتے ہیں۔'' اس کا منہ گو کہ باہر کی جانب تھا مگر پرساد چوپڑہ اس کی اواز بخوبی سن سکتا تھا۔

''تو پھر اگلی ملاقات کیلئے...... اللہ حافظ...... مسٹر چوپڑہ...... میں تمہارے بھگوان کو بُرا نہیں کہتا...... کیونکہ تمہاری جاہلیت اور گھٹیا سوچ میں اس پتھر کی مورتی کا کوئی قصور نہیں ہے...... اللہ حافظ۔'' یہ کہہ کر کلیم اللہ نے اپنا منہ زور سے بند کر لیا مگر دوسرے ہی لمحے ایک خاردار کوڑے نے اس کے بدن پر آگ اور چنگاریوں کی لکیر کھینچ دی۔ اس کے ساتھ ہی چوپڑہ کی بے بس آواز گونجی۔

''بعض اوقات مجھے یہ شک ہونے لگتا ہے کہ تم میرا خون نہیں ہو بلکہ کسی خبیث مسلمان نے

تمہاری ماں کے ساتھ عیاشی کی ہوگی......" وہ تو چلا گیا لیکن کلیم اللہ کی آنکھوں سے گرنے والے دو آنسو بہہ کر نیچے لان میں لگے ہوئے پھولوں پر گرے تو پھول وہاں سے جل گئے یوں لگتا تھا کہ کسی نے سگریٹ سے ان کا خوبصورت وجود داغ دیا ہو۔

گنپتی بھگوان کی پوجا ختم ہو چکی تھی اب لوگ قطار در قطار اس مورتی پر پھول پھینکتے جاتے اور کنکروں کے ڈھیر پر سے مٹھی بھر کر پتھر اور کنکر اُٹھاتے جاتے وہ کلیم اللہ کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے اور پرساد چوپڑہ کے اشارہ کے ہی منتظر تھے۔ کلیم اللہ نے قطار میں کھڑے اپنے کلاس فیلوز کو بخوبی پہچان لیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ذہن میں خانہ کعبہ کا تصور کیا اور دِل کو بارگاہِ الٰہی میں جھکا کر بولا۔

"میرے اللہ! میرے معبود بے شک تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور نہ ہی کوئی تیرا شریک ہے۔ تیری ذات وحدہ لاشریک ہے۔ بڑے سے بڑا ظالم اور جابر حکمران تیری ذاتِ مقدس کا محتاج ہے۔ اس جہان میں تجھ کو میرے جیسے کمینے کی عبادت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے اللہ میں نے تیری کوئی بندگی نہیں کی۔ تیری کوئی پرستش نہیں کی۔ بس تیرے بابرکت نام سے محبت اور تیری وحدانیت سے عشق کیا ہے...... میرے مالک میں کمزور اور بے بس انسان ہوں لیکن دِل تیرے عشق اور مصطفیٰ ﷺ کی محبت سے بھرا ہوا ہے۔ میں ان طاقتوں کی بدولت خود کو توانا اور صحت مند محسوس کرتا ہوں...... میں اس امتحان کے قابل نہیں تھا میری یہ اوقات اور بساط نہ تھی لیکن خوش قسمت ہوں کہ تو نے کروڑوں اربوں جانداروں سے اس امتحان کیلئے مجھے ہی چنا ہے...... میرے اللہ اگر یہ تیرے عشق کا تاوان ہے تو پھر اس تاوان کو ادا کرنے کی ہمت اور طاقت عطا فرما۔ اور روزِ محشر مجھے سرخروئی عطا فرما۔"

ملائکہ آسمانوں سے اتر کر جوک در جوک آ رہے تھے حُورانِ جنت رب تعالیٰ کے حکم سے کلیم اللہ کی دِل جوئی کیلئے محبتوں کا سفر طے کرتی ہوئی آ رہی تھیں۔ ہوائیں باادب ہو گئیں تھیں۔ درختوں کے پتے جھوم جھوم کر عشق کی معراج کا پیغام سنانے لگے۔ پھولوں کی ڈالیاں لہک لہک کر رب تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنے لگیں۔ کلیم اللہ کے چہرے پر پہلا پتھر اس زور سے پڑا کہ اس کی بند آنکھیں کھل گئیں کیونکہ اس پتھر کی کوئی چوٹ نہ تھی اس پتھر نے اُس کی پیشانی پر کوئی زخم نہ لگایا تھا۔ بس محبت اور عقیدت سے اس کے ہونٹوں کو پھول بن کر چوما تھا اور روتا ہوا نیچے گر گیا تھا۔

پرساد چوپڑہ اور گنپتی بھگوان کے ماننے والوں نے دیکھا کہ رب تعالیٰ اس دور میں بھی معجزے دِکھاتا ہے کیونکہ وہ اللہ ہے جب چاہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کی ذات کی نفی کرنے

والے اور اس کے ساتھ پتھروں کی بنی ہوئی مورتیوں کو شریکِ عبادت کرنے والے حیرانگی سے دیکھ رہے تھے کیونکہ وہ جو بھی پتھر کلیم اللہ کو مارتے تھے وہ پھول بن کر اس کے چہرے کو چومتا اور نیچے گر جاتا۔ ایک طرف لگا ہوا پتھروں اور کنکروں کا ڈھیر بھی اب پھول اور کلیوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔

چوپڑہ اور دیگر نسلی ہندوؤں کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھٹ گئیں تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یکدم آسمان پر کالے سیاہ بادلوں کی چادر تن گئی۔ ہندو یاتریوں کے دِلوں میں خوف مزید بڑھ گیا۔ وہ ہونقوں کی طرح کبھی پتھر کی مورتی اور کبھی آسمان کی جانب دیکھنے لگے۔ دِن میں رات کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ ہر ایک چیز پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جہاں گھڑی پل پہلے سینکڑوں لوگ دھوپ اور دِن کی روشنی میں رب تعالیٰ کے شریک کو عبادت اور پوجا کے ذریعے اللہ کے برابر کہہ رہے تھے وہ اب تاریک اور گھنگھور اندھیرے کی چادر میں لپٹ گئے ہیں ان کے منہ اور ہونٹوں پر اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدس کے حکم سے قفل لگ گئے تھے۔ اس ہولناک اور دِل کو دہلا دینے والی خاموشی میں کلیم اللہ کی پرجوش آواز گونجی۔

"اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه" اس دہشت بھری آواز نے لان میں موجود تمام بزدلوں کے دِلوں پر خوف طاری کر دیا تھا۔ وہ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح لرزنے لگے تھے۔ کلیم اللہ پرجوش انداز میں بولا۔

"مسٹر پرساد چوپڑہ...... تم نے کہا تھا نا کہ اپنے اللہ کو اپنی مدد کیلئے بلا لو...... دیکھو میرا اللہ اپنی عظمت اور بزرگی کے ساتھ میری مدد کو آ گیا ہے وہ رحمٰن و رحیم ہے مگر جبار و قہار بھی ہے۔ تم کہتے تے نا کہ اللہ دکھائی نہیں دیتا۔ ہر طرف دِل کی آنکھیں کھول کر دیکھو چوپڑہ! تمہیں میرا اللہ ہر طرف دِکھائی دے گا۔ ان بادلوں میں' گھٹاؤں میں' آسمانوں اور فضاؤں میں' تمہارے گھر میں لا دے گئے ان پتھروں میں بھی جو اللہ کی وحدانیت بیان کرتے کرتے پھول بن گئے ہیں...... اس کی رحمت کے طلبگار بن جاؤ۔ اس کے قہر کو مت پکارو۔" کلیم اللہ کی آواز کی گونج ختم ہوئی تو نہ سمجھنے والی آواز کی گونج نے ہر ایک دِل کو لرزا دیا۔ وہ کان کھڑے کر کے آنے والے طوفان کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگے مگر جو سمجھ آ جائے وہ اللہ کیونکر ہوا۔

سُرخ رنگ کی تیز اور ناقابلِ برداشت آندھی ایک طرف سے چلی کہ ہر چیز کو نیست و نابود کرتی ہوئی اس محل پر طاری ہو گئی۔ پتھر کی مورتی بھی رب تعالیٰ کی وحدانیت میں سجدے میں گر گئی۔ لوگ ادھر اُدھر بھاگ کر اپنی جانیں بچانے لگے۔ ہر کوئی اس فکر میں تھا کہ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ

سکے۔ مگر بھگدڑ مچ جانے کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کو پاؤں تلے روندتے ہوئے بھاگتے جا رہے تھے۔ پرساد چوپڑہ نے اپنی ہوش میں قیامت کا منظر دیکھ لیا تھا۔

وہ وقتی طور پر خوفزدہ ہو گیا تھا مگر وہ سمجھا کہ یہ سب کلیم اللہ کی شرارت ہے اُس نے جادو کے زور پر ایسا کیا ہے۔ وہ بھی چھپ گیا تو فضائیں اور ہوائیں "اللہ ھو۔ اللہ ھو۔ اللہ ھو" کی پکار سے گونجتی ہوئی مناسب رفتار اختیار کرتی کرتی ایک طرف کو نکل گئیں۔ کلیم اللہ کی گونج دار آواز نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"اور جن کو یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں۔ انہیں شفاعت کا اختیار نہیں۔ سواء ان کے جو حق کی گواہی دیں اور علم رکھیں۔" (زخرف)

سُرخ آندھی تھمتی تھمتی ختم ہو گئی تھی۔ ہر ایک چیز اپنی جگہ پر بالکل درست انداز میں پڑی ہوئی تھی۔ حیرانگی کی بات تھی کہ اندھیرا چھٹنے پر لوگوں نے دیکھا کہ صرف کنپتی بھگوان کی مورتی سجدہ ریز تھی اور درختوں کے پتے بھی نہیں جھڑتے تھے اور بہت سے لوگ زخمی حالت میں کراہ رہے تھے۔ انہوں نے خوف اور دہشت سے باہر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ اس محل کے باہر بھی ہر چیز اپنی جگہ پر بہنوز موجود تھی۔

چند منٹوں بعد راج تلک محل خالی ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں کوئی آیا ہی نہ ہو۔ کلیم اللہ نے شکرانے کے طور پر آنکھیں بند کر کے منہ آسمان کی جانب اُٹھایا اور بولا۔

"میرے معبود! تیرا لاتعداد مرتبہ شکر ہے کہ تو نے مجھ جیسے حقیر اور گناہگار انسان کی لاج رکھ لی۔ بے شک تو کائنات اور تمام جہانوں کی ہر چیز پر قادر ہے۔"

☆☆☆

"کیا بچوں کی طرح رو رہے ہو جگنو!؟" احمد اس کے سامنے بیٹھا ہوا وہ پچھاڑیں کھاتے ہوئے جگنو کی دل جوئی کر رہا تھا۔ "دیکھو! تمہیں مجھ پر اعتماد ہے نا" جگنو اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ آمنہ عائشہ بی بی اور ابراہیم کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ ابراہیم تو ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا وہ بیٹے کی خوشیاں چھن جانے پر دلی طور پر افسردہ تھا۔ دونوں سے احمد اس کی دل جوئی کرنے میں مصروف تھا مگر جگنو کی تان اس بات پر آ کر ٹوٹتی تھی کہ وہ فریحہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ "میں جانتا ہوں اور فریحہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں..... مجھ پر بھروسہ رکھو..... وہ میری بات مان جائے گی۔" احمد کے لہجہ میں اعتماد کی جھلک دیکھ کر جگنو کچھ پُرسکون ہوا تھا۔

احمد باہر نکل آیا تو وہ آمنہ کو مخاطب کرتا ہوا بولا۔ "آمنہ! ممانے یہ سب کچھ اچھا نہیں کیا۔"

اس کے لہجہ میں تاسف تھا وہ احمد کی صاف گوئی پر قربان ہونے والی ادا سے بولی۔ "احمد! آپ تو جانتے ہیں کہ جگنو نے کبھی بھی کسی کا دل نہیں دُکھایا۔ وہ تو اللہ لوک ہے۔ اس کی محبت کے ساتھ زندگی میں اتنا بڑا دھوکا..... ہم سے جگنو کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔" آمنہ کی آنکھیں پھر سے نم ہو گئیں تو احمد نے اپنی انگلی کی پور سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لیئے اداسی اچھی چیز نہیں ہے..... اس معصوم کا کچھ خیال کرو" وہ ہنسنے کی اداکاری کرنے لگا تو آمنہ اس کا اشارہ سمجھ کر خاموش ہو گئی۔ "اس حالت میں تم اداس ہو گی تو وہ پیدا ہوتا ہی شاعری شروع کر دے گا۔" وہ دونوں ہلکی سی مسکان سے مسکرائے۔ احمد باہر نکلنے لگا تو ابراہیم کی آواز نے اس کے قدم روک لیئے۔

"احمد بیٹا!" وہ چلتا ہوا احمد کے پاس پہنچا تو وہ جی جان سے متوجہ ہو گیا۔ "جی پھوپھا جی!" ابراہیم دُکھ بھرے لہجہ میں بولا۔ "بیٹا اپنی مما سے کہنا..... کہ ابراہیم کے سفید بالوں میں خاک ڈال کر اُسے سیاہ نہ کرے۔" احمد جانتا تھا کہ وہ اس وقت ان پڑھ مفکر کے سامنے کھڑا ہے وہ سر جھکا کر ان کی بات سننے لگا۔ "اُسے کہنا کہ بُرے ارادہ سے بولا جانیوالا سچ ہر قسم کے جھوٹ پر سبقت لے جاتا ہے۔ میرے بیٹے کے ارمانوں اور اس کی خوشیوں سے کھیلنے کیلئے فریحہ بیٹی کی شکل میں جو کھلونا ہمارے گھر بھیجا تھا اُسے خود ہی واپس کر دے..... اس کملے اور جھلے کی آہوں سے ڈرے..... اس کی سسکیاں عرش الٰہی پر سنی جا رہی ہیں..... اس وقت سے ڈرے جب اس کی سسکیاں اور آہیں بددعاؤں میں بدل جائیں گی۔" وہ یہ کہہ کر روتا ہوا باہر نکل گیا۔ احمد اور آمنہ اپنی جگہ گنگ کھڑے تھے۔

"آمنہ! میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں..... میں جگنو کی خوشیاں واپس لانے کی کوشش کروں گا..... میری طرف سے بدظن ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے آمنہ کا ہاتھ پکڑ کر دبایا تو وہ روتی ہوئی آنکھوں سے شوہر کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

احمد کے جانے کے بعد وہ جگنو کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ "کچھ چیزیں ہمارے مقدر میں نہیں ہوتی جگنو" عائشہ بی بی اُسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ ان کی گود میں پڑا چھت کو گھورے جا رہا تھا مگر عائشہ بی بی جانتی تھیں کہ وہ ان کی باتیں غور سے سن رہا ہے۔ "ہم تقدیر سے نہیں لڑ سکتے....."

"تقدیر شے یا امیروں شے" وہ تڑپ کر بولا۔ "مجھے غربت اور مفلسی دیکر اگر تجھے خوشی ہوئی ہے تو میں بھی بہت خوش ہوں..... لوگ تیرے جگنو کو ستاتے ہیں اور خود اوپر بیٹھا ہوا ہے....."

میرا تماشہ دیکھ کر قہقہے لگاتا ہے۔'' وہ روتا ہوا اُٹھ بیٹھا وہ باہر صحن میں آ گیا اس کا منہ آسمان کی جانب تھا۔ اس کا انداز ہ ایسا تھا کہ وہ خدا سے گلے شکوے کر رہا ہے۔ ''ستا لے مجھے...... جتنا مرضی ستا لے...... پر میں...... تجھے نہیں بھولوں گا...... تیرا دامن تیری رحمت اور تیری محبت کو نہیں چھوڑوں گا...... میرے امتحان مت لے...... میں مفلس قلاش اوران پڑھ جاہل ہوں...... میری طرف اپنی آزمائشوں کو مت بھیج...... میں تھک گیا ہوں...... میں تھک گیا ہوں...... میری کھوئی ہوئی چیز مجھے واپس دے دے...... کتنے پیسے لوگے؟ بولو...... میں اپنا آپ بیچ دونگا...... ساری زندگی تیرے نام کے گھنگرو باندھ کر تیرے دوست کے مزار پر ناچتا رہوں گا...... نہ کر...... نہ کر میرے ساتھ...... ایسا...... نہ کر...... میں مر جاؤں گا......'' آنکھیں برسنے لگیں تھیں۔ ابراہیم نے باہر سے آ کر اُسے پکڑ لیا تھا۔ اُسے اپنے گلے لگا لیا تھا وہ اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے اُسے سمجھا بھی رہا تھا۔

''مولا علی مشکل کُشا کا مشہور قول ہے کہ جس آدمی نے تمہیں ذلیل سمجھا ہے اگر تمہیں عقل ہے تو سمجھو کہ اس نے تمہیں فائدہ پہنچایا ہے۔ سب سے زیادہ مصیبت اس آدمی پر آتی ہے جس کی ہمت اور مروت زیادہ طاقت والی ہوتی ہے۔ میرے بچے!...... اللہ کی ذات بڑی بے نیاز ہے۔ اس سے شکوہ گلہ اور جھگڑا نہیں کیا کرتے بلکہ اس کا فضل اور رحم طلب کیا کرتے ہیں۔ ہم نا سمجھ اور بیوقوف ہیں۔ اس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔'' وہ جگنو کو سمجھا رہا تھا اور اس کے آنسو اور سسکیاں آہستہ آہستہ تھم رہی تھیں بے شک صبر اور وقت بہت بڑا مرہم ہوتا ہے۔

احمد مختلف باتیں ذہن میں دہراتا ہوا گھر پہنچا تو اس کی ملاقات گھر کے تمام افراد سے ڈرائینگ روم میں ہی ہوگئی۔ پورے گھر کی فضا پراگندہ ہو چکی تھی۔ اس نے فریحہ کی طرف دیکھا جو پرسکون اور مطمئن انداز میں میٹھی فروٹ کھانے میں مصروف تھی۔ اختر علی ایک علیحدہ صوفے پر بیٹھا گہری سوچ اور پریشانی کے عالم میں مبتلا تھا۔

احمد خاموشی سے چلتا ہوا اختر علی کے پاس پہنچا تو اس نے چونک کر دیکھا اور افسوس اور اداسی سے سر جھکا لیا۔ احمد نے باری باری سب کے چہروں کا جائزہ لیا تو اختر علی کے علاوہ سبھی مطمئن اور خوش تھے۔ امتل احمد کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''بہو کو ساتھ نہیں لائے بیٹا۔'' امتل کا لہجہ میں چھپا ہوا طنز کا نشتر سیدھا احمد کے دِل میں ترازو ہو گیا۔ وہ خاموش ہو کر فریحہ کی طرف دیکھتا رہا۔ ''جب پاؤں کی دُھول اڑ کر سر اور منہ کو کالا کرنے لگے تو فوراً جگہ بدل لینی چاہیئے۔'' احمد کی خاموشی ہنوز قائم دیکھ کر امتل کا پارہ چڑھنے لگا۔

''تم نے سنا نہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں...... فوراً اُس کُتیا کو طلاق دے کر اس خاندان کے نام سے آزاد کرو۔'' وہ امتل کی بات سن کر اختر علی کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چلتا ہوا فریحہ کے پاس پہنچا اور سب کو حیران و پریشان چھوڑ کر اس نے فریحہ کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کھینچ کر اُٹھایا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ درد کی شدت سے کراہ کر رہ گئی۔

''میں آمنہ کو چھوڑ دوں گا...... مگر شرط یہ ہے کہ ایک سال تک...... صرف ایک سال تک فریحہ اس گھر کی بہو اور جگنو کی بیوی بن کر وہاں رہے گی۔ اس کا اس گھر سے کوئی رابطہ نہیں ہوگا۔'' احمد کی گھن گرج سن کر سبھی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے جبکہ اختر علی اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ امتل نے آگے بڑھ کر احمد کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا تو اس نے فریحہ کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے امتل سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ آمنہ آپ کو بہو کے طور پر قبول ہے۔'' اس کے فقرے نے سب کو چنگارہ بنا دیا تھا۔

''وہ اس گھر میں بہو کے طور پر نہیں آ سکتی۔'' امتل نے اٹل فیصلہ سنایا تو احمد کا خون بھی کھول اُٹھا مگر اس کے سامنے کوئی غیر یا مرد نہ تھا بلکہ اس کی ماں تھی اس نے اپنے غصہ کو قابو کرتے ہوئے انتہائی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔

''آپ بات کو سمجھ نہیں رہیں...... آمنہ کا تعلق مجھ سے ہے وہ میری بیوی ہے...... میں اس گھر کی بہو نہیں کہہ رہا میں اُسے ایک الگ گھر میں رکھ رہا ہوں اور میں اس کے ساتھ بالکل خوش ہوں۔'' وہ اپنا سانس درست کرتے ہوئے ہوئے بولا اور فریحہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ''تم اس گھر کی بہو ہو...... اور اس گھر میں ہی اچھی لگو گی...... چپ چاپ میرے ساتھ چلو۔ وہاں سب پریشان ہیں۔'' مگر فریحہ امتل کی پُشت پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

''آمنہ کو طلاق دے دو...... فریحہ جگنو کے ساتھ رہ لے گی۔'' امتل بولی تو اختر علی کھڑا ہو گیا اور احمد کے کندھے پکڑتے ہوئے بولا۔ ''انسان حالات کا غلام نہیں بلکہ حالات اس کے غلام ہیں...... اگر تم کسی گول چھید میں گر جاؤ تو سمجھو کہ تم گیند ہو اسی صورت تم مصیبت کا مقابلہ کر سکتے ہو۔'' وہ امتل کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''جگنو کا رشتہ فریحہ کے ساتھ طے کرنے کیلئے تم میرے ساتھ گئی تھیں اور اب......'' اختر علی خاموش ہو گیا تو سبھی کی آنکھوں میں استفسار تھا کہ وہ نجانے کیا کہنے والا ہے۔ ''اور اب...... فریحہ کی طلاق کیلئے بھی تم ہی جاؤ گی...... میں نہیں۔'' امتل اختر علی کی بات سُن کر تڑاخ سے بولی۔ ''میں ان کمی کمین لوگوں کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھتی ہوں...... جب ان کی بیٹی کو احمد طلاق دے دے گا تو تم دیکھنا...... وہ سر کے بل دوڑے چلے آئیں گے۔'' اختر علی امتل کی بات سن کر زیر لب مسکرایا اور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ولیم شیکسپئر کہا کرتا تھا کہ ہر کسی کی بُری بات سن لو...... مگر اپنا فیصلہ اپنے دِل میں محفوظ رکھو۔" مگر احمد خاموش نہیں رہا بول پڑا۔ "میں آمنہ کو طلاق نہیں دُوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

امتل کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا تھا۔ "تو پھر وہ اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔"

"آپ نے شائد سُنا نہیں کہ اس نے اس گھر کی بہو بننے کیلئے مجھ سے شادی نہیں کی۔ بلکہ میری بیوی بننے کیلئے شادی کی ہے۔" احمد کا جواب بھی سخت تھا۔ عاصم نے پہلی بار زبان کھولی۔

"بھائی آپ...... اس دو ٹکے کی لڑکی کیلئے مما سے بحث کر رہے ہیں۔"

"عاصم!" اختر علی کی گونجدار آواز سن کر وہ خاموش ہو گیا۔ "وہ کوئی راہ چلتی دو ٹکے کی لڑکی نہیں ہے۔ میری بہن کی بیٹی ہے اور میری بھانجی...... تم نے اُسے نہیں بلکہ مجھے گالی دی ہے۔"

"پاپا میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ کھسیانا ہوتا ہوا بولا۔ "میں تو کہہ رہا تھا کہ......" مگر اس کی زبان بند ہو گئی کیونکہ فریحہ نے اپنی چونچ کھول لی تھی۔ "میں اس گھر میں نہیں جاؤں گی۔ کیا جانوروں کی طرح رہتے ہیں سبھی لوگ...... چڑیا گھر سے بھی اتنی بدبو نہیں آتی جتنی اکیلے جگنو سے آتی ہے......"

"اچھا!" احمد حیرانگی سے بولا۔ "کیا کبھی خود کے بارے میں بھی سوچا ہے کہ اس غریب کی خوشیاں چھین کر اس کے ہونٹوں کی ہنسی چھین کر تم نے کونسا گلشن کی شادابی کا کارنامہ انجام دیا ہے۔"

"احمد بھائی! جب آپ نے آمنہ سے شادی کی تھی تو آپ نے کونسا مما سے پوچھا تھا؟" فریحہ کو ابھی امتل کی زبان لگ گئی تھی۔ اس بات کا جواب اختر علی نے دینا مناسب سمجھا!

"احمد نے پہلی شادی تمہاری مما کی پسند اور مرضی سے ہی کی تھی۔ نتیجہ تم نے دیکھ لیا...... اور تمہاری شادی بھی تمہاری اور تمہاری اس مما کی پسند سے ہی ہوئی تھی۔ نتیجہ تم نے دیکھ لیا...... مگر احمد کی شادی اس کی پسند اور میری رضامندی سے ہوئی ہے...... اس کو ہم نبھا کر دکھائیں گے...... چلو احمد......" اس نے آخری دو لفظ احمد سے کہے تو وہ باپ کی طرف متوجہ ہوا۔ "ہم اس گھر میں نہیں رہ سکتے جس گھر میں رشتوں کے تقدس کی بجائے مرضی اور حکم ٹھونس جاتا ہے۔" وہ دونوں باپ بیٹا باہر نکل گئے تو امتل کی آواز نے ان کا تعاقب کیا۔ "اس گھر کے دروازے تم دونوں پر ایک ماہ تک کھلے رہیں گے اختر علی!" وہ مڑا اور مسکراتا ہوا بولا۔

"زندگی کے بہت سارے قیمتی سال تم نے میرے ساتھ گزارے ہیں...... لیکن افسوس ہے امتل بیگم...... کہ تم مجھے سمجھ ہی نہیں پائی...... اختر علی اس دہلیز کو آمنہ کے بغیر کبھی بھی پار نہیں کرے گا۔"

یہ کہہ کر دونوں باپ بیٹا اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے اور عظیم الشان محل کے گیٹ سے باہر نکل گئے۔

"چند دِنوں کے بعد ہی اس کُتیا کا عشق جب سر سے اتر جائے گا تو پھر دم ہلاتا ہوا احمد خود ہی واپس آ جائیگا۔" امتل کی آواز زہر میں ڈوبے ہوئے تیر کی مانند تھی۔ "پھر دیکھتی ہوں کہ اختر علی کی اناء اور اکڑ...... اس کے کمزور اور ناتواں ارادوں کا کب تک ساتھ دیتی ہے۔" وہ فریحہ سے مخاطب ہوئی۔ "تم ٹینشن مت لو ڈارلنگ...... دانیال کو فون کرو...... اور لمبی ڈرائیو پر نکل جاؤ...... میں ذرا مسز فیاض کے ساتھ جا رہی ہوں۔" وہ بےفکری والا انداز اپنائے ہوئے تھی۔ فریحہ نے یاہو کا نعرہ لگایا اور موبائل پر دانیال کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

☆☆☆

امتل نے گاڑی بازار میں پارک کی تو اس کی نظر ابراہیم اور عائشہ بی بی پر پڑ گئی۔ وہ کئی دِنوں سے موقع کی تلاش میں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ فریحہ کی بات کرنے کیلئے اُسے ان کے گھر نہ جانا پڑے۔ آج تقدیر نے اُسے موقع فراہم کر دیا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر ان دونوں کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ عائشہ بی بی کے ہاتھ میں پلاسٹک کی ٹوکری پکڑی ہوئی تھی جس میں اعلیٰ نسل کا فروٹ بھرا ہوا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے دیکھا کہ ٹوکری ابراہیم نے پکڑ لی ہے۔ وہ رش زیادہ ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو یہیں چھیڑنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے مزید چلنے کے بعد دیکھا کہ ابراہیم ایک رکشہ والا کو ہاتھ دیکر اپنے پاس بلا رہا تھا۔ امتل نے یہ موقع صحیح جانا کیونکہ اگر وہ دونوں رکشہ میں سوار ہو کر نکل جاتے تو پھر نا معلوم تقدیر اُسے ایسا موقع کب دیتی۔ اس نے عائشہ بی بی کو ان کا نام لے کر پکارا تو وہ حیرانگی سے مڑ کر اُسے دیکھنے لگی۔ جبکہ ابراہیم نے رکشہ والا سے بات نہ بننے پر پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ عائشہ بی بی کے پاس کھڑی امتل بیگم کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بھی شائد اسی طرح کا کوئی موقع تلاش کر رہا تھا وہ ہجوم میں سے بجلی کی رفتار سے نکلا اور ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ عائشہ بی بی بہت ٹینس ہو کر کھڑی تھیں۔

"امتل بیگم! ہر حسین چیز اچھی نہیں ہوتی...... مگر اتنا ضرور یاد رکھنا کہ ہر اچھی چیز حسین ضرور ہوتی ہیں۔" امتل کی پیشانی پر بل پڑ گئے تو وہ بولی۔ "میں ان پڑھ ہوں میاں جی...... کوئی کام کی بات ہو تو وہ کرو...... یہ فلسفہ اختر علی کی سمجھ میں ہی آتا ہوگا۔ میں تو سیدھی سیدھی بات کرنے اور سننے والی معصوم اور سادہ سی عورت ہوں۔" اس نے ابراہیم کو فقرے کا جی بھر کر طنزیہ ادا میں جواب دیا تھا۔

"تمہاری سادگی کی مشہوریاں تو نوشتۂ دیوار بنی ہوئی ہیں امتل بی بی۔" وہ ایک آہ بھرتا ہوا بولا۔ "میرے معصوم اور بھولے بھالے بیٹے کی زندگی سے کھیلنے کیلئے تم نے جو داؤ آزمایا ہے......"

مگر اثل درمیان میں ہی بول پڑی۔

''میں تنگ آ گئی ہوں روز روز کی چخ چخ سے...... اب جان چھوٹ جانی چاہیئے...... جگنو کو سمجھاؤ کہ فریحہ کو طلاق دے دے ورنہ......'' وہ بات کو جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ گئی تھی۔

''ورنہ کیا......؟'' عائشہ بی بی کا لہجہ پر خوف تھا۔ اثل زہریلی مسکراہٹ لبوں پر لاتی ہوئی بولی۔

''ورنہ جس بیٹی کو بڑے ارمانوں اور چاؤ سے میرے گھر کی بہو بنایا تھا۔ اُسے طلاق یافتہ کا لیبل لگ جائے گا۔''

''اثل بیگم! میں مانتا ہوں کہ میں بیٹی کا باپ ہوں۔'' ابراہیم اور عائشہ بی بی آمنہ کی طلاق کا سن کر لرز گئے تھے۔ ''مگر ایک بات تم بھی ذہن نشین کر لو کہ جس بیٹی کی پرسکون اور پر آسائش زندگی کیلئے تم ہمارے جذبات سے کھیل رہی ہو...... کیا خبر وہ جگنو سے طلاق کے بعد خوش بھی رہ سکے گی یا نہیں۔''

''غریب اور بزدل یا تو طعنے دیتا ہے یا پھر بددعا...... بہرحال تم بھی اس بات کو جانتے ہو کہ میرے پاس دولت اور روپے کی اتنی فراوانی ہے کہ میں اپنی بیٹی کیلئے ہر سکھ اور سکون خرید سکتی ہوں...... اس ہفتہ کے اندر اندر جگنو سے فریحہ کی طلاق...... ورنہ...... جگنو کو سمجھاؤ کہ...... آمنہ کی طلاق...... میرا خیال ہے کہ وہ اتنا بھی کملا اور جھلا نہیں ہے جو طلاق کا لفظ نہیں سمجھتا۔'' آتے جاتے ہوئے لوگ ان کی طرف غور سے دیکھ دیکھ کر آگے بڑھنے لگے تو عائشہ بی بی کے دل کی بھڑاس ان الفاظ میں ان کی زبان سے نکلی۔

''ایک بات تو طے ہے کہ تم جیسی امیر عورتوں کو اپنی عزت کا خیال تو ہوتا نہیں...... ساتھ میں ہم جیسے غریبوں کو بھی لوگوں کی طنزیہ باتوں اور ذومعنی نظروں کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔'' اثل نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور ابراہیم سے مخاطب ہوتی ہوئی بولی۔ ''اپنی سادہ لوح بیوی کو سمجھائیے میاں جی...... غریب کی عزت اور وقار سب کچھ پیسے سے شروع ہوتا ہے اور پیسے پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔'' اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک چیک بک نکالی اور ایک سائن (دستخط) کیا ہوا چیک عائشہ بی بی کی طرف بڑھاتی ہوئی نخوت سے بولی۔ ''اس میں اپنی مرضی کی رقم بھر لینا عائشہ آپا...... شاید تمہاری عزت نفس ٹھیس لگنے سے بچ جائے......'' وہ اور کچھ بولنے ہی والی تھی کہ ابراہیم نے چیک پکڑتے ہوئے کہا۔

''بیٹے اور بیٹوں کی خوشیاں کوٹھے پر مجرا کرنیوالی طوائفیں فروخت کیا کرتیں ہیں۔'' اثل کے چہرے کے رنگ متغیر ہونے لگا تھا۔ ''ہم جیسے غریب اور خوددار لوگ بیٹوں کی خوشیاں بیچا نہیں کرتے...... بلکہ تم جیسے خریداروں کو صدقہ اور خیرات میں بھیک دیا کرتے ہیں۔'' اثل کی ناک کی

نسیں پھولنے لگی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ ابراہیم سے باتوں میں وہ نہیں جیت سکتی اس لیئے بہتری اسی میں ہے کہ وہ اب خاموش اور عزت سے نکل جائے۔ وہ جانے لگی تو عائشہ بی بی بولیں۔

''فریحہ کو خود ہی بھیجو گی۔ یا پھر جگنو لینے آئے؟'' وہ اس سوال پر تلملا کر رہ گئی اور غصے سے پھنکارتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ابراہیم نے چیک طے کر کے جیب میں ڈال لیا اور رکشہ میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

''آمنہ! جو کچھ بھی ہوا ہے اچھا نہیں ہوا۔'' احمد نے آمنہ کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ وہ اس وقت صبح صبح سیر کیلئے نکلے تھے۔ موسم میں قابل برداشت خنکی تھی۔ آمنہ جس حال میں تھی وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ لوگوں کی بڑی تعداد اس وقت سیرگاہ میں موجود تھی لوگ اپنے اپنے طریقے سے جوگنگ اور سیر میں مصروف تھے۔ احمد آمنہ کے قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مما اس حد تک بھی چلی جائیں گی۔'' آمنہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی رکتی ہوئی بولی۔

''آپ کی بات ہوئی اُن سے؟'' احمد نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی بات کا جواب دیا اور پھر دھیرے دھیرے چلنے لگے۔ ''وہ جگنو اور فریحہ کے درمیان اگر طلاق ہی کروانا چاہتی ہیں تو پھر خود کیوں اس رشتہ کو پروان چڑھایا تھا؟'' احمد نے ایک لمبا سانس لے کر تازہ ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں بھرا اور سانس خارج کرتا ہوا بولا۔

''آمنہ! میں نے تم سے محبت کر کے تاج محل تعمیر کروانے والوں میں اپنا نام لکھوانے کی کوشش کی ہے۔'' وہ اب چلتے چلتے لکڑی کے ایک خالی بنچ پر بیٹھ گئے تھے۔ احمد نے آمنہ کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور وہ ان کو سہلا رہا تھا۔ ''میں جگنو کو ایک سادہ لوح اور بھولا بھالا شخص سمجھتا تھا جس کا دُنیاداری سے دور دور تک کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر...... جب فریحہ نے اس سے الگ ہونے کی بات کی تو...... یقین کرو آمنہ! میں اس شخص کے اندر محبت کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو محسوس کر کے لرز کر رہ گیا...... کیونکہ اس سمندر کی لہروں میں اتنی روانی اور اتنا شور تھا...... جو کسی بھی تاج محل کو اپنے ساتھ بہا کر لیجانے کی سکت رکھتا تھا۔'' احمد کی صاف گوئی پر تو وہ اس کی قائل تھی۔

''اس بات کا ہمیں بھی اندازہ نہ تھا کہ جگنو فریحہ سے اتنی محبت کرتا ہے؟'' آمنہ احمد کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی تو وہ ہلکی سی مسکان ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا۔ ''آمنہ [illegible] تو وہ ہوتی ہے...... جو میں نے تم سے کی ہے۔ یا پھر [illegible] تم نے [illegible] ہے...... مگر جگنو...... وہ ان باتوں سے بہت آگے نکل گیا ہے...... وہ ہم سب کو مات دے گیا ہے...... محبت...... ناداں نہیں

مانگتی......بس قربانی پر ہی راضی ہو جاتی ہے۔لیکن جگنو محبت کی سیڑھیاں چڑھتا چڑھتا عشق کی چھت پر جا پہنچا ہے......اور تم جانتی ہو کہ عشق......قربانی نہیں مانگتا اور نہ ہی راضی ہوتا ہے......یہ تاوان مانگتا ہے۔" احمد یکدم خاموش ہوا تو آمنہ چونکتی ہوئی بولی۔

"تاوان؟"

"ہاں آمنہ!......تاوان......عشق کو سرخرو کرنے کیلئے کسی نہ کسی روپ میں تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔تب جا کر اس کے سامنے انسان سر اُٹھا کر جی سکتا ہے یا پھر اکڑ کر چل سکتا ہے......"

"اگر کوئی عاشق ایسا نہ کر سکے تو......؟" آمنہ کا جاندار سوال اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ جگنو کیلئے پوچھ رہی ہے کیونکہ وہ جانتی تھی اور سمجھتی تھی کہ اس کا کملا اور جھلا بھائی کسی بھی قسم کا تاوان ادا نہیں کر سکتا۔

"تو......عشق......کملا اور جھلا بنا دیتا ہے۔"

"مگر وہ تو پہلے ہی ایسا ہے......کملا اور جھلا۔" آمنہ مختصراً بولی تو احمد مسکرانے لگا۔

"جس کا دل کملا اور جھلا ہو......صحیح وہ عاشق ہوتا ہے۔عشق نے تھلوں میں حُسن رول دیا ہے۔اور کائنات کے سب سے خوبصورت شخص کو کنویں میں گروا دیا ہے۔ایک اَٹی کا مول لگا تھا اُس خوبصورت نبی کا......رانجھے نے اپنے کان چھدوا لیئے تھے سوہنی کچے گھڑے کی بیوفائی کی نذر ہو گئی تھی......ننگے پاؤں چل چل کر جس شخص کے پاؤں کے چھالے پھٹ گئے تھے وہ باز نہ آیا تھا۔عشق سلامت کا نعرہ لگاتا ہوا تپتی ریت پر چلتا گیا تھا......اس عشق کے کام انوکھے اور کھیل نرالے ہوتے ہیں......یہ مندر اور مسجد میں داخل ہونے سے پہلے یار کی گلی میں جا کر پتھر کھانے کو ترجیح دیتا ہے۔" احمد پڑھا لکھا تھا مگر یورپ اور امریکہ کی تعلیم اور ان کا رہن سہن احمد پر اپنا غلبہ پانے میں ناکام رہا تھا۔آمنہ محبت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اب اگر جگنو نے عشق کیا ہے تو اس کا تاوان بھی ادا کرنا پڑے گا......" اس نے آمنہ کی آنکھوں میں دیکھا تو اُسے احمد یکدم اجنبی سے لگنے لگا......مانوس اجنبی......ایسا لگتا تھا کہ اُسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے......مگر یاد نہ آ رہا تھا کہ وہ کون ہے......احمد نگاہیں جھکاتا ہوا بولا "جان کو لرزا دینے والا تاوان" آمنہ مزید ڈر گئی۔

"پہیلیاں مت بجھواؤ احمد......پلیز......جو بھی بات ہے کھل کر کہو......"

"تمہیں دُکھ ہوگا آمنہ!" اس کی اجنبیت بڑھنے لگی وہ مزید ڈرنے لگی۔

"کیا تم مجھے دُکھی دیکھ سکتے ہو......؟" وہ کنویں سے بولی تھی۔

"میں تمہیں دُکھ دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" اس کے اس فقرے میں دِکھاوا نہ تھا۔محبت ہی محبت جھلک رہی تھی۔

"تو پھر بات کو مکمل کر دو......" وہ بے صبری سے بولی۔

"میں نے مما سے بات کی تھی کہ وہ جگنو سے فریحہ کی طلاق نہ مانگیں......"

"پھر؟" آمنہ کی برداشت جواب دینے لگی تھی۔اس نے احمد کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اپنا سوال کر دیا۔

"اُنہوں نے ایک شرط رکھ دی۔"

"شرط......؟ کیسی شرط......احمد پلیز......میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔کیوں مجھے تنگ کر رہے ہو۔"

"تمہیں......تمہیں طلاق دینے کی شرط۔" احمد تو خاموش ہو گیا تھا مگر آمنہ کی سماعت بھی لگتا تھا کہ ختم ہو گئی ہے۔

اُسے درختوں پر چہچہانے والے پرندوں کی خوبصورت آوازیں سنائی نہ دے رہی تھیں......اُسے چند لمحے پہلے اس سیرگاہ میں پھیلا ہوا قدرتی حسن......قبرستان کی مانند لگنے لگا تھا......اُسے اپنے اردگرد سیر اور جوگنگ کرتے ہوئے لوگ گدھوں کی مانند لگنے لگے تھے جو اس کی طرف اپنے سرخ پنجے بڑھائے ہوئے بڑھ رہے تھے۔اُسے یوں لگتا تھا کہ اس کے بدن پر یکدم جونکیں چمٹ گئی ہیں جو اس کا خون چوسنا چاہتی ہیں......بلکہ چوس رہی ہیں۔اُسے یکدم کائنات بے رنگ اور بے مزہ لگنے لگی تھی......اس کی بینائی نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا تو لحظہ لحظہ دھیرے دھیرے ہر ایک چیز دھندلی دُھندلی لگنے لگی......اس نے ہمت کر کے گردن موڑ کر احمد کی طرف دیکھا تو چند ثانیے بعد اس کا چہرہ مٹ گیا اور اس کی جگہ دُھند اور کُہر چھا گیا......آمنہ کے ذہن میں چھانے والی تاریکی نے اس کی بینائی پر قبضہ کیا تو وہ ہوش و حواس کھو کر دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر احمد کی جھولی میں گر گئی۔

☆☆☆

جگنو اداس اور پریشان تھا۔شام کے دھندلکے میں پرندوں کی قطاریں اپنے گھروں کو رواں دواں تھیں۔وہ آسمان کی جانب منہ کر کے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ کاتبِ تقدیر سے شکوہ شکائیت کے ساتھ ساتھ جھگڑا بھی کر رہا ہو۔وہ اس وقت مزار شریف کے احاطہ میں بیٹھا ہوا تھا سردی کا زور کم ہو گیا تھا موسم میں تبدیلی کے واضح آثار نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔اس نے بار بار منہ سے کچھ پڑھ پڑھ کر اپنے اردگرد پھونکیں مارنا شروع کر دیں تو حافظ

جی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

''کب تک بھٹکتے رہو گے۔ جگنو میاں؟''

''جب تک وہ مجھ سے خود بات نہیں کرتا۔'' وہ دور خلاؤں میں گھورتا ہوا بولا اس نے حافظ جی کی طرف نہ دیکھا تھا بس وہ دور مغرب کی بلند ترین سطحوں پر سورج کو ایک گولڈن رنگ کے تھال کی طرح غروب ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔

''اچھے کام کرنے کیلئے اچھے دِل اور ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔'' حافظ جی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ وہ بھی آسمانوں کی جانب نگاہیں اُٹھا کر بولے۔ ''کیا دیکھ رہے ہو جگنو میاں؟ مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔''

''جاہل کیلئے خاموشی سے بہتر کوئی چیز نہیں حافظ جی'' وہ ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا بولا۔ ''میں وہ جاہل ہوں جو آپ کی معرفت کی باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ وہ اندھا ہوں جو آنکھیں ہونے کے باوجود بھی وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ جو کچھ آپ دِل کی بینائی سے دیکھ لیتے ہیں۔'' حافظ جی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''جانتے ہو جگنو میاں...... جس گھر میں خاوند اور بیوی خوش رہتے ہیں...... وہاں خدا بھی خوش رہتا ہے...... اور جس گھر میں بیوی حسین اور بدکار ہو...... وہ گھر جہنم سے بھی بدتر ہے۔'' وہ حافظ جی کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا اس نے دُکھ بھرے انداز میں ان کی طرف دیکھا...... اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے اُسے حافظ جی کی بات کا دُکھ ہوا ہو...... مگر دوسرے ہی لمحہ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ کیونکہ وہ ان کے علم اور دِل کی آنکھ کا بہت قدر دان اور مطیع تھا اور ان کی باتوں پر یقین رکھتا تھا۔ ''میں نے کہا نہیں تھا کہ عشق کی راہیں بہت کٹھن ہیں...... ان پر چلنے کیلئے وہ پاؤں ہونے چاہئیں...... جو تپتی ریت پر پرخار راہوں میں چلنے سے دُکھنے نہ لگیں...... اگرچہ کہ...... ان کی کھال بھی اُدھڑ جائے۔''

''میں تو عشق کی راہوں کا وہ مسافر ہوں...... جو پہلی گلی میں قدم رکھتے ہی لُٹ گیا ہو۔'' وہ مغموم لہجے میں بولا تو حافظ جی کے لبوں پر مسکان پھیل گئی۔ ''میری کہانی سے تم نے کوئی سبق نہیں لیا جگنو میاں۔''

''میں آپ جیسا کبھی نہیں بن سکتا حافظ جی۔'' وہ رونے لگا۔

''کبھی میں بھی تمہارے جیسا تھا...... اب بھی تمہارے جیسا ہی ہوں...... بس عشق کو سرخرو کرنے کیلئے اپنی اپنی بساط کے مطابق تاوان ادا کرو...... درجات تمہیں مل جائیں گے۔''

''آپ کو معلوم ہے کہ ممانی اصل نے کیا کیا ہے؟'' وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔

''تم نے کیا سوچا ہے؟'' بات گھوم پھر کر اسی پر آ کر رک گئی تھی وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک لمبا سانس لیتا ہوا بولا۔ ''وہ میری چھوٹی بہن ہے...... مجھ شے بہت پیار کرتی ہے......'' اس کی آنکھیں بھرنے لگیں۔ پانی آنکھوں میں چمکنے سے اُسے سب کچھ دھندلا دھندلا لگنے لگا۔

''میں اپنی جان پر شب کچھ شہہ شکتا ہوں...... لیکن اُش کی آنکھوں میں آنشو دیکھوں گا تو پھر ماں کا دِل تڑپنے لگے گا...... حافظ جی...... میں آج تک اپنی ماں کے برابر بیٹھنے کا گناہ نہیں کر شکا۔'' بے رحم اور ظالم آنسو چھلک چھلک کر اس کی قمیض کو بھگوتے ہوئے اپنی جیت پر رقصاں و مسرور نظر آ رہے تھے۔ حافظ جی اس کی پیٹھ تھپتھپا رہے تھے۔ وہ آنسوؤں پر قابو پاتا ہوا بولا۔

''میں نے ممتا کے عشق کا دعویٰ کیا تھا...... ماں کے دودھ کا حق ادا کرنے کیلئے اپنی جان تک کا نذرانہ ان کے قدموں میں نچھاور کرنے کا شوچ رکھا تھا...... لیکن اُش تاوان کا نہیں شوچا تھا...... اگر احمد بھائی نے آمنہ باجی کو طلاق دے دی تو...... میری ماں مر جائے گی حافظ جی......'' آنسوؤں کی موجیں لگ گئی تھیں۔ آنکھوں کی قید و بند کی صعوبتوں سے آزاد ہو کر وہ اٹھکیلیاں کرتے ہوئے باہر کو لپکے تھے۔ جگنو کے ہونٹ فرطِ جذبات سے کانپ رہے تھے۔

''حافظ جی...... اگر میری بہن کے صدمے شے ماں مر گئی تو پھر...... عشق تو ہار گیا نا...... سُرخرو تو نہ ہوا...... میں تو پھر ''پھاڈی'' ہی رہ گیا نا...... ممتا کی محبت اور جنت کی خوشیوں شے میری جھولی تو خالی ہی رہی نا......'' وہ آہوں کے ساتھ رونے لگا تو حافظ جی کی آنکھیں بھی ماں کے ذکر سے چھلکنے لگیں تھیں۔ وہ جگنو کو دلاسہ دے رہے تھے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ جگنو ان کی طرف نہ دیکھ رہا تھا ان کا بھی مان رہ گیا...... ورنہ آج وہ بھی اس کے سامنے شرمندہ ہو جاتے۔

''میں کملا۔ جھلا...... معذور...... شاری زندگی یونہی گزار دی۔ اپنی آمنہ باجی کے لیئے کچھ بھی نہ کر شکا...... ایک روپیہ بھی کما کر اش کی شادی میں نہ لگا شکا...... اش کے جہیز کی خاطر اپنی جان بھی بیچ دیتا...... مگر مجھ نکمے کا کوئی بھی...... خریدار نہیں ہے...... میں اش کو کوئی بھی خوشی نہ دے شکا...... عفی بھی نہیں ہے...... وہ کش کو بھائی کہہ کر پکارے گی...... میں شاری زندگی اش رشتے کے شامنے شر نہیں اُٹھا شکوں گا...... بہنیں بھائیوں پر مان کرنا چھوڑ دیں گی...... مائیں بیٹوں کی لمبی عمر کیلئے دُعائیں کرنا چھوڑ دیں گی...... میں اکیلا...... اتنے شارے گناہ اپنے شر نہیں لے شکتا حافظ جی۔'' وہ پھر رونے لگا تھا۔ حافظ جی بھی چاہتے تھے کہ وہ دِل کھول کر رو لے...... اپنی بھڑاس نکال لے...... پھر اس نے ان کی جگہ بھی لینا تھی...... وہ جگنو کے ارادوں کو پختہ کر رہے تھے۔ اس کے

دل کو مضبوط کر رہے تھے۔اس کے آنسوؤں کے رستے اس کے اندر کے تمام غم دُکھ درد اور کمزور جذبات کو کھرچ رہے تھے۔وہ امتحان کی آخری درسگاہ میں پہنچ گیا تھا۔اب صرف پیپر حل کر کے ممتحن کو واپس ہی کرنا تھا۔لیکن یہ ضروری تھا کہ پیپر پر ایسا کچھ ضرور ہو کہ ممتحن پرچہ پڑھنے کے بعد سو میں سو نمبر دینے پر مجبور ہو جائے۔کیونکہ ایک نمبر کی کمی سے بھی درجے میں کمی ہو سکتی تھی اور جگنو کو حافظ جی عشق کے سب سے اونچے درجے پر پہنچانا چاہتے تھے۔وہ جگنو کو عشق کی فہرست میں سر فہرست دیکھنے کیلئے اُسے گردشِ دوراں کی بھٹی میں دہکا دہکا کر کُندن بنا رہے تھے۔وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے تھے۔

''میں ماں کی نظروں میں سُرخرو ہونا چاہتا ہوں......اپنے عشق کو تاوان ادا کر کے اپنا سر فخر سے اونچا کرنا چاہتا ہوں میں کوئی کمی کمین نہیں بننا چاہتا......میں عشق کا ہیڈ ماسٹر بننا چاہتا ہوں......میں مامی امتل کے ارمانوں پر اپنے عشق کی مہر لگا کر اوس ڈال دونگا......لیکن حافظ جی......میں فریحہ کو طلاق دینے سے پہلے اس کے لیے ایک دُعا کروں گا......'' حافظ جی کو جگنو کی اس بات پر اچھنبا ہوا وہ فوراً بولے۔

''دعا......کون سی دُعا......؟''

وہ آہوں اور سسکیوں کو قابو کرتا ہوا بولا۔''میں نے عشق کیا ہے تو تاوان ادا کروں گا......اس نے میرے عشق کا امتحان لینے کی کوشش کی ہے......میں تاوان ادا کروں گا تو وہ بھی سزا بھگتے گی......سزا بھگتے گی حافظ جی......'' جگنو کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا اس کے گلے کی نسیں پھولنے لگیں تھیں حافظ دیکھ بھی سکتے تھے اور محسوس بھی کر سکتے تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ جب درویش اس حالت میں پہنچ جائے تو اُسے روکنا بیکار اور رائیگاں جاتا ہے لہٰذا وہ خاموشی سے سنتے رہے۔''میں اس کیلئے دُعا کروں گا......بددُعا نہیں کروں گا......اس طرح تو میرا عشق شرمندہ ہو گا۔میں دُعا کروں گا کہ فریحہ شادی زندگی اولاد کی نعمت کو ترستی رہے......'' وہ جوشِ جذبات سے بولا تھا یوں لگا تھا کہ دھرتی پر آسمان گر گیا ہے۔''میرے اللہ'' اس نے آسمان کی جانب ہاتھ اُٹھا دیئے۔''اس نے میری ممتا کو تڑپایا ہے......اس نے میرے عشق کو ستایا ہے......میری بہن کی خوشیوں کو دھوکا دینے کی جرات کی ہے......میرے اللہ! تیرے حقیر اور پُر خطا بندے کی التجا ہے کہ فریحہ شادی زندگی اولاد کو ترستی رہے......وہ کبھی ماں نہ بن سکے......کبھی ماں نہ بن سکے۔''

آنسوؤں کی قدر کوئی نہ تھی مگر عشق سرخروئی چاہتا تھا۔عشق اپنا تاوان مانگ رہا تھا......محبت اور عشق اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کملے اور جھلے کا امتحان لے چکے تھے اس نے اپنا پرچہ حل کر

کے ممتحن کو دے دیا تھا اپنے عشق کی سرخروئی کیلئے ممتا کی محبت کا بھرم رکھ لیا تھا۔

وہ زار و زار روتا ہوا بولا۔''حافظ جی! آپ گواہ رہیں......میں فریحہ کو طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں......طلاق دیتا ہوں......'' آسمان لرزنے لگا۔سورج غروب ہو کر ہر طرف اندھیرے کی سیاہ چادر کو کائنات کے تمام حسین اور خوبصورت مناظر پر پھیلا چکا تھا......روشنی کی کرنیں اندھیرے کا سینہ چاک کر کے اُسے ختم کرنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھیں......جگنو کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگی تھیں۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ دیکھ کر بھی بے مراد اور جاہل پرساد چوپڑہ کی عقل میں اس کی وحدانیت اور ہر چیز پر قادر ہونے کی حقیقت کا ادراک نہ ہوا تھا۔اس نے اس تمام معجزے کو کلیم اللہ کی جادوگری سمجھا اور اس پر غنڈوں کی طاقت کا پرتشدد مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے شدید زخمی کر کے مینٹل ہسپتال میں داخل کروا دیا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ پرساد چوپڑہ کا بیٹا مسلمان نہیں بلکہ پاگل ہو گیا ہے جو چند الفاظ منہ میں بڑبڑا کر جادو کے ذریعے آندھی اور طوفان برپا کر دیتا ہے جس سے ہندو مذہب اور اس کے پیروکاروں کی عبادت میں خلل پڑتا ہے۔اس شخص کو سخت ترین سکیورٹی اور پرتشدد پاگلوں کے ساتھ بند کر دیا جائے۔

اس کی دولت اور اپرلیول کی اپروچ نے کام دِکھایا تھا کلیم اللہ کو پاگل خانے میں بند کر دیا گیا تھا وہ ڈری ڈری اور سہمی ہوئی نظروں سے اردگرد کے ماحول کو دیکھ رہا تھا۔عجیب وغریب حرکتیں کرنے والے پاگلوں میں وہ خود کو نارمل اور پرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔اس نے دوسرے دِن اکیلے اکیلے شخص (پاگل) کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔وہ ان کے پاگل ہونے کی وجہ کو سمجھنا چاہتا تھا مگر اس کیلئے اس کے ساتھ کسی نہ کسی اور نارمل شخص اور سمجھدار ڈاکٹر کا ہونا ضروری تھا۔بڑی بڑی داڑھی اور مونچھوں والے پاگلوں سے اُسے خوف آیا تھا۔وہ دِل ہی دِل میں ذکرِ الٰہی سے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کام میں اُسے لطف بھی محسوس ہوتا تھا اور سکون بھی۔

اُس نے اپنی بیرک میں تقریباً ہر شخص کو جانچنے کی کوشش کی تھی مگر کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کی طرح باقی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتا۔وہ تو سبھی پاگل تھے مگر وہ تو نارمل تھا۔وہ سارا دِن ان لوگوں کی عجیب وغریب اور دِل و جان کو لرزا اور اُکتا دینے والی حرکتیں دیکھ دیکھ کر بور ہو جاتا تھا۔اس کا دِل چاہتا تھا کہ وہ اپنے سر کے بال نوچ لے۔اپنا ماتھا بیرک کی مضبوط اور لوہے کی موٹی سلاخوں سے ٹکرا ٹکرا کر مر جائے۔

اُس نے دینِ اسلام کے متعلق جتنا بھی پڑھا تھا اور جتنا بھی سنا تھا اس کے مطابق خودکشی حرام تھی اور خودکشی کرنے والے کو تا قیامت اپنی چُنی ہوئی موت پر ہی ہر روز مرنا پڑے گا۔ وہ اس خیال کے آتے ہی دِل و جان سے لرز جاتا اور پھر ربِ تعالیٰ سبحانہٗ کی ثنا بیان کرنے لگتا جس نے انسان کو قیمتی شے ''جان'' سے نوازا تھا اور اسلام اس بات کا ہر جگہ پرچار کرتا ہے کہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور زندگی جیسی قیمتی اور قابلِ قدر چیز کو اپنے طور سے ختم کرنے پر اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا مطلب ہے کہ جہنم کی آگ...... اور وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتا تھا۔

اس نے دو دِنوں سے ایک بات محسوس کی تھی کہ ایک عمر رسیدہ پاگل اپنی بیرک سے باہر نظر آنے والے آسمان کی سمت گھورتا رہتا تھا اور اس کے ہاتھوں کا انداز ایسا تھا۔ جیسے وہ پتنگ اڑا رہا ہو...... ایسی ہی بے تکی اور اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے ہوئے تمام پاگل کوئی معرکہ سر نہیں کر رہے تھے مگر اس بزرگ میں نہ جانے کیا کشش تھی کہ وہ کلیم اللہ کو ان تمام پاگلوں سے قدرے بہتر لگا تھا۔ کلیم اللہ نے کئی بار چاہا تھا کہ اس سے بات کرے لیکن وہ ہچکچا جاتا تھا کہ نجانے وہ کیا کہے یا پھر اس کی بات نہ سمجھے...... اُسے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ وہ کوئی پرتشدد کارروائی سے اُسے نقصان ہی نہ پہنچا دے...... وہ یہ سوچ کر ہی خاموش رہ جاتا تھا۔

وہ اپنی مسلمان زندگی اور پہلی زندگی کا تقابل کرنے لگا۔ اُسے ہندو مذہب سے خاص لگاؤ تھا وہ ہر پوجا اور ہر بھجن میں خصوصی طور پر شریک ہونا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ پرساد چوپڑہ کا گھر سوَرگ محل بنا ہوا تھا۔ اُسے بہت سے بھجن ازبر یاد تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے آلتی پالتی مار کر گھنٹوں ہنومان اور کنہیّا بھگوانوں کی مورتیوں کے آگے بیٹھا رہتا تھا۔ اس کا خیال اور عقیدہ بھی دوسرے راسخ العقیدہ ہندوؤں کی طرح تھا کہ جو کچھ بھی ملتا ہے اور اس کائنات میں جو کچھ بھی ہوتا ہے یہ سب کچھ پتھر کی بے جان مورتیاں ہی کرتی ہیں۔ وہ بہت سے پنڈتوں اور مہاراجوں اور جوتشیوں کو اس مد میں لاکھوں روپے کا گیان دے چکا تھا لیکن ایک خاص بات جو اس نے اپنی طبیعت میں محسوس کی تھی وہ تھی بیزاری اور بے سکونی اس بات کا اظہار اس نے کئی بار اپنے مسلمان جگری یار اور کلاس فیلو خلیل احمد سے بھی کیا تھا لیکن وہ ہر بار بات کو سرسری انداز میں سنتا اور ٹال دیتا تھا۔ اور پھر ایک دن اس کی بات خلیل احمد نے غور سے سنی اور پروفیسر فائز احمد سے بات کی تو انہوں نے کتب کے ذریعے اور قرآن کریم کی روشن اور مقدس آیات کے ذریعے کندن کی ذہنی کوفتوں کو دور کر کے آہستہ آہستہ اُسے اسلام کی طرف راغب کیا اور پھر ایک وہ موقع آیا جب اس نے قرآن کریم کی حرمت اور پاکیزگی کیلئے اپنی جان پر کھیل کر جلتے ہوئے گھر کی الماری سے قرآن کریم کو سینے سے

لگا کر دو منزلہ مکان کی جلتی ہوئی اور شعلوں میں گھری ہوئی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی تھی۔ اس پر ہندوؤں اور مسلمان گروپوں کے جتھے ٹوٹ پڑے تھے۔ اس کے سر کے بال اور ہاتھ جل گئے تھے مگر اس نے اپنی ہوش میں قرآن کریم کو اپنے سینے سے جُدا نہ کیا تھا۔

یہی وہ لمحات تھے جب اس کے سینے میں دھڑکنے والا دِل دینِ اسلام کی تعلیمات سے روشنی حاصل کر گیا اور مسلمان ہونے سے پہلے ہی اللہ سبحانہٗ نے اُسے اپنے مقدس گھر کی زیارت سے فیض یابی بخشی تھی وہ اللہ کی وحدانیت اور قادرِ مطلق ذات کا تبھی قائل ہو گیا جب اس نے اپنے گھر کے لان میں کھڑے کھڑے باہوش حالت میں خانہ کعبہ کا دیدار کیا اور بے اختیار کلمۂ شہادت بلند کیا تھا۔ اس کے بعد پروفیسر احمد فائز سے ملاقات۔ اس کا مسلمان ہونا اور پرساد چوپڑہ کا اپنی جھوٹی انا اور غرور کے خول میں بندرہ کو اپنے چہیتے بیٹے سے دشمنی کرنا اور طرح طرح کے ظلم وستم کے ذریعے اس کے عقیدے اور ایمان کا امتحان لینا شروع کر دیا لیکن اس کے ایمان میں مضبوطی اور عقیدے میں پختہ پن نے اُسے مسلمانوں کی دُنیا میں شامل کر دیا۔ اس نے نمازیں تو بہت زیادہ نہ پڑھیں تھیں لیکن اس نے مسلمان ہونے کے بعد جتنا بھی وقت گزارا تھا اس نے ہر سانس میں اللہ کی ثنا اور اس کے پیارے محبوب مصطفیٰ ﷺ کی مدحت بیان کی تھی۔

اُسے پروفیسر فائز احمد کے وہ خوبصورت الفاظ اچھی طرح یاد تھے جو انہوں نے محبوب کائنات جانِ رحمت، حضور مدینہ سرورِ قلب وسینہ۔ شافعِ روزِ جزا۔ سیّد الثقلین۔ خاتم النبیین سبز گنبد کے مکین، غریبوں، یتیموں، مسکینوں کے ملجا و ماویٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ مقدس کے متعلق بتائے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ربِ تعالیٰ نے ہمیں انسان بنانے کے بعد ہمیں سانس سے نوازا تو کوئی احسان نہیں جتایا۔ ہمارے لیئے پانی، کھانا اور کائنات کی ہر نعمتوں کو وقف کیا ہمارے لیئے کوئی احسان نہیں جتایا۔ جنت کی نوید اور بخشش کی تصدیق کر کے بھی ہم پر کوئی احسان نہیں جتایا لیکن وہ اللہ...... کائنات کی ہر چیز کا قادر، غفور ورحیم اور جبار وقہار اس پروردگار نے قرآن کریم میں واضح طور پر فرما دیا کہ ''میں نے تمہیں اپنا محبوب دے کر تم پر احسان کیا ہے۔'' سبحان اللہ......

وہ محبوبِ الٰہی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مقدس کے متعلق کتب پڑھ پڑھ کر ان کی سخاوت اور فیاضی کے ساتھ ساتھ ان کی دیانت داری اور امین کی زندہ مثالوں اور تاحیات قائم رہنے والی سچی اور ٹھوس حقیقت کا قائل ہو گیا۔ اس کے دِل میں محمد مصطفیٰ ﷺ کی محبت کا ایک ہلکا سا ذرہ نور کی صورت میں چمکا تو ربِ کائنات نے اُسے پیارے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روضہ کی زیارت کروا دی۔ وہ خود کو بہت ہی خوش نصیب تصور کرتا تھا کیونکہ اُسے پیارے آقا کی وہ حدیث اچھی

طرح یاد تھی کہ ''جس نے اپنی باہوش زندگی میں میرے روضۂ اقدس کی زیارت کی اس پر جہنم کی آگ حرام ہوگی۔''

اس کی آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اطہر' مقدس و معطر' مطہر و منور سے محبت نے عشق کا روپ اختیار کرلیا وہ دِن رات روضہ رسولؐ کی حاضری کے لئے دُعائیں کرنے لگا مگر گردشِ دوراں اور پرساد چوہڑہ اس سے مزید امتحان مانگتا ہوا اُسے محل سے جیل اور پھر پاگل خانہ لے آیا تھا۔ مگر اس کے اعتقاد اور ایمان کو رتی برابر بھی متزلزل نہ کرسکا۔ اُس کا ارادہ پختہ ہوتا ہوتا عشق حقیقی کا روپ دھار گیا تو وہ جان کر لرزا دینے والے ناوان ادا کرتا ہوا عشق کی چھت کی جانب سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ اس نے کتنی سیڑھیاں طے کی ہیں اور کتنی ابھی باقی ہیں لیکن اس کا دھیان اور گیان ہر طرح کی آزمائش کیلئے اس کے اِرادوں کو پختہ کر چکا تھا۔

خُداوند کریم کی ذاتِ مقدس نے اس پر مزید کرم فرمایا اُسے راہِ مدینہ کا مسافر بنا کر خواب میں اس کی بھوک اور پیاس ختم کی تھی۔ وہ کعبہ کے نظاروں کو بھول گیا۔ اُس نے گنبد خضریٰ کی چھاؤں میں گر کر رب تعالیٰ کے حضور اپنے دِل کو جھکا کر آنسوؤں سے دِل کی داستان کہنا شروع کر دی تھی۔ وہ مدینہ منورہ کی دوپہروں پر قربان ہونا چاہتا تھا۔ وہ راتوں کی مقدس اور معطر خوشبوؤں کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ وہ صبح کے پرنور اجالوں میں باادب اور احترام سے گزرنے والی ہوا کو چھونا چاہتا تھا۔ وہ مسجد نبویؐ کے بنے ہوئے ہر ایک دروازہ پر آقائے تاجدار مدینہ کا نام مبارک دِل کی آنکھوں سے چومنا چاہتا تھا۔ وہ گنبد خضریٰ کے ساتھ جڑے ہوئے مینار کو بوسے دینا اور گنبدِ خضریٰ کی اپنی پلکوں سے نکلنے والے عشقیہ آنسوؤں سے دُھلائی کرنا چاہتا تھا...... لیکن...... ملعون چوہڑہ کے گھر میں جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی گھر کے تمام افراد اس کے بیڈ کے گرد جمع تھے۔

اس کی حیرت ختم نہ ہوئی تھی کہ چوہڑہ کی زہریلی آواز نے اُسے حیرتوں کی دُنیا سے نکالتے ہوئے اُسے بتایا کہ وہ جس مسجد میں وضو کرتا ہوا بیہوش ہوا تھا اُسی مسجد والوں نے اُسے باہر پھینکوا دیا تھا۔ اس کی دُنیا اندھیر ہونے لگی تھی وہ خوابوں کی دُنیا میں واپس نہ جا سکتا تھا کیونکہ خوابوں پر اپنا اختیار نہیں ہوتا اور پھر روضہ رسولؐ کے پرنور ماحول کی بالکل جاگتی آنکھوں کی طرح زیارت اور پھر اس کی پھٹی ہوئی قمیض اس بات کی سچائی تھی کہ وہ وہاں پہنچا تو خواب میں تھا لیکن اس کی قمیض میں چھید مدینہ شریف کا مسافر بننے کے بعد ہوا تھا۔

وہ رب ذوالجلال کی اس عطا پر اس کا شکریہ نہ ادا کر سکا تھا...... اس نے سوچا کہ وہ کتنا کم

ظرف انسان ہے جسے رب تعالیٰ نے اس محبوبؐ کا روضہ دیکھنے کی طاقت عطا کی تھی۔ جسے کائنات کے انسانوں' حیوانوں' چرند پرند' درختوں' پہاڑوں اور کائنات کی ہر اک چیز کیلئے رحمۃ اللعلمین بنا کر بھیجا تھا اور انسانیت پر احسانِ عظیم کیا تھا۔ وہ اس سے آگے نہ سوچ سکا اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی یلغار نے بھاگم بھاگ شروع کر دی وہ اپنے بیرک کی سلاخیں پکڑ کر رونے لگا...... اس کی آہوں اور سسکیوں کی آواز میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا...... مگر انتظامیہ کو پاگلوں سے ہر قسم کے فعل کی توقع ہوتی ہے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا...... لیکن چند لمحات ہی گزرے تھے کہ اُسے یوں لگا اس کے بیرک میں بند باقی پاگل بھی اس کے سامنے ہی رو رہے ہیں...... وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا...... وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اونچی اونچی آواز میں رو رہے تھے...... اس نے بہتی آنکھوں سے تمام پاگلوں کا جائزہ لیا اور پھر اس کی نگاہ اُس عمر رسیدہ شخص پر گئیں جو پتنگ چڑھانے کی کوشش میں آسمان کی جانب دیکھتا رہتا تھا۔ اس شخص کی آنکھیں ضرور برس رہی تھیں مگر آواز نہ تھی۔ آج وہ بھی کلیم اللہ کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں نجانے کیسی کشش تھی کہ کلیم اللہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ پاگلوں کی گریہ زاری بڑھنے لگی تھی۔ شور اور رونے کی آواز نے پورے ماحول کو سوگوار کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس مینٹل ہسپتال کی ہر ایک چیز رو رہی ہے...... اس نے ابھی چند قدم ہی اُٹھائے تھے کہ اُسے یوں لگا کہ اس کے رونے میں پاگل خانہ کے تمام پاگل بھی شامل ہوگئے ہیں۔ رونے اور شور کی آواز اور دھمک نے ہسپتال کی انتظامیہ کو لرزا دیا وہ اس بے قابو ہوتے ہوئے ماحول کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے تھے ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کس کس کو خاموش کروائیں۔ ایک بوڑھا منتظم دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ اس کی زندگی میں ایسا پہلی بار ہوا ہے۔ چھپن سال کی سروس کے دوران یہ اس کا پہلا موقع تھا کہ پاگل خانہ کے تمام پاگل کسی ایک نقطہ پر متفق ہوئے تھے۔

وہ بزرگ پاگل کی جانب مُڑا تو اس نے دیکھا کہ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے...... لیکن اتنے شور میں اس کی آواز کی سمجھ نہ آ رہی تھی۔ کلیم اللہ حیرت و استعجاب کے سمندر میں غوطے کھاتا ہوا کچھ اور آگے بڑھا تو اس کے دِل کی دھڑکنوں نے اس کے ساتھ بغاوت کی ٹھان لی اور یکدم اپنی رفتار بڑھا دی۔ اُسے اپنی سماعت پر یقین نہ ہو رہا تھا۔ کیونکہ یہ وہی الفاظ تھے جو اس نے متعدد بار فضاؤں میں گونجتے ہوئے سُنے تھے اور حیرت کی بات یہ کہ آواز بھی وہی تھی۔

راہِ عشق تے ٹرنا بڑا اوکھا جے کوئی ٹُرے تے یار ملا دیندا
لا کے تخت اُتوں تاجاں والیاں نُوں خاک رُلاں دے نال ملا دیندا

کلیم اللہ اس کی طرف ایک ٹک دیکھے ہی جا رہا تھا اسی اثنا میں اس نے محسوس کیا کہ پاگل خانے میں شور کم ہو گیا ہے اور بوڑھے کی آواز بالکل واضح طور پر اس کے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔

''یہ سب کیوں رو رہے ہیں......؟ جاننا چاہتے ہو؟'' کلیم اللہ نے حیرت و استعجاب کے عالم میں غوطے کھاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تو وہ دھیرے سے بولا۔ ''یہ سب تمہارا رونا سن کر نہیں روئے...... بلکہ ان سب کو اُس نے رُلایا ہے۔'' اُس نے لفظ ''اُس'' پر انگلی کا اشارہ آسمان کی جانب بلند کیا تو کلیم اللہ کی حیرت مزید بڑھ گئی۔ وہ ایک بار پھر بوڑھے پاگل کی آواز کی جانب متوجہ ہوا۔ ''تم اس کے محبوبؐ کے اُمتی ہو۔ اس کی مقدس چوکھٹ کے دیدار کیلئے دِل میں وہ تڑپ رکھتے ہو جو آنسو بن کر تمہاری آنکھوں سے بہہ نکلے ہے...... دیکھو کلیم اللہ...... اس ربِ عظیم کو تمہارا رونا اس قدر پسند آیا ہے کہ اس نے اس جگہ پر قید تمام ہوش اور بے ہوش لوگوں کو رُلا دیا۔ وہ کیا کہتا ہے؟ اس کا فرمان ہے کہ جنت میں نے اپنے محبوبؐ کیلئے بنائی ہے اور اس کی تقسیم میرا محبوبؐ ہی کرے گا اور محبوبؐ کا فرمان ہے کہ جس نے ایک بار میرے روضہ کی زیارت کر لی اِس پر دوزخ حرام ہو گی۔ یعنی جنت واجب و لازم ہو گی۔ تم نے اس کی چوکھٹ کو پلکوں سے چومنے کی التجا کی ہے نا اُسے تمہارا انداز اور تمہارا ملتمس رویہ بالکل پسند آیا ہے۔ اور کچھ بعید نہیں کہ تمہیں عنقریب اپنے محبوبؐ کی مقدس چوکھٹ کی حاضری سے بھی نواز دے......'' اس کے بعد وہ بوڑھا پاگل خاموش ہو گیا تو کلیم اللہ نے محسوس کیا کہ تمام ہسپتال میں ہُو کا عالم طاری ہو گیا ہے۔ وہ اس بوڑھے کا ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔

''بابا! آپ کون ہیں؟''

''عاشق!'' مختصر جواب نے کلیم اللہ کے تجسس کو مزید بڑھا دِیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اگلا سوال پوچھ لیا۔

''پھر یہاں کیسے؟''

''تم کیسے؟'' اس کا جواب بھی سوال تھا۔

''گردشِ دوراں کا بھٹکایا ہوا مسافر ہوں۔ جو یہاں تک پہنچ گیا۔'' وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا تو کلیم اللہ کو لگا کہ وہ بالکل ابنارمل ہے لیکن اس نے پہلی باتوں کے دوران اس کا پورا نام لیا تھا...... وہ پاگل نہ تھا کوئی ولی اللہ تھا اور کلیم اللہ کو پروفیسر فائز احمد کی وفات کے بعد کوئی بھی پیر کامل یا ولی کامل نہ ملا تھا۔

''گردشِ دوراں کے ظلم و ستم تو انسان سہہ سکتا ہے...... مگر اپنوں کے ظلم و ستم برداشت نہیں کر

سکتا...... میں بھی تمہاری طرح اپنوں کا مارا ہوا ہوں......''

''مگر وہ کون ہے؟ جس نے آپ پر اتنا ظلم کیا کہ آپ کو یہاں آنا پڑا۔'' کلیم اللہ نے مینٹل ہسپتال کا نام لینے کی بجائے یہاں کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اُسے اس پاگل خانہ میں ہوش و خرد سے بیگانوں کی دُنیا میں دین اور دُنیا کی باتیں کرنے والا ایک اجنبی مل گیا تھا جو مسلمان تھا اور اللہ اس کے رسولؐ کا نام لیوا تھا۔

''میرا چھوٹا بیٹا!'' وہ بوڑھا دور خلاؤں میں گھورنے لگا۔ وہ ماضی کے دھندلکوں میں کھونا چاہتا تھا لیکن شائد اس کی کہانی بہت دردناک اور اندوہناک تھی اس نے بات مختصر کرتے ہوئے بتایا۔

''میرا گھرانہ مسلمان ہے اور الحمدللہ ہم ربِ رسولؐ کی ذات مقدس پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ میرے دو بیٹے تھے۔ چھوٹا بیٹا ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھ گیا اس نے اپنا ایمان خراب کر کے ہندو مذہب میں شمولیت اختیار کر لی۔ جبکہ میرا بڑا بیٹا اس ملک کا ہی نہیں بلکہ پوری دُنیا کا جانا پہچانا شخص بن گیا۔ وہ عالم اسلام میں اپنا نام اور اعلیٰ مقام رکھتا تھا اُسے کوئی احادیث اور سنتیں بلکہ قرآن کریم کی ہر آیت کا ترجمہ اور تفاسیر از بر یاد تھیں۔ چھوٹا بیٹا گھر میں ہم دونوں کو پاگل قرار دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے عشق سے سرفرازی فرمائی تو میری قسمت جاگ گئی میں اس رب کائنات کی مرضی اور حکم سے دیوار کے پار اور پھر اگلے حالات بھی جان سکتا ہوں...... میں نے اپنے ہندو بیٹے کو اس کاموں سے روکنا چاہا تو اس نے مجھ پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی اور مجھے پاگل خانہ میں بھجوا دیا...... میں جب چاہوں یہاں سے جا سکتا ہوں...... لیکن...... میری ایک ڈیوٹی لگائی گئی ہے اور وہ ڈیوٹی عنقریب پوری ہونے والی ہے......''

''اور جو آپ کا مسلمان اور عالم بیٹا تھا...... اس نے آپ کا کوئی حال احوال نہیں پوچھا؟'' کلیم اللہ اس بوڑھے کی مختصر سی داستان سے بہت متاثر ہوتا ہوا بولا تو اس نے حیران کلیم اللہ کو آگے بڑھ کر بوسہ دیا اور مسکراتا ہوا بولا۔

''اسی کے قتل کے الزام میں تم جیل گئے تھے۔'' اس انکشاف نے کلیم اللہ کی آنکھیں مزید پھیلا دیں وہ حیرت سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''کیا......؟''

''ہاں...... میں پروفیسر فائز احمد کا والد ہوں اور میرا نام سیّد شریف حسین رضا ہے......'' ان کے لبوں پر مسکراہٹ درد کی لکیر بن کر نمایاں ہوئی تھی۔ ''سید؟'' کلیم اللہ اتنا ہی کہہ پایا اور زار و زار رونے لگا۔ ''آلِ رسولؐ؟'' اس کے لرزتے اور کانپتے ہونٹوں سے اتنا ہی نکل سکا تو سیّد شریف حسین رضا نے اُسے سینے سے لگا لیا اور اُسے دِل کھول کر رونے دِیا۔

''مصیبتیں، پریشانیاں اور دُکھ اس دُنیا کا تحفہ ہیں.....اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو دُنیا کا نام بھی جنت ہوتا۔'' وہ اس کی پیٹھ تھپتھپا رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو کلیم اللہ نے اپنے ہونٹوں کے جام سے پینا چاہا تو اُنہوں نے منع کر دیا۔ ''میں بھی انسان ہوں کلیم اللہ اور مجھے انسان ہی رہنے دو۔'' تو کلیم اللہ نے زبردستی ان کے ہاتھ چومنا شروع کر دیئے وہ دیوانہ وار ان کے ہاتھوں پر محبت وعقیدت کے بوسوں کی مہریں ثبت کر رہا تھا کہ اس کی پیٹھ پر ایک موٹے ڈنڈے کی ضرب پڑی.....لیکن وہ اپنے ہی خیال میں اتنا مگن تھا کہ تیسرے ڈنڈے کی ضرب نے اُسے شدت کرب میں مبتلا کر دیا.....اس نے تڑپ کر پیچھے دیکھا تو اس کی آنکھوں سے خون جاری ہو گیا۔ اس کا باپ پرساد چوپڑہ انتظامیہ کے تین ہٹے کٹے درندہ نما ملازموں کے ساتھ کھڑا تھا۔ جس کی آنکھوں سے نفرت کے انگارے نکل رہے تھے۔

''ہمیں کہتے ہو کہ ہم شرک کرتے ہیں.....اور خود کیا کر رہے.....؟ اس بوڑھے پاگل کو کیا سمجھا ہے جو اس کے ہاتھ پاؤں چوم رہے ہو.....؟'' چوپڑہ کی انگارہ برساتی زبان نے کلیم اللہ کو طیش دلا دیا لیکن اس نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا اور خاموش رہا۔

''کل شام تک ٹھیک ہو جاؤ کندن.....اس کے بعد تمہیں تیزاب کی جھیل میں پھینکوا دوں گا۔'' وہ نفرت اور غصے میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ کندن اس کا چہیتا اور لاڈلہ بیٹا ہے۔ ''تمہاری وجہ سے میری پوری دُنیا میں بہت بدنامی ہوئی ہے۔ اب میں اس قصے کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پاک کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ واپس مڑا.....اور پھر بولا۔ ''کل شام تک'' اس کی وارننگ والی انگلی لرز رہی تھی۔

''وہ شام کبھی نہیں آئے گی۔'' سید شریف حسین کے منہ سے دھیمی آواز نکلی جو صرف کلیم اللہ نے واضح طور پر سنی اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔

ان کے ہونٹ دھیرے دھیرے لرز رہے تھے اور پھر پرساد چوپڑہ چلا گیا تو ان کے ہونٹ متحرک ہو گئے وہ تیز تیز ہلنے لگے وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے ان کی ریش مبارک ہل رہی تھی۔ آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔

اُنہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر ایک پھونک اس طرح ہوا میں پھونکی جیسے وہ پھونک پرساد چوپڑہ کا پیچھا کرنے گئی ہو۔ آہستہ آہستہ ان کا چہرہ نارمل ہونے لگا۔ ان کے متحرک ہونٹ ساکت ہو گئے تو اُنہوں نے آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے کلیم اللہ کی طرف دیکھا۔

''اللہ کے دوستوں کو اذیت پہنچانے والوں سے صبر و تحمل اور دُعاؤں کے ذریعہ نپٹا جاتا ہے۔ جب بات حد سے بڑھ جائے تو پھر اللہ کی مدد کو اپنے انتقام میں شامل کر کے ان کو نیست و

نابود کر دیا جاتا ہے.....'' کلیم اللہ ان کے منہ سے سخت الفاظ سن کر پہلی بار حیران ہوا۔ اُس نے چونک کر مینٹل ہسپتال کے پرسکون ماحول کو دیکھا اُسے ہر طرف سکون اور اطمینان ہی نظر آیا۔ وہ کچھ کہنے کیلئے منہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ ''اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔'' کی صدا سے فضا پرنور اور پرسکون ہونے لگی۔ مگر اس آواز نے اُسے تڑپا کر رکھ دیا۔ وہ لرزنے لگا۔ اس نے پرخوف نظروں سے سیّد شریف حسین رضا کی جانب دیکھا تو اُنہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے خاموشی سے اذان سننے کا اشارہ کیا۔

''اَشھَدُ اَنَّ مُحَمَّدرَّسُولُ اللہ. اَشھَدُ اَنَّ مُحَمَّدرَّسُولُ اللہ'' کلیم اللہ نے واضح طور پر محسوس کیا کہ مؤذن کی آواز بھرا گئی ہے اور پھر واقعی باقی اذان میں سے آنسوؤں کی آمیزش اور عشق کے امتزاج کی حِدت آنے لگی۔ اذان ختم ہو گئی تو اس نے سید سرکار کی جانب دیکھا جو پر اشتیاق آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے اب اُن کا انداز ایسا تھا کہ وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔ ''کہو کیا کہنا چاہتے تھے؟''

کلیم اللہ ان کا اشارہ سمجھتا ہوا بولا۔ ''یہ آواز..... یہ آواز میری جانی پہچانی ہے..... یہ کون ہے شاہ جی''؟

''تم کیا سمجھتے ہو.....کلیم اللہ؟''

''خلیل احمد؟'' اس کے لبوں سے جگری یار کا نام نکلا تو ان کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔

''ہاں..... یہ میرا ہونہار شاگرد.....خلیل احمد ہی ہے.....''

''آپ کا شاگرد؟ لیکن اُس نے تو کبھی بھی آپ کا ذکر نہ کیا تھا۔'' کلیم اللہ حیرت سے بولا۔

''اُسے گردشِ دوراں نے موقع ہی نہ دیا تھا.....'' وہ دھیمے لہجے میں بولے تو کلیم اللہ پرجوش انداز میں بولا۔

''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں شاہ جی!'' اس نے اُن کے پاؤں پکڑ لیئے تو اُنہوں نے فوراً پاؤں سکیڑ لیئے۔ ''وہ میرا جگری یار تو ہے ہی لیکن مجھے راہِ حق کا مسافر بنانے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ میں اپنے محسن سے ملنا چاہتا ہوں۔ جس کی وجہ سے میں خانہ خدا اور روضہ رسولؐ کی زیارت سے فیضیابی حاصل کر سکا ہوں۔'' وہ رونے لگا تھا۔

''جاؤ مل لو.....وہ اس بیرک کے آخری کونے میں چھپ کر بیٹھا ہوا تمہیں مل جائے گا۔'' اُنہوں نے کہا تو کلیم اللہ جوشِ محبت سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے یکدم ایک بات یاد آ گئی۔ وہ اداس اور مغموم لہجے میں بولا۔

''شاہ جی...... وہ مجھے پہچان سکتا ہے؟'' کلیم اللہ کے اندر کے خوف نے الفاظ کی ترجمانی کرتے ہوئے باہر نکلنے کا موقع ضائع نہ کیا تھا وہ یہ سننا چاہتا تھا کہ خلیل احمد اب تو ابنارمل نہیں ہے۔''

''وہ بالکل ٹھیک ہے...... تم اُس سے مل لو اور...... مجھ سے بھی......'' کلیم اللہ کو ان کے آخری الفاظ سمجھ میں نہ آئے تھے وہ استفہامیہ انداز میں ان کی جانب دیکھنے لگا۔

''میں سمجھا نہیں شاہ جی!''؟ اُنہوں نے آگے بڑھ کر کلیم اللہ کو سینے سے لگا لیا۔ ''میری ڈیوٹی یہاں سے ختم سمجھو کلیم اللہ۔'' اُنہوں نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو چھپانے کی کوشش کی اور پھر گویا ہوئے۔ ''کلیم اللہ! اللہ اور اس کا رسول تمہارے ساتھ ہیں پریشان نہ ہونا...... اللہ تمہارا نگہبان ہو۔'' پھر وہ بیرک میں آگے کی جانب ایک طرف چل پڑے۔ کلیم اللہ روتی ہوئی آنکھوں سے اُنہیں جاتا ہوا دیکھ رہا تھا اور پھر پاگلوں نے وہ ہلا گُلا مچایا کہ سیّد شریف حسین رضا ان کے جھرمٹ میں کہیں کھو گئے۔ پھر کبھی نہ ملنے کیلئے۔ اُس نے بیرک کے دوسرے کونے کی جانب نگاہ دوڑائی تو اُسے دور دور تک پاگلوں کا ہجوم نظر آیا۔ اتنے بڑے ہجوم میں خلیل احمد کو ڈھونڈنے کیلئے بیرک کے اِس کونے تک جانا ضروری تھا۔ وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ اس کی سماعت میں سیّد شریف حسین رضا کی محبت بھری آواز گونجی۔

عشق دی راہ بڑی اوکھی جے ٹریئے تے یار ملا دیندا
لا کے تخت اُتوں تاجاں والیاں نوں خاک روہاں دے نال ملا دیندا
ہتھ پیر دے چُمن نہ دین لوکی' عشق کُتیاں دے پیر چُما دیندا
عشق اونچ تے نیچ ویکھ دا نئیں' ذاتاں مذہباں دے فرق مٹا دیندا

☆☆☆

نور شاہ ولی سرکارؒ کے مزار شریف کے احاطہ میں اس وقت امثل' اختر علی' فریحہ' دانیال' آمنہ' احمد' جگنو' اور ابراہیم اپنی صابر بیوی عائشہ بی بی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی اس وقت حافظ جی کا انتظار کر رہے تھے۔ امثل کو جگنو کی یہ منطق ہرگز سمجھ نہ آئی تھی کہ اس نے فریحہ کو طلاق دینے کیلئے اس بزرگ کے مزار پر کیوں بلایا ہے۔ وہ ناک بھوئیں چڑھاتی ہوئی وہاں تک آ گئی تھی۔ دانیال ان سب کا سامنا کرتا ہوا ڈر بھی رہا تھا اور اپنی دولت کے غرور پر اکڑا ہوا بھی بیٹھا تھا۔ احمد اور آمنہ کو عائشہ بی بی نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ دونوں ہی جگنو اور فریحہ کے معاملہ میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ مگر آمنہ کو احمد کے وہ الفاظ یاد تھے جو اس نے اس طرح ادا کیئے تھے کہ امثل

فریحہ کی طلاق چاہتی ہے۔ بصورت دیگر احمد آمنہ کو چھوڑ دے گا۔ اس بات کا ابراہیم اور عائشہ بی بی کو بھی معلوم تھا کیونکہ وہ امثل سے بازار میں مل چکے تھے۔ وہ بھی پُرخوف تھے کہ نجانے امثل ان کے ساتھ کیا سلوک کرنے والی ہے۔

اختر علی چور اور شرمندگی سے بھرپور نظروں سے بہن اور بہنوئی کی جانب دیکھ لیتا تھا۔ وہ ان دونوں سے آنکھیں ملانے سے گھبرا رہا تھا وہ فریحہ اور جگنو کی شادی کروا کے ان کی نظروں میں اپنی عزت بنانے کے بعد اب حلالہ کی بات چھپانے پر مجرم بنا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے تئیں ایک بار پھر اپنی ماں جیسی بہن کو دھوکا دیا تھا۔ اور ان پڑھ فلاسفر بہنوئی کی محبت کو ٹھکرایا تھا۔ وہ ممتا کا مجرم تھا۔ اس نے اپنی پیشانی پر عائشہ بی بی کے بوسوں کو محسوس کیا تو اُسے صاف لگا کہ وہ نماز پڑھنے کا نشان نہیں بلکہ اس کی ماں جیسی بہن عائشہ بی بی کے بوسوں کا واضح نشان ہے جو اس کی پیشانی پر سجدوں کا نشان بن کر چمک رہا ہے۔ ''میں اس نشان کو مٹنے نہیں دوں گا...... میں جگنو کو فریحہ سے الگ نہیں ہونے دوں گا۔'' اس نے اپنے دِل میں سوچا۔ یہ اس کے اکیلے کی سوچ نہ تھی۔ ابراہیم' عائشہ بی بی اور دوسرے تمام لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ جگنو حافظ جی اور صاحبِ مزار کی موجودگی میں فریحہ کو طلاق دے چکا ہے۔

جگنو کی شرارتیں ختم ہو گئیں تھیں۔ وہ کئی دِنوں سے کھویا کھویا ہوا تھا اور گزشتہ دو دِنوں سے وہ گھر بھی نہ گیا تھا کیونکہ حافظ جی نے اُسے روک لیا تھا۔ زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے کے ساتھ ساتھ مذہب اور عشق کی سیڑھیوں کے متعلق بھی بتایا تھا۔ حافظ جی نے اُسے نور شاہ ولی سرکار کی مرضی سے اپنی گدی دیکر اس کے کندھوں پر بہت ساری ذمہ داریاں ڈال دی تھیں۔ وہ تمام معاملات کو سمجھنے کی کوشش میں دو راتیں گزار چکا تھا اس نے بہت سے حالات اور معاملات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ سچا عاشق تھا اس نے اپنی محبت کو قربان کر کے ایک ایسا تاوان ادا کیا تھا جس پر اس کے عشق کو ناز تھا اور خود جگنو بھی سرخروئی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اب کملا اور جھلا جگنو تھا بلکہ ایک سلجھا ہوا سمجھدار اور ذمہ دار جگنو تھا جس کے کندھوں پر صاحب مزار کے بہت سارے مریدوں کی ذمہ داریاں آن پڑی تھیں۔ ان کو نبھانا اور پورا کرنا جگنو کا فرض تھا۔

وہ بالکل خاموش اور سلجھے ہوئے انداز سے ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ عائشہ بی بی اپنے بیٹے کی خوشیوں کو لگ جانے والی نظر سے اندر ہی اندر گھل رہی تھیں۔ وہ خوش تھیں کہ جگنو کو فریحہ مل گئی ہے اب وہ ذمہ داری محسوس کرتا ہوا ابراہیم کا ہاتھ بٹائے گا اور گھر کا دال پانی اچھے طریقے سے چلنے لگا گا۔ لیکن فرق تھا تو یہی کہ جگنو ذمہ دار ہو گیا تھا لیکن صرف فریحہ کی ذمہ داری نہیں بلکہ تمام مریدین

کی ذمہ داری اوران کی اللہ کے حکم سے حاجت روائی اس کا فرض بن گیا تھا۔

اتنی دیر میں حافظ جی اندر سے آتے ہوئے دِکھائی دیئے تو جگنو اُٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کی تقلید تمام لوگوں کو بھی کرنا پڑی۔ حافظ جی کے ہاتھ میں ایک فریم پکڑا ہوا جو ان کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ وہ روئے ہوئے لگ رہے تھے ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ تمام لوگوں کو نہ دیکھ سکتے تھے لیکن تمام لوگوں کی نگاہیں ان کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ حافظ جی کا انداز ایسا تھا کہ جیسے اُنہیں کسی کا انتظار ہے...... چند لمحات گزرے تو اصل بول پڑی۔

''ہمیں کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟'' سبھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ''ہماری بیٹی کا فیصلہ اس مزار میں کرانے کی کیا تُک بنتی ہے؟'' اس کی بات سن کر جگنو کا خون کھولنے لگا۔ لیکن حافظ جی چونکہ اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اُنہوں نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اُسے پرسکون ہونے کا عندیہ دیا تو وہ آہستہ آہستہ نارمل ہو گیا۔

''مجھے چند لوگوں کا انتظار ہے...... بی بی۔'' حافظ جی دھیمے لہجے میں بولے تو اصل کا پارہ اور بھی ہائی ہو گیا۔

''مجھے اُمید نہیں تھی کہ فریحہ کے فیصلہ کیسے کسی کا انتظار بھی کرنا پڑے گا۔''

''اب اگر زبان کھول کر مزار شریف کی توہین کی تو زبان کاٹ کر ہاتھ میں دے دُوں گا۔'' جگنو کا انداز اور لہجہ سُن کر اصل تو حیران ہوئی ہی تھی لیکن وہاں پر موجود تمام لوگ پریشان ہو گئے تھے۔ وہ انگشت بدنداں ہو کر جگنو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ پھر بولا۔ ''اصل بی بی! یہ تمہارا گھر نہیں ہے اور ہم لوگ تمہارے زر خرید غلام نہیں ہیں جن پر تمہارا رعب چل سکے...... اس لیئے خاموش ہو جاؤ! بس!'' اس نے ہاتھ اُٹھا کر اصل کی بولتی بند کر دی تھی۔ وہ منہ اور آنکھیں کھولے اس جاہل، گنوار اور کملے جھلے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جگنو کا رویہ اس کے ساتھ ایسا ہو گا۔ وہ اس توہین آمیز روّیے پر سیخ پا ہو گئی تھی مگر خاموش ہو گئی۔

اتنی دیر میں مسٹر وقار عظیم اور ان کی مسز بھی مزار شریف میں داخل ہوئے تو حافظ جی کے چہرے پر سکون چھا گیا۔ وہ اتنے سارے لوگوں کو اس طرح جمع دیکھ کر حیران بھی ہوئے لیکن اپنے بیٹے دانیال کو دیکھ کر اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ وہ سب ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''یہ میری ماں کی تصویر ہے۔'' حافظ جی نے اپنے سینے سے چمٹا ہوا فریم ان لوگوں کے سامنے کرتے ہوئے کہنا شروع کیا تو سبھی ان کی گفتگو کی طرف متوجہ ہو گئے اور ان کی والدہ کی

تصویر کو بھی غور سے دیکھنے لگے جس میں حافظ جی کی بہت مشابہت تھی۔ یا اس طرح کہیں کہ حافظ جی کی شکل اپنی ماں سے ملتی جلتی تھی۔

''میں نے آخری بار اپنی ماں کی تصویر کو دیکھا تھا اور میری رب کریم سے التجا ہے کہ جب میری بینائی واپس آئے تو میں سب سے پہلے اپنی ماں کی ہی صورت دیکھوں۔'' وہ سانس لینے کیلئے رُکے تو اصل بول پڑی۔

''ہمیں اس کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہمارا جو کام ہے وہ پورا کریں تاکہ ہم کچھ اور بھی کر سکیں۔'' سب نے اس کی طرف نفرت سے دیکھا مگر عائشہ بی بی کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اصل کی بات سن کر جگنو ایک بار پھر تلخ ہونا چاہتا تھا لیکن حافظ جی نے ایک بار پھر اُس کے ہاتھ دبا کر اُسے پرسکون رہنے کی تلقین کی۔

''اصل بی بی! جگنو وہ بچہ ہے جو آج تک کبھی بھی اپنی ماں کے برابر نہیں بیٹھا...... یہ تمہاری نظر میں کملا اور جھلا ہے تم نے اور تمہاری بیٹی نے اسے استعمال کیا اور اپنے مفاد کی خاطر قربانی کا بکرا بنایا...... یہ کملا جھلا تمہاری بیٹی سے عشق کرتا تھا لیکن ممتا کا عاشق بھی ہے۔ تم نے اسے اور عائشہ بی بی کو یہ دھمکی دی کہ اگر جگنو فریحہ بیٹی کو طلاق نہیں دے گا تو تم آمنہ بیٹی کو طلاق دلوا دو گی۔'' آمنہ نے ایک بار پھر آہ بھر کر احمد کی طرف دیکھا تو اس نے آمنہ کا ہاتھ محبت سے دبا کر اس کا یقین دلایا کہ وہ آمنہ کو نہیں چھوڑے گا۔

''اصل بی بی! ذرا بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔'' حافظ جی دوبارہ گویا ہوئے۔ ''اس بچے نے ساری زندگی اس مزار کی چوکھٹ پر ہی گزار دی ہے۔ اس کا ناچنا اس بات کی علامت تھی کہ یہ سرکار سے والہانہ لگاؤ رکھتا تھا مگر عشق صرف اپنی ماں کی ممتا سے کرتا تھا۔ اس کملے اور جھلے نے کبھی بھی گھر والوں کو اپنی کمائی سے کچھ نہ دیا کیونکہ وہ کچھ بھی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس نے صرف عشق کمایا ہے۔ جب تم نے اس کو دھمکی دی کہ تم اس کی بہن آمنہ کو طلاق دِلوا دو گی تو یہ روح کی گہرائی تک تڑپ اُٹھا تھا۔ یہ نادان کملا اور جھلا یہ سمجھ گیا کہ اگر اس کی وجہ سے بہن آمنہ کو طلاق ہو گئی تو ماں کی ممتا چیخ چیخ کر رو دے گی۔'' حافظ جی کی آواز بھی بھرا گئی تھی اور پھر عائشہ بی بی کے آنسو بھی تھمنے کا نام نہ لے رہے تھے اس کا کملا جھلا پتر اس کی ممتا کا دیوانہ تھا۔ اُسے خبر ہی نہ ہوئی تھی۔

''اصل بی بی! اگر یہ اپنی ضد پر اڑ جاتا تمہاری بیٹی کو طلاق نہ دیتا تو یقیناً تم اپنے بیٹے سے اس کی بہن کو طلاق دِلوا دیتی کیونکہ تم پیسے والی مغرور عورت ہو...... تمہارے بیٹے کو تو بہت سی امیر زادیوں کے رشتے آ جائیں گے...... مگر اس کی چھوٹی بہن...... وہ طلاق یافتہ کا دھبہ اپنے ماتھے پر

لگائے یقیناً زندہ نہ رہتی......اور پھر جاتی ہو......کیا ہوتا؟''

حافظ جی نے کچھ توقف کیا اور پھر بولے۔''ماں کی ممتا یقیناً تڑپ جاتی اور پھر ایک ایسی آہ نکلتی جو اس کملے اور جھلے کے عشق کو جلا کر راکھ کر دیتی......اور پھر احتل بی بی......یہ بچہ ساری زندگی اپنی ماں کے سامنے آنکھ اُٹھا کر جی نہ پاتا اور اس طرح عشق سرخرو تو نہ ہوتا بلکہ بدنام ہوتا......اتنا بدنام کہ مائیں بیٹے مانگنا چھوڑ دیتیں......اس کملے اور جھلے نے جان لیا کہ یہی وہ وقت ہے۔ جب اپنی بہن کو زندگی بھر کی خوشیاں دی جاسکتی ہیں اس کی جھولی اس کے سہاگ سے بھری جاسکتی ہے۔ بہن کے ہونٹوں کو خوشیوں بھری ہنسی دی جاسکتی ہے......اس نے وہ فیصلہ کیا کہ اگر کوئی سمجھدار اور باشعور بیٹا بھی ہوتا تو کبھی نہ کر سکتا تھا۔ اس نے جان لیا کہ بہن کو خوشیاں دے گا تو ممتا خوش ہوگی۔''

حافظ جی کی بھرائی ہوئی آواز سبھی نے محسوس کر لی تھی وہ بھی ماں کی تعریف بیان کرتے وقت انتہائی دُکھی اور رنجیدہ دِکھائی دے رہے تھے کیونکہ اُنہوں نے اپنی ماں کو مدتوں پہلے دیکھا تھا پھر ان کی کائنات ہی اندھیر ہوگئی تھی۔ ان کے اندر چھپا ہوا برسوں کا دُکھ جگنو کی داستان بن کر ان کے ہونٹوں سے بیان ہو رہا تھا۔

''اس کملے اور جھلے نے ممتا کا عاشق ہونے کا حق ادا کر دیا ہے احتل بی بی۔'' وہ اپنی قوت اور حوصلے کو مجتمع کرتے ہوئے پھر بولے۔''اس نے بہن کی ڈولی کو کہار بن کر کندھا دینے کی جو کوشش کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ اور عشق کو سرخرو کرنے کیلئے جو تاوان ادا کیا ہے وہ کہانیوں اور داستانوں میں یاد رکھا جائے گا۔ اس نے اپنے عشق کو سرخرو کرنے کے لیئے فریحہ کو طلاق دے دی ہے۔'' حافظ جی کے الفاظ ابراہیم اور عائشہ پر بجلی بن کر گرے لیکن ان کے سر فخر سے بلند ہو گئے۔ ان کے کملے اور جھلے بیٹے نے بہت بڑا معرکہ سرانجام دیا تھا۔ وہ فخریہ انداز سے جگنو کی طرف دیکھ رہے تھے جس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ رقص کر رہی تھی۔

احتل اور فریحہ کے ہونٹوں پر خوشی کی پتلی سی لکیر بن گئی۔ دانیال بھی دِل ہی دِل میں خوش ہوا تھا لیکن وقار اور ان کی مسز کو نجانے کیوں دُکھ ہوا تھا وہ قربانی کے بکرے......لیکن عظیم انسان جگنو کی طرف دُکھ اور سوگواری سے دیکھ کر رہ گئے۔

آمنہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ جو کام جگنو نے اس کا سہاگ اور گھر بچانے کیلئے کیا تھا وہ کام شائد عفی بھی نہ کر سکتا۔ اس نے تشکر آمیز نگاہوں سے بڑے بھائی کی جانب دیکھا جو اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''جگنو کو سرخروئی کی سند میرے مرشد نور شاہ ولی سرکارؒ نے عطا کر دی ہے......میرے بعد اس گدی کا وارث جگنو ہوگا۔ اور عائشہ بی بی!'' حافظ جی نے عائشہ بی بی کو مخاطب کیا تو وہ روتی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔''تمہیں ایک اور مبارک ہو......عفی کو اللہ تعالیٰ نے شہادت کے درجات سے فیض یابی بخش دی ہے۔'' اتنا سننا تھا کہ عائشہ بی بی کی آنکھیں ساون بھادوں کا بادل بن گئیں اور ابراہیم تو روتے ہوئے فوراً سجدے میں گر گیا۔ اختر علی کی آنکھیں بھی بھر آئیں مگر سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا کیونکہ عفی اس کا اپنا تھا۔ سگی بہن کا بیٹا۔ اس کا بھانجا۔ اس کا اپنا خون تھا۔ وہ احتل کے خاندان سے کئی گنا عظیم خاندان سے تعلق ہونے پر خود پر فخر کرنے لگا تھا۔

''بہت مقدروں اور نصیبوں والی ماں ہو تم۔'' حافظ جی گویا ہوئے تو عائشہ بی بی اور ابراہیم غور سے سننے لگے۔''اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ اولاد دی ہے جو ہر والدین کی خواہش اور تمنا ہوتی ہے۔ شہید کی والدہ' عاشق کی والدہ۔ صابر و شاکر بیٹی کی والدہ۔ آپ کے درجات تو بہت زیادہ ہیں۔ اور مجھے فخر ہے کہ جگنو سے میرا بھی تعلق ہے اور جگنو آپ جیسی عظیم ماں کا بیٹا ہے۔'' ایک بار پھر ان کو اپنی پھٹتی ہوئی آواز پر قابو رکھنا پڑا۔

''احتل بی بی!'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ہی بولے۔''جس پتھر کو راستے سے ہٹانے کیلئے زور سے ٹھوکر لگائیں۔ وہ راستے سے ہٹ تو جاتا ہے لیکن آپ کی جوتی یا پاؤں پر اپنا نشان ضرور چھوڑ جاتا ہے......تم نے دولت کے بل بوتے پر جگنو اور اس کے شریف والدین کو بلیک میل کیا۔ محبت اور عشق کی راہوں میں' خلوص اور چاہت کے فسانے کو اپنی دولت کے ترازو میں تولنے کیلئے جھوٹ' مکاری' دغابازی اور دھوکے کے باٹ رکھ کر تولنے کی کوشش کی ہے۔ جگنو نام کا پتھر تمہاری بیٹی کی ٹھوکر سے ایک طرف لڑھک تو گیا ہے لیکن اس پتھر نے تمہاری بیٹی کے پاؤں پر جو نشان چھوڑا ہے وہ تمہارے اور اس بیٹی کی پیشانیوں پر تاحیات پچھتاوے اور افسوس کی لکیریں بن کر نمایاں رہے گا۔'' وہ خاموش ہوئے تو احتل بولی۔

''ہم یہاں فریحہ کی طلاق کیلئے اکٹھے ہوئے تھے۔ طلاق ہوگئی اور کہانی ختم!''

''کہانی تو اب شروع ہوگی احتل بی بی! ٹھوکر کا وہ نشان یہ ہے کہ جگنو نے فریحہ کیلئے دُعا کی ہے کہ فریحہ زندگی بھر کبھی بھی ماں نہیں بن سکے گی۔'' احتل اور فریحہ کو یکدم لگا کہ وہ کسی گہری دلدل میں گر گئی ہیں اور آسمان ان کے سروں پر گر گیا ہے۔

''اور احتل بی بی! اللہ تعالیٰ اپنے دُکھی اور عاشق بندوں کی التجاؤں کو رد نہیں کیا کرتا۔''

دانیال نے کرب سے اپنے ماں باپ کی طرف دیکھا جو افسوس کے ساتھ اپنے بیٹے کو دیکھ رہے

تھے۔ مسز وقار عظیم کے چہرے پر کرب کی لکیریں نمایاں ہوگئیں تھیں۔

''اب میری ڈیوٹی ختم!...... اب اس نگری کا بادشاہ جگنو ہے۔'' حافظ جی بولے۔ ''میں حج کرنے جا رہا ہوں۔ اپنے عشق کو سرخرو کرنے۔ کائنات کی ہر چیز خواہ وہ جاندار ہے یا بے جان...... اپنا آپ منوانے کیلئے کسی نہ کسی قسم کا تاوان ضرور ادا کرتی ہے...... امثل بی بی! اس درویش اور کملے جھلے کے ساتھ جو دھوکا تم نے کیا ہے اس کا تاوان تم تمام دولت لٹا کر بھی ادا نہیں کر سکتی!'' حافظ جی اُٹھتے ہوئے بولے۔

''وقت اس جھلے کملے کا غلام ہوگا اور تم دیکھنا کہ دُنیاداری کو ٹھکرانے والے اس عاشق کی ٹھوکر میں دُنیا پڑی ہوگی۔'' وہ اندر کی طرف جانے لگے تو وقار عظیم ان سے ملتمس ہوئے۔

''ٹھہریئے حافظ جی!'' دانیال باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ ''میں اس چوکھٹ کا ادنیٰ سا غلام ہو۔ میرے والدین ان کے مرید تھے اور میں ان کو روحانی طور پر اپنا مرشد مانتا ہوں۔'' وقار عظیم کا اشارہ نور شاہ ولی سرکار کی قبر مبارک کی طرف تھا۔ ''دانیال میرا ایک ہی بیٹا ہے اور ہر باپ کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ میرے گھر میں پوتے پوتیاں کھیلیں۔ ان کی قلقاریاں' قہقہے اور شرارتوں سے میرے گھر کا آنگن مہکے!'' وہ فریحہ کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ توقف کرتے ہوئے بولے۔

''گھر کے صحن میں وہ درخت لگانا چاہیئے جو پھل بھی دے اور چھاؤں بھی...... میں مانتا ہوں کہ اس مزار کے گدی نشین جگنو کی التجا رب کریم نے رد نہیں کی ہوگی۔ کیونکہ میں کئی بار اس چوکھٹ سے اپنی التجاؤں کو جھولی میں ڈال کر خوشیوں میں تبدیل کر کے لیجا چکا ہوں...... میں فریحہ کو اپنی بہو نہیں بنا سکتا۔'' امثل اور فریحہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور آنکھیں حیرت سے مزید چوڑی ہوگئیں۔

''اگر دانیال کو میرا یہ فیصلہ قبول نہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں کو وہ فریحہ سے شادی کر لے...... مگر...... اُسے ہم دونوں میاں بیوی کو چھوڑنا ہوگا!'' دانیال نے ایک نظر سب کی طرف دیکھا اور پھر حیران و پریشان وقار عظیم اور مسز وقار عظیم کو نظر انداز کرتا ہوا فریحہ اور امثل کی جانب بڑھ گیا۔ امثل کا سر غرور سے تن گیا جبکہ اختر علی بھی اس کی بیوقوفی پر حیرت میں مبتلا تھا کہ وہ اس پیڑ کی چھاؤں تلے بیٹھنا چاہتا تھا جس کا نہ سایہ تھا اور نہ ہی کبھی پھل ملنے کی پیشین گوئی تھی۔

اس نے فریحہ کے سامنے جا کر غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور دھیرے سے بولا۔

''آئی ایم سوری فریحہ! میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں...... ان کو بڑھاپے میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ سوری...... میں تم سے شادی نہیں کر سکتا!'' دانیال یہ کہہ کر واپس جا چکا تھا۔ اس کے والدین اس کا منہ سر چوم رہے تھے۔ وہ نور شاہ والی سرکار کی قبر کو عقیدت سے بوسے دے رہے تھے

لیکن لگتا تھا کہ امثل کا دماغ خراب ہو گیا ہے وہ مغلظات بکنے لگی۔ وہ ہونقوں کی طرح کھڑی ششدر و پریشان فریحہ کو تقریباً کھینچتی ہوئی مزار شریف سے باہر لے گئی۔

اختر علی نے پرسکون ہو کر آنکھیں بند کرلیں اور اپنا سر رب تعالٰی کی بارگاہ میں جھکا دیا اور آمنہ نے آگے بڑھ کر جگنو کے ہاتھ چومنے شروع کر دیئے۔ اس نے آگے بڑھ کر عائشہ بی بی کو سینے سے لگایا اور بولا۔

''اماں! مجھے معاف کر دینا...... میں تمہاری خدمت نہیں کر سکا!...... میں نکما اور جھلا ہی رہا...... بس...... مجھے معاف کر دو!'' اس نے عائشہ بی بی کے پاؤں میں اپنا سر رکھ دیا تو وہ تڑپ گئیں۔ ابراہیم نے اُسے اُٹھا کر گلے سے لگایا۔

''تم نے تو ہمارا مان رکھا ہے جگنو!'' ابراہیم بولا۔ ''رب کریم ہر کسی کو تم جیسا بیٹا اور ہر بہن کو بھائی عطا کرے۔ تم نے میری بیٹی کا گھر بچا لیا ہے...... ہم تم سے بہت خوش ہیں جگنو!'' احمد نے بھی روتے ہوئے آگے بڑھ کر جگنو کو سینے سے لگا اور بولا۔ ''میں آمنہ سے علیحدگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تم مجھے تو پوچھتے۔'' وہ ہنستا ہوا بولا۔

''پھر میرا عشق سُرخرو نہ ہوتا بلکہ رُسوا ہو جاتا!'' اس کی دانائی سے بھرپور بات پر سبھی نے سر ہلا دیئے۔

☆☆☆

خلیل احمد نے غور سے کلیم اللہ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں لیکن وہ آگے بڑھا اور اس نے خلیل احمد کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ ''مجھے پہچانو خلیل احمد۔'' وہ اُسے جھنجوڑنے لگا تو دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔ ''میں تمہارا یار ہوں۔ تمہارا جگری دوست ہوں خلیل احمد مجھے پہچانو...... مجھے کندن سے کلیم اللہ بنا کر خود کہاں کھو گئے تھے۔'' وہ اُسے کبھی سینے سے لگاتا اور کبھی اُسے اپنے سامنے کر کے دیکھنے لگتا۔ اس کی تقلید میں وہاں موجود تمام پاگل بھی ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگے۔ ''خلیل احمد! میں جانتا ہوں کہ تم مجھے پہچان سکتے ہو...... تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کون ہوں...... انجان مت بنو...... مجھے مذہب کی طرف راغب کر کے اپنا ہوش مت گنواؤ...... مجھے ابھی تمہاری بہت ضرورت ہے...... میں...... میں اکیلا ہو گیا ہوں۔ مجھے آواز دو...... مجھے میرے نام سے پکارو......'' وہ اس کے گلے لگ کر رونے لگا تو خلیل احمد کے جسم میں ارتعاش پیدا ہوا۔ اس کی آنکھوں کی برسات نے پیہم عمل شروع کر دیا تھا۔ آنسوؤں کی قطاریں کلیم اللہ کے کندھے کو بھگونے لگیں تو اس کی ہلکی سی آواز اُبھری۔

''تم کون ہو؟'' کلیم اللہ اس کی طرف حیرانگی سے دیکھنے لگا وہ حیرت واستعجاب میں مبتلا تھا مگر فرطِ جذبات سے بولا۔ ''میرے ساتھ غیریت مت برتو خلیل احمد میں مر جاؤں گا...... تم بے ہوش نہیں ہو۔ تم دِل وخرد سے باہوش ہو۔ جو شخص بالکل ٹھیک تلفظ میں اذان پڑھے اور مکمل اذان...... پھر محمد رسول اللہؐ کے متبرک ومقدس الفاظ پر اس کی آواز بھی بھرا جائے وہ...... وہ دیوانہ اور پاگل نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک باہوش اور عاشق ہونے کی دلیل ہے۔'' وہ اُسے جھنجوڑنے لگا تو خلیل احمد کی ہچکیاں اور سسکیاں بلند ہونے لگیں۔ وہ اونچی اونچی آواز میں رونے لگا۔

''مجھے میرے حال پر چھوڑ دو کلیم اللہ۔'' خلیل احمد کی آواز میں جو درد اور کرب تھا وہ سن کر کلیم اللہ لرز گیا۔ مگر اس بات کی خوشی بھی انتہائی تھی کہ اُس نے کلیم اللہ کو اس کا نام لے کر پکارا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ دیوانہ یا پاگل نہیں ہے بلکہ گردشِ ایام کی تلخیوں کا شکار ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو اس بات کی غمازی کرتے تھے کہ اس نے دِل وجان کی گہرائی سے کلیم اللہ کو پہچان لیا ہے۔ کلیم اللہ اس کی طرف دیکھنے لگا تو وہ بولا۔

''اس پاگل خانے کے باہر کی دُنیا بہت ظالم اور بھیانک ہے۔ اس کے روپ میں تیز دھار اور نوکیلے ظلم وستم چھپے ہوئے ہیں...... کلیم اللہ! میرے یار...... میرا اس پاگل خانے سے باہر کوئی نہیں ہے...... میں کس کو اپنی ماں کہہ کر آواز دُوں گا۔'' اس کی آواز ایک بار پھر نم ہوگئی تو کلیم اللہ نے اس کا کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُسے تسلی دی۔

''مجھے کون خلیل احمد کہہ کر پکارے گا جس کے بدلے میں...... میں آپا امی جی کہہ کر دوڑ پڑوں گا۔'' وہ ایک بار پھر سسکیاں لینے لگا تو کلیم اللہ کی آنکھیں بھی برسنے لگیں۔ اُسے پروفیسر فائز احمد نے بتایا تھا کہ ٹرین حادثے میں خلیل احمد کا پورا کنبہ ہی زندہ جل گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوگئی تھی۔ وہ سڑکوں پر دیوانہ وار اپنی امی اور ابو کو پکارتا ہوا اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ وہ اس پاگل خانے میں نجانے کب سے تھا لیکن پروفیسر فائز احمد کا کیا ہوا یہ فقرہ بھی سچ ثابت ہوگیا تھا کہ خلیل احمد سے تمہاری ملاقات ہوتی رہے گی۔

''میں بہن کی چٹیا کھینچ کر اُسے کیسے ستاؤں گا...... ابو سے تھوڑے پیسوں کیلئے جھگڑا......'' اس کے لرزتے ہونٹ اُسے بات مکمل کرنے کی اجازت نہ دے رہے تھے۔ وہ ایک لمبی سانس کھینچتا ہوا اپنے جذبات پر قابو پاتا ہوا بولا۔

''کلیم اللہ! مجھے بے ہوش اور پاگل ہی رہنے دو...... میرے زخموں کو مت جگاؤ یار...... میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں گا تو...... مجھ سے میرا یہ سرمایہ بھی چھن جائیگا...... ان کی یادیں اور باتیں......

میں ہوش میں ہوں تو اُن کو یاد کر لیتا ہوں پھر......'' وہ بے رحم آنسوؤں کو روک نہ سکا۔ گلے میں غبار کا گولہ بن کر پھنس گیا تھا جس نے ماتم کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کلیم اللہ نے اُسے گلے سے لگا کر رونے دیا وہ مدتوں بعد دِل کھول کر رویا تھا اور آنکھیں بھی اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے غمخوار تھے۔

''ہم بے سہارا نہیں ہیں خلیل احمد!'' کلیم اللہ نے اُسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا تو وہ اس کی طرف استفہامیہ انداز سے دیکھنے لگا۔ ''اللہ رب العزت کی ذاتِ مقدس اور آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غمخوار شخصیت کائنات کے والی کی رحمتوں والی مقدس ومعطر ہستی ہمارا سہارا ہیں...... حوصلہ کرو خلیل احمد!'' خلیل احمد اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا کیونکہ وہ جب سے کلیم اللہ کو اسلام کی راہوں پر چلا کر چھوڑ گیا تھا یا ہوش وخرد سے بیگانہ ہوا تھا اس کی ملاقات آج ایک نومسلم کندن سے نہیں بلکہ اسلام اور ربِّ کائنات پر مکمل یقین اور پیغمبر آخر الزمانؐ پر دل وجان سے اعتقاد رکھنے والے کلیم اللہ سے ہو رہی تھی۔

وہ خوشی اور حیرت کی ملی جُلی کیفیت میں مبتلا کلیم اللہ کو دیکھے جا رہا تھا جو کہہ رہا تھا۔

''خلیل احمد! تم نے اللہ کی راہوں پر ڈال کر مجھ پر احسانِ عظیم کیا ہے...... میں اس احسان کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا ہوں...... دُنیا کی تمام دولت اور وسائل اب مجھے خدا کی راہوں سے ہٹا نہیں سکتے۔ کیونکہ میں نے جان لیا ہے کہ اس کائنات کو چلانے والا صرف اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہیں۔''

''میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے کلیم اللہ۔'' خلیل احمد رب اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکا تھا وہ اس سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے تمہیں جس راستے پر چلانا چاہا تم نے اس راستے کو اچھی طرح پار کر لیا ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے۔'' ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک لمبی اور گھنی مونچھوں والا پہلوان نما منتظم کلیم اللہ کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا بیرک سے باہر لے گیا۔

''ابے ہم کیا تیرے باپ کے نوکر ہیں جو اس صحن کی صفائی خود کریں......'' اس نے ایک بڑا جھاڑو کلیم اللہ کو پکڑا دیا اور تلخ لہجہ میں بولا۔ ''چلو پندرہ منٹ میں اس پورے صحن کی صفائی کر دو...... ورنہ مار مار کر کھال ادھیڑ دُوں گا۔'' کلیم اللہ نے دیکھا کہ اس مینٹل ہسپتال کا صحن کم وبیش دس کینال پر محیط ہوگا۔ اس نے دور بیرکوں میں پاگلوں کے ہجوم میں سے خلیل احمد کو دیکھا جو لوہے کی موٹی اور مضبوط سلاخوں کو پکڑ کر آنکھوں میں آنسو لیئے ہوئے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ کلیم اللہ جھاڑو پکڑ کر پھیرنا شروع کرنے ہی والا تھا کہ ''ٹھہرو'' کی آواز سن کر رُک گیا۔

ایک اور ہٹا کٹا منتظم اس کی طرف بڑھ رہا تھا جسے دیکھ کر پہلا منتظم الرٹ ہو گیا گویا کہ دوسرا کوئی اعلیٰ آفیسر تھا۔ وہ ان دونوں کے پاس پہنچا اور اشارے سے پہلے کو جانے کا کہا اور خود کلیم اللہ کے قریب کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"تم پر سادو چوپڑو کے بیٹے ہو۔ اور میرے ان سے اچھے تعلقات ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم یہ بلدیہ کے کام کرو۔ مثلاً...... گندگی جھاڑو وغیرہ......"

"تو پھر...... مجھے کیا کرنا ہوگا؟" کلیم اللہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"اسلام چھوڑ کر اپنے پُرسکون محل میں واپس چلے جاؤ۔"

"اگر انکار کر دوں تو......؟"

"تو پھر ساری زندگی اسی پاگل خانہ میں خاکروب بن کر گزارنی پڑے گی...... اچھی طرح سوچ لو...... پرسکون اور پُرتعیش زندگی یا پھر ہر قسم کی گرمی سردی اور پاگلوں کی گندگی اُٹھانے کا کام؟" وہ یہ کہہ کر مڑا اور چند قدم ہی چلا تھا کہ اُسے اپنی پشت پر جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو کلیم اللہ فرش پر جھاڑو پھیر رہا تھا۔ اس منتظم نے "کتے کی دُم" کہہ کر نفرت سے منہ پھیر لیا اور آگے بڑھ گیا۔

لیکن کلیم اللہ کی تقدیر اور قسمت جاگ گئی اُس نے جھاڑو تو مینٹل ہسپتال کے صحن میں پھیرنا شروع کیا تھا لیکن اس کی نظروں نے دیکھا کہ وہ بہت کشادہ سنگ مرمر کا بنا ہوا حسین فرش ہے۔ جس پر نگاہیں ٹھہر نہیں سکتیں۔ وہ حیرت اور استعجاب کے عالم میں اس فرش پر جھاڑو پھیرنے لگا۔ اُسے لگا کہ یہ فرش اور یہ جگہ اس نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہوئی ہے۔ اس کے ذہن میں کیمرے کے فلیش کی طرح جھماکے ہونے لگے تھے۔ یکدم اس کے ذہن کے پردے پر ایک نقش اُبھرا تو اس نے جھاڑو دور پھینک کر اپنے آپ کو وہیں گرا لیا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے سجدہ کر رہا ہو۔

خلیل احمد اس کو اس طرح حرکتیں کرتا دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اُسے یکدم لگا کہ کلیم اللہ سچ مچ پاگل ہو گیا ہے۔ کیونکہ آپ وہ زبان اور آنکھوں سے اس جگہ کو چوم رہا تھا۔ اس نے اپنا منہ اس جگہ پر رگڑنا شروع کر دیا۔ آنسوؤں نے فرش کی اس جگہ کی دھونا شروع کر دیا تھا۔ بے اختیار اس کے ہونٹ متحرک ہوئے اور وہ اونچی آواز میں پڑھنے لگا۔

"اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ"

"میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔" اس کی آواز میں خلیل احمد نے بھی بلند آواز سے آواز ملائی تو پھر ہر طرف سے اسی کلمہ کی صدائیں بلند ہونے لگی تھیں۔ تمام پاگل بلند

آواز سے "اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ" کا ورد کرنے لگے تھے۔ اس جگہ کی ہر ایک اینٹ پڑھ رہی تھی تمام افراد کی آواز کی اتنی گونج تھی کہ پاگل خانہ کی ہر ایک چیز خوف، دہشت اور صدمے سے کانپنے لگی یا پھر عقیدت اور محبت سے اس کلمے کو اپنی بساط کے مطابق ادا کرنے لگی۔ تمام انتظامیہ پر خوف طاری ہو گیا تھا۔

یہ دوسرا واقعہ تھا کہ اس ہسپتال میں پاگلوں کا کسی ایک نقطہ پر اتفاق ہوا تھا۔ بزدل اور ڈرپوک ہندو انچارج تو اپنی پینٹ درست کرتا ہوا فوراً وہاں سے نکل گیا۔ جبکہ باقی عملہ کی خوف اور دہشت سے آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ کیفیت تقریباً پندرہ منٹ تک رہی۔ خلیل احمد کلیم اللہ کی حالت پر حیران ہو رہا تھا وہ سجدہ کی حالت میں زمین پر پڑا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہاں پر آنسوؤں کا حوض بن گیا ہے۔ کلیم اللہ کا ہولے ہولے کانپنا اور ہچکولے کھاتا ہوا بدن اس کی زندگی کی نشان دہی کر رہا تھا۔ انتظامیہ کے کسی بھی فرد میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اُسے جا کر اُٹھاتا یا پھر اس کو ڈانٹتا۔ سبھی اپنی اپنی جگہ پر سہمے کھڑے تھے۔

کلمہ شہادت کی گونج آہستہ آہستہ مدہم ہوتی ہوئی ختم ہوئی تو فضا اور ہوا دُھلی ہوئی لگ رہی تھی ہر ایک چیز پر نور کی ردا تنی ہوئی لگ رہی تھی۔ کلیم اللہ خود ہی اُٹھا اور جھاڑو کو اپنے ہاتھوں میں لیتا ہوا اپنے بیرک کی جانب چل پڑا۔ لوہے کے گیٹ پر مضبوط تالا لگا ہوا تھا اس نے پاس کھڑے حیران و پریشان چوکیدار کو تالا کھولنے کا کہا تو وہ چونک کر آگے بڑھا اور تالہ کھول کر کلیم اللہ کے اندر داخل ہونے کے بعد دوبارہ تالہ لگا دیا۔ خلیل احمد کے علاوہ تمام پاگل اپنی اپنی مستی میں مگن ایک دوسرے کے ساتھ خیالی کھیلوں میں مگن تھے۔

"کیا ہوا تھا کلیم اللہ؟" خلیل احمد نے لرزتے کانپتے کلیم اللہ کو اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے پوچھا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا گرتا اور سنبھلتا زمین پر بیٹھ گیا اس کی آنکھوں سے برسات جاری ہو گئی تھی۔ اس مرتبہ خلیل احمد نے اُسے دِل کھول کر رونے دیا۔ چند لمحات یونہی گزر گئے تو کلیم اللہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"خلیل احمد! مجھے ان راہوں پر چلا کر تم نے میری زندگی بدل دی ہے۔" اس نے اُس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے بوسہ دینے کی کوشش کی تو خلیل احمد نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور بولا۔

"مجھے گناہگار مت کرو کلیم اللہ...... میں تو کچھ بھی نہیں ہوں...... تمہارا دِل اللہ کی طرف اور ذہن اسلام کی طرف اگر راغب و متوجہ ہوا ہے تو اس میں تمہارے ارادوں کو اور اعتقاد کو دخل ہے۔"

میں نے تو تمہیں صرف ایک راستہ دیا ہے۔ تم نے اپنی محبت اور عشق سے منزل پالی ہے یا پانے کی تگ و دو کر رہے ہو تو اس میں اللہ کی رضا شامل ہے۔ بس مجھے بتاؤ کہ جھاڑو پھیرتے ہی تم سجدہ میں کیوں گر گئے تھے؟"

"یونہی میں نے ہندو مذہب کو اپنانے اور اسلام کو چھوڑنے کا انکار کر کے جھاڑو زمین پر پھیرنا شروع کیا تو مجھے یکدم احساس ہوا کہ یہ وہ فرش اور صحن نہیں ہے میں جہاں کھڑا تھا اس صحن کو میں خواب میں دیکھ چکا تھا۔ میں غور کرنے کیلئے جھکا تو مجھ پر اس پرنور فرش کا عقدہ کھل گیا...... وہ مسجد نبوی کا فرش مبارک تھا۔" بھرائی ہوئی آواز میں اس نے الفاظ ادا کیے تو خلیل احمد نے اس کے ہاتھ سے وہ جھاڑو پکڑ کر سینے سے لگالیا اور رونا شروع کر دیا۔

"تم نے اپنی منزل پالی ہے کلیم اللہ! تم نے اپنے عشق کو سرخرو کرنے کیلئے جو تاوان ادا کرنے کا سوچا ہے اس کا صلہ تمہیں یہ مل گیا ہے کہ تم نے خاکروب بننے کو ترجیح دی اور اُدھر رحمتِ خداوندی جوش میں آئی اور تمہیں رب العزت نے اپنے پیارے محبوبؐ کے در کی چوکھٹ کی زیارت کروادی۔" وہ روتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "تم بہت عظیم ہو کلیم اللہ! بہت عظیم!" کلیم اللہ آنسو صاف کرتا ہوا بولا۔

"میں ساری زندگی اسی ہسپتال میں خاکروب بن کر ہی گزارنا چاہتا ہوں...... کیا میری یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ اس بابرکت ذات نے تمہارے لیئے اور بھی بڑا انعام رکھا ہے؟" خلیل احمد نے کہا تو وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ "میں ربِ ذوالجلال کی ہر نعمت کا دِل سے مشکور ہوں مگر...... میں جان گیا ہوں کہ جس شخص کو روضۂ رسولؐ کی زیارت ہوگئی اس کے لئے دُنیا کی ہر چیز ہیچ ہے۔"

"تم یہاں تک پہنچے ہو کلیم اللہ! میری حالت کا تو تمہیں بخوبی علم ہے۔" کلیم اللہ نے اپنے جگری یار کی طرف محبت سے دیکھا اور دِل میں کہا۔ "تمہاری محبت کی وجہ سے اور عشق مصطفیٰ ﷺ کی دولت کی بدولت۔"

لیکن وہ یہ فقرہ خلیل احمد سے نہ کہہ پایا۔ اُس نے خلیل احمد سے اسلامی کتب لے کر ان کا مطالعہ کرنے کے بعد اور پھر ٹرین میں جو ہولناک آتشزدگی ہوئی تھی اس کے بعد پورے ملک میں جو ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے تھے وہاں سے اپنی داستانِ عشق شروع کی اور آنسوؤں کی زبانی بیان کرنے لگا اور خلیل احمد نے دِل پر ہاتھ رکھا اور محبت سے اس کی تاوان بھری داستان کو سننے لگا کیونکہ اس کہانی اور تاوان عشق کی داستان میں ایک بڑا کردار اس کا بھی تھا۔

☆☆☆

پرساد چوپڑہ نے جب سے پاگل خانے میں سیّد شریف حسین رضا کو بُرا بھلا کہا تھا اور کلیم اللہ کی پشت پر ظلم و ستم کرنے کیلئے ڈنڈے برسائے تھے اس کی صحت دن بدن گرتی جارہی تھی۔ اُسے پورے محل میں کہیں بھی چین و سکون نہ مل پا رہا تھا۔ اس نے بات بات پر گھر والوں سے جھگڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ موہن کو بھی گالیاں دینے لگتا وہ پرساد چوپڑہ کی بگڑتی ہوئی طبیعت اور حالات پر پریشان ہو جاتا اور خاموشی سے سنتا رہتا۔ گھر والے بھی اس کی اس عادت سے عاجز آ گئے تھے۔ یہ سیّد شریف حسین رضا کی اس پھونک کا کمال تھا جو اُنہوں نے پرساد چوپڑہ کی پشت پر اپنے پورے جاہ و جلال میں پھونکی تھی۔

اُس نے تمام کاروباری سلسلہ منقطع کر دیا تھا کیونکہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ ہوتا تھا غیر ملکی کمپنیوں نے اس کی کمپنی کے حصص خریدنا ترک کر دیئے تھے۔ وہ دِن بدن نقصان میں جانے لگا تو موہن چند نے کاروبار سنبھال لیا اور دوبارہ سٹینڈ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پھر ایک دِن مہارانی چوپڑہ کیلئے کھانا لے کر اس کے کمرے میں گئی تو وہ کتنی ہی دیر کھانے کو دیکھتا رہا اور بولا۔

"میں نے تم سے تمہارا بیٹا چھین لیا ہے نا۔" مہارانی حیرت و پریشانی میں اس پتھر کو لگتی ہوئی جونک محسوس کرنے لگی۔ وہ پھر بولا۔ "مہارانی...... مجھے لگتا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گا...... میرے ساتھ چند دِنوں سے تقدیر ایک کھیل کھیل رہی ہے۔ میرے کانوں میں ہر وقت مسلمانوں کے کلمہ کی آواز گونجتی رہتی ہے......" وہ خاموش ہو گیا تو مہارانی کو اس کے اعتراف پر مزید حیرانگی ہوئی۔ وہ کچھ نہ بولی اُٹھ کر جانے لگی تو پرساد چوپڑہ پھر بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ میں کندن سے ہار گیا ہوں۔" مہارانی نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ سیّد شریف حسین رضا کی وجد اور جوشِ جذبات میں ماری گئی پھونک اپنا اثر دِکھا رہی تھی۔ پرساد چوپڑہ نے کھانا ایک طرف رکھا اور ننگے پاؤں باہر لان کی جانب بھاگ نکلا۔

گھر والے اس کی اس حرکت پر ایک دوسرے سے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے آنکھیں چُرا رہے تھے۔ چوپڑہ بھاگتا ہوا لان میں رکھی گئی۔ گنپتی بھگوان کی پتھر سے تراشی ہوئی مورتی کے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے اپنے ذہن کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی مگر ہر حربہ اور تمام کوششیں بے سود اور رائیگاں گئیں۔ اس نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں اور بھگوان سے مخاطب ہوا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے کسی انسان سے جھگڑا کر رہا ہو۔

"کیوں مجھے پاگل بنا رہے ہو...... یہ کیا گورکھ دھندہ شروع کر رکھا ہے۔ عیسائی تجھے گاڈ

ہندو تجھے بھگوان اور مسلمان اللہ کہتے ہیں...... آج بتا تو سہی تُو کون ہے؟...... میں پوچھتا ہوں کہ کون ہو تم؟......" وہ چیختے ہوئے بولا تو گھر کے تمام افراد بھی لان میں نکل آئے وہ دور کھڑے اس کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ اونچی اونچی آواز میں بول رہا تھا۔

"میں سمجھ گیا تم گاڈ ہو...... بغیر باپ کے عیسیٰ علیہ السلام کو اس کی ماں کے بطن میں تولّد کر سکتے ہو...... پھر...... عیسیٰ کا باپ کون ہے...... تم؟...... نہیں نہیں...... تم ہرگز نہیں ہو سکتے...... کیونکہ تم گاڈ نہیں بھگوان ہو...... اور بھگوان تو مٹی کی مورت ہوتا ہے۔ ایک بے جان اور بے حرکت مجسمے کی مانند۔ بلکہ مجسمہ ہوتا ہے۔ وہ کسی عورت کا خاوند اور کسی بچے کا باپ نہیں ہو سکتا...... وہ تو اپنی جگہ سے حرکت ہی نہیں کر سکتا...... تجھے تو ہم اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں...... تو ہمیں کیا فائدہ اور کیا نقصان دے سکتا ہے...... نہیں نہیں...... تم بھگوان بھی نہیں ہو۔" وہ کنہیا کی بے جان مورتی سے باتیں کیا کر رہا تھا جھگڑا کر رہا تھا۔ دور کھڑے تمام افراد اس پرساد چوپڑہ کا تماشہ دیکھ رہے تھے جس نے کبھی اپنے مسلمان بیٹے کلیم اللہ کو تماشہ بنا کر اُسے پتھر مروانے کی کوشش کی تھی آج وہ اس شرابی کی مانند لڑکھڑا رہا تھا جسے پیمانے میں چھوڑی گئی چند قطرے شراب نہ ملی تو وہ مر جائیگا...... وہ لڑکھڑا کر گرا تو موہن نے آگے بڑھنا چاہا تو مہارانی نے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ اپنی جگہ پر رک گیا۔ پرساد چوپڑہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور پھر کنہیا کی مورتی سے اپنے انداز میں مخاطب ہوا۔ "میں سمجھ گیا...... میں سمجھ گیا کہ تو گاڈ بھی نہیں ہے۔ بھگوان بھی نہیں ہے۔ تو صرف اللہ ہے...... اللہ" وہ اونچی آواز میں اس طرح بولا جیسے کہ کسی انسان کو اس کے نام سے پکارا جاتا ہے اس کے منہ سے اللہ کا نام سن کر سب کی حیرانگی دوچند ہو گئی۔ "گاڈ ہوتا تو عیسیٰ کا باپ ہوتا۔ بھگوان ہوتا تو تیرا بھی مجسمہ ہوتا...... تو دِکھائی بھی نہیں دیتا اور ہر طرف بھی ہے۔ وحدہ لاشریک ہے۔ نہ کسی کا باپ نہ کسی کا بیٹا...... تو اللہ ہی ہے...... کندن...... نہیں...... کلیم اللہ ٹھیک کہتا ہے کہ جب میں اس راز کو پا لوں گا کہ اللہ ہی سب کچھ ہے۔ وہ خالق کائنات ہے۔ رازق کائنات ہے۔ جبار و قہار ہے۔ رحمٰن و رحیم ہے...... رحمٰن و رحیم...... ہاں...... اب میں سمجھ گیا کہ تجھے مسلمان آسانی سے کیسے منا لیتے ہیں...... تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا تو پھر اپنے نام کی لاج بھی ضرور رکھتا ہے۔ رحمٰن و رحیم اللہ...... رحمٰن و رحیم اللہ...... رحمٰن و رحیم......" وہ اپنی بات مکمل نہ کر پایا تھا کہ اس کا بایاں بازو تیزی سے کانپنے لگا۔ اس کا چہرہ ایک طرف کو مڑنے لگا۔ اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں وہ لرزتا ہوا تیورا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

اس بار موہن نے مہارانی کی اجازت کا انتظار نہ کیا اور بھاگتا ہوا چیخ چیخ کر ایمبولینس

منگوانے کا کہنے لگا۔ اس نے چوپڑہ کے پاس پہنچ کر اس کا سر پکڑ کر اپنی گود میں رکھا تو دیکھا کہ چوپڑہ کا منہ ایک طرف کو ٹیڑھا ہو گیا تھا اور منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ موہن حقیقت میں اپنے باپ کی عبرتناک حالت دیکھ کر کانپ گیا تھا۔

☆☆☆

شہر کے بہترین ہسپتال میں چوپڑہ کا علاج شروع ہو گیا تھا۔ مگر بہتر سے بہتر اور قابل سے بھی قابل ڈاکٹرز کی رپورٹس تسلی بخش نہ تھیں۔ چوپڑہ کی بولتی بند ہو گئی تھی وہ دیوانوں اور بونقوں کی طرح ہر ایک کے چہرے کو تکتا رہتا تھا۔ کیونکہ اُسے بائیں طرف فالج کے شدید حملے نے ڈاکٹرز اور دوائیوں کا محتاج کر دیا تھا۔ اُس پر جب فالج کا انکشاف ہوا تو وہ تڑپ تڑپ کر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا مگر ایک ٹانگ تو معذور ہو چکی تھی نتیجۃً وہ دو تین بار بیڈ سے نیچے گر پڑا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر چہرے پر اپنی لکیریں بنا چکے تھے۔

مہارانی نے دِن رات خدمت کر کے شوہر پرست بیوی ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ کنگنا باپ کی حالت پر دِل ہی دِل میں کڑھتی رہتی تھی۔ کاجل کو بُری طرح کندن یاد آ رہا تھا۔ گھر کے کسی بھی فرد کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ یہ بات صرف پرساد چوپڑہ ہی جانتا تھا کہ وہ شہر میں کہاں ہے اور کس حالت میں ہے۔ ڈاکٹرز اور مہنگی ادویات نے اپنا کام دِکھایا تو وہ پندرہ بیس دِنوں بعد ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادا کرنے کے قابل ہو گیا۔

اُسے گھر شفٹ کر دیا گیا تھا وہ اپنے بیڈروم میں وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا کھڑکی سے باہر لان میں رکھی گئی پتھر کی مورتی کو گھورتا رہتا تھا۔ مہارانی اُسے کھانا کھلاتی اور چائے وغیرہ دے جاتی تھی وہ چائے اپنے دائیں ہاتھ سے پیتا تھا کیونکہ وہ ہاتھ اور ایک حصہ صحیح سلامت تھا صرف بایاں حصہ شدید متاثر ہوا تھا ڈاکٹرز نے بیرون ملک کے ڈاکٹرز سے رابطہ کیا تھا چوپڑہ کی رپورٹس بھجوادی گئی تھیں اب کچھ نہ کچھ جواب ملنے پر اس کا علاج بیرون ملک ہونا تھا۔

"رانی!" اس نے مہارانی کے لفظ کو شارٹ کر لیا تھا۔ "میں...... کلیم...... اللہ سے...... مِل...... چاہتا......" مہارانی اس کے منہ سے کندن کا پورا نام اور اس سے ملنے کی خواہش کا سن کر حیران اور خوش ہو گئی۔

"مگر ہم نہیں جانتے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟" مہارانی کی خوشی اس فقرے کے سوگوار الفاظ میں دفن ہوتی ہوئی چوپڑہ نے بھی محسوس کر لی تھی۔ اُس نے اشارے سے کاغذ اور پنسل منگوائی اور کاغذ پر مینٹل ہسپتال کا نام لکھ کر موہن کے حوالے کیا اور تاکید کی کہ وہ کلیم اللہ کو گھر

لے کر آئے۔ موہن حیرت واستعجاب کے عالم میں مینٹل ہسپتال کا نام پتہ پڑھ کر ششدر رہ گیا۔ اس نے باپ کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں اس نے زندگی میں پہلی بار آنسو دیکھے تھے۔ موہن چند کو یوں لگا کہ وہ آنسو ندامت اور پچھتاوے کے ہیں۔ وہ ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کلیم اللہ نے اپنی داستان خلیل احمد کو سنائی تو وہ بہت متاثر ہوا اور ایمان کی سلامتی کیلئے دن رات دُعائیں کرنے لگا تھا۔ آج اُسے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا تھا کہ وہ ہر روز اس نظارے کیلئے پاگل خانے کے صحن میں جھاڑو دیتا تھا مگر وہ منظر اُسے دوبارہ نصیب نہ ہو سکا تھا۔ اس نے جھاڑو کو اپنے تیسرے ساتھی کا درجہ دے دیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جھاڑو کا نمبر پہلا اور خلیل احمد کا دوسرا تھا۔ کیونکہ اس جھاڑو کی وجہ سے ہی اُسے مسجد نبویؐ کے بابرکت صحن کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔

خلیل احمد اذان دینے کے بعد کلیم اللہ سے باتیں کر رہا تھا کہ اس کی نگاہ موہن چند پر پڑی اس نے کلیم اللہ کی توجہ اس جانب مبذول کروائی جدھر سے موہن چند دو منتظمین کے ساتھ آ رہا تھا۔

''کیا چوپڑہ صاحب! یاترہ کیلئے گئے ہیں جو اس کو بھیج دیا ہے؟'' کلیم اللہ خلیل احمد کی بات سن کر ہنسنے لگا۔ اس نے مدت بعد اپنے بھائی کو دیکھا تھا جس کی پیشانی پر پریشانی اور چہرے پر فکر مندی اور اداسی کی لکیریں نمایاں تھیں۔ وہ چلتا ہوا اس بیرک کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ گیٹ کا تالا کھولا گیا تو اس نے اندر جا کر کلیم اللہ کو سینے سے لگایا اور بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگا۔ خلیل احمد تو اس کی اداکاری پر حیران تھا۔ اور کلیم اللہ نئے تاوان کیلئے ذہنی طور پر تیار ہو گیا تھا۔

''کندن! بابو جی بیمار ہیں...... تمہیں بُری طرح یاد کر رہے ہیں۔'' موہن چند اس سے الگ ہوتا ہوا بولا تو کلیم اللہ کے لبوں پر طنزیہ مسکان پھیل گئی۔

''کیوں ظلم کے ترکش سے غرور اور تکبر کے تیر ختم ہو گئے ہیں؟''۔

''ہم سب تمہارے مجرم ہیں...... میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تم پر زبردستی کروں...... اور ہم نے یہ بھی تو کر کے دیکھ لیا ہے۔ آخر ظلم ہی ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔'' موہن چند کی آنکھیں پھر برسنے لگیں تو خلیل احمد اور کلیم اللہ کو لگا کہ اس کی بات سُن لینی چاہیئے۔

''ایک شہنشاہ کو خاکروب کی ضرورت کیوں پڑ گئی موہن صاحب؟'' اس بار خلیل احمد بولا تو موہن اس کی طرف پہلی بار متوجہ ہوا تو اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک اُبھری تو وہ بے اختیار

بولا۔ ''خلیل احمد!...... تم کندن کے کلاس فیلو...... خلیل احمد ہی ہو نا۔''؟

''ہاں موہن صاحب! میں بدنصیب قسمت کا مارا خلیل احمد ہی ہوں......''

''مگر یہاں کیا کر رہے...... تم تو اچھے بھلے ہو۔'' موہن نے سوال کیا تو اس بار جواب کلیم اللہ نے دیا۔

''میں یہاں کیا کر رہا ہوں...... کیا میں اچھا بھلا نہیں ہوں؟'' موہن چند کو اپنے سوال پر شرمندگی ہوئی تو اس نے مختصراً وہ تفاصیل بتانا شروع کر دیں جو چوپڑہ کے ساتھ واقعات رونما ہو کر اس کی بیماری کی وجہ بنے تھے۔

جوں جوں کلیم اللہ سنتا جاتا تھا اس کا اعتقاد ربِ واحد کی ذات پر پختہ ہوتا جاتا تھا۔ اُسے سید شریف حسین رضا بہت یاد آئے جنہوں نے کہا تھا کہ وہ یہاں اپنی ڈیوٹی دینے آئے ہیں۔ اُنہوں نے فضا میں جو پھونک ماری تھی وہ اس وقت ان کی ڈیوٹی کا حصہ تھی۔

''میں اکیلا نہیں جاؤں گا'' کلیم اللہ نے کہا تو موہن اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''میرے دوست بھی میرے ساتھ جائیں گے۔'' موہن حیرت سے بولا۔ ''کیا خلیل احمد کے علاوہ بھی تمہارا کوئی ساتھی یہاں ہے؟'' تو کلیم اللہ نے آگے بڑھ کر جھاڑو اُٹھایا تو موہن چند کی حیرت دو چند ہو گئی۔ وہ کندھے اچکاتا ہوا مان گیا مگر اس کی سمجھ میں جھاڑو کی منطق نہ آئی تھی۔ چیف منتظم کو کافی پیسہ مل چکا تھا اور ویسے بھی کلیم اللہ جب سے اس ہسپتال میں آیا تھا وہاں کا ماحول مزید پاگل ہو گیا تھا۔ اس کی جان میں چھوٹ رہی تھی اور کافی روپیہ بھی مل رہا تھا اس نے بخوشی خلیل احمد اور کلیم اللہ کو موہن کے ساتھ بھیج دیا۔

کلیم اللہ محل کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو اُسے بھگوان کی مورتی پر وہ چمک دمک اور صفائی ستھرائی نظر نہ آئی جو بلاناغہ ہوا کرتی تھی۔ یوں تو محل میں ہر چیز اپنی جگہ پر قائم دائم تھی مگر اس طرح لگتا تھا کہ اس کے مکین گہری نیند سو چکے ہیں۔ یا پھر نیم بے ہوشی کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ اس کی نظر اس روشندان پر گئی جہاں اُسے باندھ کر پتھر مروانے کا بندوبست ظالم و جابر پرساد چوپڑہ نے کیا تھا۔ سب سے پہلے اس کی ملاقات مہارانی سے ہوئی جو اپنے بیٹے کو دیکھنے کیلئے ننگے پاؤں ہی بھاگی چلی آئی تھی۔ اس نے کلیم اللہ کو منہ اور سر پر بوسے دینا شروع کر دیئے۔ خلیل احمد یہ منظر دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکا اس نے سسکیوں میں رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کائنات کا عظیم تحفہ ماں اس سے کسی ظالم نے چھین لیا تھا۔ اس نے منہ ہی منہ میں قرآنی آیات کا ورد شروع کر دیا تو اس کے بے چین دِل کو چین اور ذہن کو سکون ملنا شروع ہو گیا۔

کلیم اللہ کے گرد گھر کے تمام افراد جمع ہو گئے تھے وہ خاموشی سے ان سب کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کاجل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اس کے سینے سے لگ جاتی۔ کنگنا نے رو رو کر بھائی سے گلے شکوے کرنا شروع کر دیئے تھے۔ وہ سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا اور دیکھتا رہا۔ اُسے اس بات کی جلدی تھی کہ اس گھر کے بااثر اور پر غرور شخص سے ملا جائے جس نے کلیم اللہ کے عقیدے کو پختہ کرنے میں ظالم شخص کا کردار ادا کیا تھا۔ آج اگر وہ پکا اور سچا مسلمان تھا تو اس قرآن کی بدولت ہی تھا جسے اس نے آگ سے جلنے سے بچا کر اپنے سینے سے لگایا تھا اس دِن سے اس کا سینہ پرنور اور منور ہو گیا تھا اور پھر اس ظالم اور پرتشدد چوپڑہ کی سنگدلانہ اور بے رحمانہ حرکتوں نے اس کا رب واحد کی ذات پر ایمان پختہ سے پختہ کر دیا تھا۔ وہ تمام گھر والوں کے ساتھ پرساد چوپڑہ کے کمرے میں داخل ہوا تو سامنے وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے مجبور اور بے بس شخص کو دیکھ کر اُسے اللہ کی قدرت اور اس کی ذات مقدس کا احتساب لینا دیکھ کر وہ ایک بار تو لرز گیا وہ آگے بڑھ کر چوپڑہ کے قدموں میں بیٹھ گیا تو چوپڑہ کی آنکھیں برسات بن گئیں۔

''آپ میرے پتا جی ہیں (والد)'' اس نے کہنا شروع کیا تو گھر کا ہر فرد آنسو بہانے لگا تھا۔ ''آپ نے مجھے جنم دیا۔ اس میں میرا کوئی قصور یا خطا نہیں کہ میں مسلمان گھرانے میں کیوں پیدا نہیں ہوا لیکن میری تقدیر میں یہ بات لکھی گئی تھی کہ میں اس گھرانے سے مسلمان ہو کر مروں گا۔'' کلیم اللہ کی آواز بھرانے لگی تو چوپڑہ کا منہ ہلنے لگا وہ کچھ کہنے کیلئے الفاظ تلاش کر رہا تھا اور پھر چند لمحوں بعد اس کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلے۔

''مم...... میں...... مسلم...... ان...... ہونا...... چاہت...... ہوں۔'' اس کا سانس پھولنے لگا تھا کلیم اللہ سمیت گھر کے سبھی افراد حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگے تو اس کی رم جھم کرتی آنکھیں اس بات کا عندیہ دے رہی تھیں کہ وہ سچ کہہ رہا ہے مگر کلیم اللہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں چوپڑہ صاحب...... میرے آقا کی حدیث ہے کہ جو شخص موت کے خوف سے زندگی کے آخری لمحات میں کلمہ پڑھ لے وہ اس کا مکر ہے...... آپ نے ساری زندگی...... بت پرستی میں ہی گزار دی...... آج کچھ بھی نہیں کر سکتے تو مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔'' وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا تھا۔

''مم...... میں...... ہر قسم...... تاوان...... دُوں...... گا...... اللہ...... سے...... معافی...... دلا دو...... وہ...... رحمٰن...... رحیم ہے۔'' اس کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکل رہے تھے مگر سمجھ سب کو آ رہی تھی سب کی نظریں کلیم اللہ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ پھر بولا۔ ''ہم...... میں تم سے...... معافی...... مانگتا......'' اس نے اپنا دایاں ہاتھ اُٹھا کر بائیں ہاتھ پر رکھ کر معافی مانگنے والا انداز اپنایا تو کلیم اللہ بول پڑا۔

''مجھے گناہگار مت کیجئے...... معافی مجھ سے نہیں اس اللہ سے مانگیئے جسے آپ نے رحمٰن و رحیم مان لیا ہے...... وہ بڑا بے نیاز ہے اس کی رحمت کے دروازے ہر وقت انسانوں کی توبہ تائب کیلئے کھلے رہتے ہیں۔''

''تم...... میری...... سفارش...... کرو...... مم...... تاوان...... اس کی رحمت...... کا...... طلب...... گار...... معاف کر دو۔''

کلیم اللہ اس کی وہیل چیر پکڑ کر باہر لان میں لے آیا۔ گھر کے سبھی افراد خلیل احمد سمیت حیران تھے کہ وہ کیا کرنے اور کہنے والا ہے۔

''میں آپ کا علاج کر سکتا ہوں...... بالکل مفت...... اگر آپ اللہ کی ذاتِ واحد پر ایمان لائیں۔'' پرساد چوپڑہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اس کے منہ سے تھوک نکلنے لگا تھا جسے مہارانی نے اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کپڑے سے صاف کر دیا۔

''آپ نے تمام زندگی غلطیوں اور کوتاہیوں میں گزار دی۔ اس کا تاوان آپ کو ادا کرنا پڑے گا۔''

''کک...... کیا؟'' اس کی نظروں میں التجا تھی۔

''اس محل کا ایک حصہ آپ اپنی تمام مسلمان فیملی کے ساتھ رہائش کیلئے رکھ لیں۔ اور باقی تین حصے اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی کیلئے وقف کر دیں۔'' کلیم اللہ نے کہا تو خلیل احمد اس کی طرف قابل داد نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''اس طرح آپ اللہ تعالیٰ کی محبت اور خوشنودی بھی حاصل کر سکیں گے اور آپ کا تاوان بھی تا قیامت ادا ہوتا رہے گا۔''

''مم...... میں...... تیار...... ہوں...... اس محل میں...... ہندوستان کی...... سب سے بڑی...... مسجد...... بنواؤ...... تمام...... دولت...... لے لو۔'' کلیم اللہ اور خلیل اللہ کا دِل باغ باغ ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی محنت اور کوششوں کا انعام ان کو اس صورت میں دِیا تھا کہ راج تلک محل کا نام ''مسجد کوئے مدینہ'' بن گیا تھا۔

بھگوان کی مورتی ایک مندر میں بھجوا دی گئی تھی۔ تمام لان کی اطراف میں درختوں کو لگا رہنے دِیا تھا۔ گھر کے تمام افراد کو اس شہر کے نامور عالمِ دین کے ہاتھوں مسلمان کروا کر اس بات کی تشہیر اخبارات اور میڈیا میں دے گئی تھی کہ اب راج تلک محل 'مسجد کوئے مدینہ' ہے...... ہندوستان

میں مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں ایک پرامن جلوس نکالا تھا۔ جس سے لوگ جوک در جوک اس مسجد کو دیکھنے کیلئے آنا شروع ہو گئے تھے۔

کلیم اللہ نے وعدہ کے مطابق پرساد چوپڑہ جس کا نام حسنین علی تھا کا علاج شروع کر دیا تھا۔ اس کو پانی جیسی دوائی مہارانی (زینب) پلایا کرتی تھی۔ جس سے اس کی حالت دِن بدن بہتر ہو رہی تھی۔

مسجد کی تعمیر میں سینکڑوں مزدور کام کر رہے تھے دِن رات کی شفٹوں میں کام ہو رہا تھا تقریباً پندرہ دِن بعد کلیم اللہ اپنے خاندان کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ حیران کن واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ پرساد چوپڑہ وہیل چیئر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا سبھی اس کی طرف حیرانگی سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے لرزتے ہونٹ بھی اب ٹھیک ہو گئے تھے اور وہ اپنے پاؤں پر بھی چل پھر سکتا تھا۔

''کلیم اللہ! میں اب ٹھیک ہو گیا ہوں۔'' اس نے یہ الفاظ روانی سے ادا کیئے تو سب کی حیرت مزید بڑھ گئی۔ ''اللہ کی رحمت سے میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ سب باری باری حسنین سے ملے اور آنسوؤں کے خراج میں رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

وہ چلتے ہوئے لان میں آئے تو مسجد کی دیواریں تعمیر ہو چکی تھیں اب چھتیں ڈالنے کا کٹھن مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ خلیل احمد تمام کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ اس مسجد کو دُنیا کی خوبصورت ترین مسجد بنانے میں دِن رات جُتا ہوا تھا۔

''کلیم اللہ! ایک بات تو بتاؤ؟'' حسنین نے کہا۔ ''مجھے دُنیا کے تمام ڈاکٹرز نے جواب دے کر میرا مرض لاعلاج قرار دے دیا تھا...... مگر میں حیران ہوا کہ تم مجھے جو دوائی پلاتے رہے ہو...... وہ نہ تو کڑوی تھی اور نہ ہی کسی مخصوص رنگ کی۔ جبکہ کوئی کیپسول وغیرہ بھی نہیں کھلایا اور دیکھو...... یہ تو کوئی معجزہ ہی ہو گا۔'' کلیم اللہ باپ کی بات سن کر ہنسنے لگا۔

''اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے جبکہ ہماری سوچ بہت ہی چھوٹی...... میں نے آپ کو جو دوائی پلائی تھی۔ وہ تو پانی تھا۔'' پرساد چوپڑہ (حسنین) کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کلیم اللہ پھر بولا۔ ''ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ پانی کوئی عام نہیں بلکہ زم زم تھا۔''

''زم زم......؟ میں سمجھا نہیں۔'' حسنین بدستور حیرت سے بولا تو کلیم اللہ اس کو لیتا ہوا سبز گھاس پر لے آیا۔

''میں نے کہا نا کہ رب تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ یہ پانی اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تلووں یعنی ایڑیوں کے رگڑنے سے نکلا ہے۔ اور یہ چشمہ تاقیامت یونہی چلتا

رہے گا جبکہ اس پانی کی تاثیر کے متعلق میرے پیارے آقا محمد مصطفیٰ ﷺ کی حدیث ہے کہ جس بیماری کا خیال کر کے اس پانی کو پیو گے اللہ تعالیٰ تمہاری وہ بیماری ختم فرما دے گا۔'' حسنین ابھی تک حیران تھا۔

''اسی لیئے مجھے اللہ کی رحمت اور آقائے دو جہاں کی مقدس حدیث پر مکمل یقین تھا کہ آپ تندرست ہو جائیں گے...... اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔'' حسنین کی آنکھیں برسنے لگیں وہ زار و زار رونے لگا تھا۔ پھر اس نے ایک بار پھر سب کو حیران کر دیا وہ سجدے میں گر گیا اس کے آنسوؤں کی قطاریں گھاس کو تر و تازہ رہنے میں مدد کر رہی تھیں۔ پھر اس کی رقت آمیز آواز نے ماحول کو سوگواری اور نور عطا کر دیا۔

''اے اللہ! میں گناہوں سے لتھڑا ہوا تیرا گنہگار بندہ ہوں۔ میں نے ساری زندگی گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے گزار دی...... میرے مالک! تو مُردوں کو اپنی ایک چھوٹی سی نعمت سے زندگی عطا کر دیتا ہے۔ میرے اللہ! میں بھولا بھٹکا تھا اب تیری راہوں کا مسافر بنا ہوں تو مجھ پر اپنے پیارے حبیب محمد عربی ﷺ کے صدقے رحمتیں اور اپنا فضل عطا فرما۔ بے شک تو رحمٰن و رحیم ہے پاک ہے تیری ذات اور ہم ہی ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔'' ماحول پر پرنور ہالہ چھا گیا تھا۔ سب لوگوں کی سسکیاں عرشِ بریں کے رب کو پسند آ رہی تھیں۔ وہ اپنی رحمتوں اور محبتوں کی بارش رم جھم کی صورت میں برسانے لگا۔ ''میرے اللہ! میری غلطیوں اور خطاؤں کو معاف فرما دے۔ میرے خاندان پر اپنی رحمت نازل فرما۔'' حسنین کی رقت بھری آواز سے بادلوں میں گڑگڑاہٹ اس بات کا ثبوت تھی کہ رب تعالیٰ اپنی رحمتوں کے ساتھ اس بندے کی طرف متوجہ ہے۔ دو ماہ بعد مسجد مکمل ہو گئی تو اس میں پہلی نماز ادا کرنے کا وقت ہوا تو خلیل احمد نے اذان دی جو فضاؤں، ہواؤں اور خلاؤں کو چیرتی ہوئی عرشِ بریں کے رب کی بارگاہ میں مقبولیت کی سند حاصل کرنے لگی۔ خلیل احمد اپنے آپ کو مسجد نبویؐ کے صحن میں کھڑا اذان پڑھتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ آنسوؤں کی آمیزش میں اس نے ''اَشھدو اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰہ'' کے الفاظ ادا کیئے تو فضا معطر و مقدس خوشبو سے مامور ہو گئی۔ ایسی خوشبو وہاں موجود کسی بھی شخص نے اس سے پہلے زندگی میں نہ سونگھی تھی۔ مسجد کی تشہیر میں میڈیا کا کردار اہم تھا۔ پورے ہندوستان کے مسلمان اس مسجد کو دیکھنے اور اس میں پہلی نماز ادا کرنے کیلئے ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔

سید شریف حسین رضا بھی کہیں سے آ گئے تھے انہوں نے کلیم اللہ کے بار بار منع کرنے کے باوجود بھی اُسے امامت کے مصلّے پر کھڑا کر دیا تھا۔ کلیم اللہ کی رم جھم کرتی آنکھوں نے ''اللہ اکبر''

کی صدا لگائی تو کلیم اللہ کو رب تعالیٰ نے اس کے عشق کی تاوان بھری زندگی مکمل ہونے کی نوید اس طرح دی کہ اس کے سامنے مسجد کوئے مدینہ کے محراب میں خانہ کعبہ نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے عشق کو جان کو لرزا دینے والا تاوان ادا کر کے سرخرو کر دیا تھا اور اس کی سرخروئی رب تعالیٰ نے منظور کر لی تھی۔

عشق دی راہ بڑی اوکھی
جے ٹُر پئیے تے یار ملا دیندا
لاہ کے تخت اُتوں تاجاں والیاں نوں
خاکروباں نال رلا دیندا
ہتھ پیر دے چُمن نہ دین لوکی
عشق کُتیاں دے پیر چُما دیندا
عشق اونچ تے نیچ ویکھ دا نئیں
ذاتاں مذہباں دے فرق مٹا دیندا
کدے ملدے نئیں محبوب اینیاں توں
عشق فیر دی بولیاں لا دیندا
نہ ایہہ پیر تے مرید ویکھے
گھنگرو سیداں دے پیریں پا دیندا
اللہ عشق نوں اے توفیق بخشی
نیزے اُتے قرآن سُنا دیندا
اتھرو اِک وی نکلے جے عاشقاں دا
اجمل رب دا عرش ہلا دیندا

ختم شد

☆☆☆